دنیا کی بہترین کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ
ڈائجسٹ
سب رنگ

سرورق طباعت :
ایلیٹ پبلشرز لمیٹڈ۔ ایس آئی ٹی ای۔ کراچی
پبلشرز :
شکیل عادل زادہ نے شرف الدین بھیو کے اہتمام
میں پاکستان ہیرالڈ پریس ضیاء الدین روڈ کراچی سے
چھپوا کر ۵ سی ۱۳/۴ ناظم آباد سے شائع کیا۔
پتہ ۴۷، ۴۸ پریس چیمبر آئی آئی چندریگر روڈ کراچی
فون ۲۲۵۸۴۴ ذیلی دفتر لطیف ہاؤس کرشن پورہ پشاور

شمارہ ۱۱
جلد ۴

کھلونے

شرقِ اوسط

میں ایک بار پھر ہولناک جنگ چھڑی اور بند ہو گئی' اب خبر آئی ہے کہ دوبارہ جنگ جاری ہے' ہر دو فریق ایک دوسرے پہ الزام تراش رہے ہیں کہ وہ جنگ بندی کی پابندی نہیں کر رہا ہے ممکن ہے آنے والے دنوں میں جنگ بند ہو جائے یا پھر یہ معرکہ ایک طویل جنگ کی صورت اختیار کر لے ممکن ہے کوئی ایک ملک دوسرے ملک پر تسلط جما لے اور صورتِ حال سدھرنے کے بجائے اور پیچیدہ ہو جائے۔ کچھ بھی ممکن ہے لیکن ایک بات ممکن نظر نہیں آتی۔ وہ ہے بڑی طاقتوں کی شعبدہ بازی کا اختتام۔ شرقِ اوسط کی موجودہ جنگ سے بڑی طاقتوں کا کردار اور کھل کر سامنے آگیا ہے جب تک یہ عظیم طاقتیں مداری کی حیثیت سے غریب اور پس ماندہ ملکوں کو انگلیوں پہ نچاتی رہیں گی۔ اُس وقت تک بدنصیب چھوٹے ملکوں کے لوگوں کی زندگی اجیرن رہے گی' چند بڑی طاقتوں نے ساری دُنیا کا ٹھیکا لے رکھا ہے' دراصل کرۂ ارض میں امن و سکون' بربادی و خوں ریزی کے فیصلوں کی تکمیل اپنے زبردست وسائل' ہتھیاروں اور مشینوں کے بل پر حاوی عظیم طاقتوں کے ہاتھ میں ہے' ایک دُنیا مغلوب ہے' دوسری دُنیا غالب ہے' دونوں بڑی طاقتوں میں ایک قدرِ مشترک ہے کہ وہ تمام انسانی اور اخلاقی اقدار سے مادر پدر آزاد ہیں' ان کے وسیع تر مفادات کی بات آتی ہے تو ان کے بہترین نظریہ ہائے زندگی' فلسفہ و اخلاق کی کتب' انسانیت دوستی اور مروّت کے اسباق دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔

آثار نظر آرہے ہیں کہ بڑی طاقتوں نے علاقے آپس میں تقسیم کر لیے ہیں' انھوں نے یقیناً کوئی ایسا معاہدہ کر رکھا ہے کہ وہ اسی طرح دُنیا میں لوٹ مار کا بازار گرم کرتے رہیں گے' اور غریب ملکوں کے بے وقوف اور سادہ لوح عوام کے خون سے اپنی سرزمین پر چراغ روشن رکھیں گے۔ انھوں نے طے کر لیا ہے کہ وہ چھوٹے ملکوں کو ایک دوسرے کے خلاف صف آرا رکھیں گے' اور ایک ایسی کیفیت قائم کرنے کی کوشش کرتے رہیں گے جو انھیں کبھی سکون سے رہنے کی مہلت نہ دے۔ چھوٹے ملکوں کا سکون بڑے ملکوں کی موت ہے' لڑائی ہوتی ہے تو دونوں طاقتوں کا سامانِ حرب خرچ ہوتا ہے۔ منہ مانگے داموں اور اپنی شرائط کے ساتھ غریب ملکوں کو دیے جانے والے اس سامان کی وجہ سے ان کے کارخانوں کی مشینیں رواں رہتی ہیں' جنگ اور جنگ کے حالات ان کے لیے ضروری ہیں' نہیں تو انھیں اپنی مصنوعات کی منڈیاں کہاں ملیں گی اور ان کی برتری کون تسلیم کرے گا؟ اس لیے وہ قوموں کے قلب میں کینے کا تخم بوتے ہیں اور اس کی آب یاری کرتے رہتے ہیں' ایک پشت سہلاتا ہے تو دوسرا وار کرتا ہے۔

جنگ ایشیا افریقہ میں لڑی جاتی رہے گی۔ ہتھیار بڑی طاقتوں کے ہوں گے' وہ دُور کھڑے ہو کر مرغے لڑاتی رہیں گی۔ ایک حمایت کرے گا' دوسرا مخالفت' کسی ایک مسئلے پر اُن میں اتفاق رائے نہیں ہو گا۔ دُنیا کے باقی حصّوں کو متاثر کرنے کے لیے انھوں نے ایک تماشا گاہ بنا رکھی ہے۔ اُدھر ایک علاقہ خون میں نہا رہا ہے اور وہاں آگ لگ رہی ہے' اور اِدھر شعبدے باز آپس میں بیٹھے نئے نئے کرتب دِکھا رہے ہیں' جنگ شدت اختیار کر جاتی ہے تو بڑی طاقتیں سر جوڑ کر بیٹھتی ہیں اور جنگ بندی کے لیے طرح طرح سے دباؤ ڈالتی ہیں' اُن کی گفت گو سے متنازعہ علاقے لاعلم رہتے ہیں' قرار دادیں پاس ہوتی ہیں اور پھلجڑیاں چھوٹنی بند ہو جاتی ہیں' کچھ علاقے واپس مِل جاتے ہیں' اپنے ہتھیاروں کی تیزی اور پھرتی کی آزمائش کے لیے جنگ ضروری ہے' بس یہ ایک طرح کا معمول ہے' اصل مسئلہ کبھی حل نہیں ہونا چاہیے' تمام مسائل حل ہو گئے تو بڑی طاقتوں کا کیا ہو گا؟

ہمارا خیال ہے شرقِ اوسط کی موجودہ جنگ کے بعد افریشیا کے عوام کو اپنے مسائل پر نظرِ ثانی کرنی چاہیے۔

میں نے اپنے کام بڑھا لیے ہیں اور خود اپنے لیے مشکل پیدا کرلی ہے لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ اب تمھیں اچھی کتابوں کی اشاعت کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ تمھیں کوئی دوسرا پرچہ نکالنا چاہیے تم اپنے موجودہ وسائل کی بنیاد پر بہت ہاتھ پاؤں پھیلا سکتے ہو لیکن اندر کا حال کسے معلوم ہے؟
وسائل کی وسعت، حوصلہ افزا ردِعمل اور ستائش و اعتبار کے مثبت رویّوں کے باوجود وحشتیں ہیں کہ روز بہ روز بڑھتی جارہی ہیں، اور سب رنگ اب بہت مشکل ہوگیا ہے جیسے میں آج سے چار سال پہلے بڑی آسانی سے تنہا ترتیب دے لیا کرتا تھا صرف شطرنج ایک شوق تھا اسے کھیلے ہوئے تین سال سے زائد ہوگئے۔ رسمی طور پر کہیں آنا جانا ہو جاتا تھا وہ بھی بند ہوگیا۔
پہلے اِدھر اُدھر نگاہیں بھٹک جاتی تھیں اب کسی مائلِ بہ کرم چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بھی خوف آتا ہے، پہلے سب رنگ مہینے کے آخری عشرے میں شائع ہوجاتا تھا اب یکم گزرنے کے بعد بھی تامل ہوتا ہے ہاں پہلے بعض نامہ ہائے محبت کے طویل جوابات لکھنے میں مسرت ہوتی تھی اب انھیں پڑھتے ہوئے بھی اُلجھن ہوتی ہے پہلے کوئی فردوسِ نظر فون کرتی تھی تو راتیں معطر ہوجاتی تھیں اب معذرت کرتے ہوئے جھجک ہوتی ہے پہلے کوئی مانوس آواز سن کر دو گھڑی قیام کرنے اور تعاقب کرنے کو جی چاہتا تھا اب نظریں چرانے کی کوشش ہوتی ہے۔

پہلے وہ کیا بات تھی، جو اب نہیں ہے؟

یوں کہیے پہلے ابتدا تھی، عشق کے صحرا میں قدم رکھا تھا۔ راستے کی تنگی اور راہوں کی تنگ دلی کا اندازہ نہیں تھا۔ پہلے بدنگاہی عام نہیں ہوتی تھی اور رسوائی چند محلوں، چند بستیوں تک محدود تھی، پہلے لوگ اس جنوں خیزی پر انگلیاں اٹھایا کرتے تھے اب پتھر پھینکتے ہیں، پہلے گلی گلی عشق کی اتنی تزئین نہیں ہوتی تھی اور بیک وقت اتنے دعوے دار نظر نہیں آتے تھے اب ہر کوچے میں ایک علم بردار موجود ہے ایسے عالم میں دو ہی صورتیں ممکن تھیں، یا تو اِن ناسپاس گزاری، دل آزاری اور کساد بازاری سے تنگ آکر کسی ویرانے میں نکل لیا جاتا یا پھر ایسی ہاؤ ہو مچائی جائے کہ لوگ دانتوں میں انگلیاں دبالیں۔ میں نے اس انتشار کے وقت میں کون سا راستہ اختیار کیا؟ گریز کا یا جذب کا؟ یہ آپ کے علم میں ہے، اس کا جواب خود سب رنگ ہے جو میرا جگت نام ہے پہلے بھی سب رنگ اسی ضخامت میں نکلتا تھا مگر اب اس کا تیور، بانکپن اور شدت ہی اور ہے اس نامہرباں ماحول میں سر اٹھانے میں بڑے خطرے ہیں، عافیت گم نامی گوشہ نشینی میں ہے میں نے گزشتہ ماہ کہا تھا کہ یہ سب برداشت، صبر اور ضبط کا ثمر ہے کہ علیحدہ شناخت ہوجاتی ہے میں نشانوں کی زد پر رہا ہوں کیونکہ یہی رسمِ عاشقی ہے میں نے کسی ایک جگہ کھڑے ہوکر ستم سہنے اور خاموش رہنے کے ذیرہ جاں کاہ پر قناعت نہیں کی ہے میں نے کہا تھا برداشت ایک بڑا منصب ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آنکھیں موند لی جائیں اور سر جھکا لیا جائے صرف برداشت سے کارواں منزل پر نہیں پہنچتے، سر جھکائے آگے بڑھتے رہنا اور کسی ایسی محفوظ جگہ پہنچ جانا جہاں کوئی نشانہ لیتے ہوئے بھی ڈرے وہ منزل برداشت اور حرکت کے اشتراک جوہر سے مشروط ہے۔
میں نے خود کو کس طرح شناخت کرایا؟ میں نے سرکشی کی چادر اوڑھ لی اور شارعِ عام پر نکل آیا، اور دائیں بائیں دیکھنے کے بجائے راست سمت میں دیکھنے کی عادت ڈالی، روز بہ روز سب رنگ مجھ پر اور میں اس پر طاری ہوتا گیا، مجھے فخر ہے میں نے عشق میں شوریدہ سری کے ایسے نمونے پیش کیے کہ لوگ خود پیچھے ہٹنے لگے، میں نے مکتوباتِ محبت پڑھے بغیر تلف کردیے کیونکہ عشق کی بالیدگی، یکسوئی، برداشت اور عزم میں مضمر ہے۔
دعوے دلیل نہیں ہے۔ یہ انتخاب، یہ عنوانات، یہ سطریں، یہ تصویریں، یہ شوخیاں، یہ تلخیاں، آن میرے کا نسخہ سب کے پاس ہے اور سب اس کے دعوے دار ہیں اور سبھی دو ڈالے ہیں ترکیب، اجزا اور عملِ کشید میں معانی و محنت کی بات ہے جو شب و روز کی گردش سے بے پروا ہوکے ہی ممکن ہوتی ہے میرے رفیقوں کی تعداد کثیر ہے ہاں وسائل بھی محدود نہیں ہیں لیکن وحشتیں سوا ہوتی جارہی ہیں، میں اپنے رگ رگ سے کہتا ہوں یہی تو سب رنگ کو جنم دیتی ہیں، اس اضطراب اور کشاکش سے ایک جوہر تیار ہوتا ہے ایسا جوہر جسے اعتماد کے ساتھ لوگوں میں تقسیم کردیا جائے بعض اوقات صرف ایک برجستہ اور معنی خیز عنوان طے کرنے میں گھنٹوں صرف ہوجاتے ہیں بعض اوقات ایک کہانی خود کو کئی بار لکھواتی ہے تب کہیں جاکر دل مطمئن ہوتا ہے اور جب دل مطمئن ہوتا ہے تب سب رنگ ظہور میں آتا ہے۔
ذاتی صفحہ میرا نامۂ اعمال ہے۔ ہاں یہ میرے کام کا اشتہار ہے یہ میری قلبی، ذہنی کیفیات کی ماہ رو داد ہے، میں گزشتہ چار سالوں میں مختلف انداز سے اپنے کام، اپنے جذبے کی تشریح و اظہار کرچکا ہوں، جب صفحہ لکھنے کا وقت آتا ہے تو ذہن میں خیالات کا ہجوم ہوتا ہے کوئی بہت عجیب، بہت دلکش تحریر لکھنے کو جی چاہتا ہے مگر جب لکھنے بیٹھتا ہوں تو بہت سی تلخیاں، بہت سے چہرے سامنے آجاتے ہیں ایک ادبی پرچے کے مدیر و دبیر کی زبوں احساسی اور درماندہ ذہنی کا خیال آجاتا ہے جو سب رنگ کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور معیار سے اُن کے ہاں پیدا ہوگئی ہے پھر ایک جید صحافی کا چہرہ نظروں کے سامنے گھوم جاتا ہے جو ادب، فلسفے، سیاست، معیشت اور صحافت کے متعلق نئے نئے کلیے وضع کرنے میں مشہور ہیں ان کے پاس بقولِ خود کوئی ایسی کیمیا موجود ہے کہ اگر انھیں تین ماہ کسی جریدے سے وابستہ ہونے کا موقع مل جائے تو اس کی قسمت بدل جائے یہ کلیہ کسی نے مجھ تک بھی پہنچا دیا، ان بزرگ کے گھر سے بھی ایک جریدہ عرصے سے شائع ہوتا ہے اور لوگوں نے یہ ستم ظریفی دیکھی ہوگی کہ وہ اپنی گھریلو میراث، خاندانی پرچے پر صحافت کے نادر تجربے نہیں آزماتے، تجربہ بھی کیا چیز ہے، آدمی تجربے کی خوش فہمی میں مبتلا رہتا ہے اور اسے یہ خیال نہیں رہتا کہ وقت آگے گزر گیا ہے اور اب اس کے مطالبے ہی مختلف ہوگئے ہیں، یہ جنگاری، مست قلندر، لالہ و گل، شعلہ و شبنم کا عہد نہیں ہے ادب کی تعریف بھی زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہے یہ بڑے قنوطی اور دقیانوسی نوجوان بڑا تنگ کرتے ہیں، ان کے ہپی طرز کے بالوں اور مرصع مسجع لفاظی سے ہوکامت کھاتے ہیں یہ سو برس پہلے کے لوگ ہیں جو بدقسمتی سے ہمارے درمیان ابھی موجود ہیں، اپنے پاس کوئی کیمیا نہیں ہے اپنے پاس تو ایک ہی جذبہ ہے جو سب سے بڑا کلیہ اور سب سے بڑا تجربہ اور سب سے بڑا راز ہے، جب میں یہ صفحہ لکھتا ہوں تو یہ لوگ میرے اور آپ کے راز و نیاز کے درمیان آجاتے ہیں اور میری آپ کی باتیں رہ جاتی ہیں، بہرحال ان لوگوں کا دم غنیمت سمجھیے۔
اب ایک غیر دلچسپ بات سن لیجیے اس شمارے سے آپ کو کچھ اور زیرِ بار رہنا پڑے گا، میں اس کا کوئی جواز پیش نہیں کروں گا زائد پچیس پیسے کا مطالبہ خود ایک جواز ہے ویسے آپ مختلف مدوں میں روزانہ زائد پیسے ادا کرنے کے عادی ہوگئے ہوں گے لہٰذا یہ معمولی اضافہ بھی قبول کرلیجیے، فرداً فرداً ہر ماہ پچیس پیسے کی رقم آپ پر کوئی بار نہیں ہوگی، جہاں آپ نے اتنا برداشت کیا وہاں ایک یہ بھی سہی لیکن مجھے خوردہ اور تھوک فروشوں کی کٹوتی کے بعد جو کچھ ملے گا اس سے اچھے خاصے آنسو پونچھ جائیں گے، آگے اضافے کا امکان پیشِ نظر رکھیے ہر چیز ترقی پر ہے۔ ہم اس دوڑ میں کیوں پیچھے رہیں، ہاں کسی زمانے میں کمی کا رجحان آیا یا دوڑ ہوئی تو بھی ہم آپ کا ساتھ دیں گے، یہ ایک وعدہ ہے جس کے ایفا کی نوبت نہیں آئے گی۔

بے انداز دولت

اور ایک لاکھ ہندوستانیوں کو قیدی بنا لینے کے بعد تیمور سمرقند چلا گیا اور وہاں مشرق میں مزید فتوحات کے منصوبوں پر غور کرنے لگا۔ اب تک تریسٹھ سالہ بوڑھے تاتاری فاتح نے جدھر کا بھی رخ کیا تھا فتح و کامرانی نے اس کے قدم چومے تھے۔ جب تیمور ایشیا میں اپنی فتوحات کو وسعت دے رہا تھا، ترکی میں بایزید اول مغربی علاقوں کی تسخیر میں مشغول تھا۔ وہ برقِ خاطف بن کر دشمنوں پر گرتا اور انھیں خاک و خون میں ملا کر سرخروئی حاصل کرتا۔ وہ یورپ کی دہلیز میں قدم رکھ چکا تھا اور قسطنطنیہ کی تسخیر کا قطعی ارادہ کر چکا تھا۔ قسطنطنیہ کا قیصر جب ہر طرف سے مایوس ہو گیا تو اس نے نہایت عجلت میں تیمور کا سہارا لینا چاہا۔ قیصر کا برق رفتار قاصد کوہستانِ ہندوکش سے گزر کر بلخ میں داخل ہوا اور بلخ سے کابل ہوتا ہوا ہندوستان پہنچا جہاں تیمور دہلی اور متھرا کو کچل کر سمرقند میں داخل ہو گیا تھا اور مشرق میں بڑھنے کے منصوبے بنا رہا تھا۔

تیمور نے اپنے ایک ترک امیر کو حکم دیا کہ قیصر کا خط پڑھ کر سنایا جائے۔ قیصر کا خط انتہائی خوشامدانہ تھا۔ اس نے لکھا تھا:۔

”میری سلطنت پیغمبرِ اسلام حضرت محمدؐ اور چاروں خلفا کے عہد سے موجود ہے لیکن عثمانی حکمراں بایزید اسے ختم کرنے کے درپے ہے۔ اُسے اس کے تیز رفتار اور فیصلہ کن حملوں کی وجہ سے یلدرم (برقِ خاطف) کہا جاتا ہے۔ اِن نازک حالات میں ہم آپ سے مدد کے طالب ہیں۔ آپ مشرق کے سب سے بڑے فاتح اور بایزید یلدرم کے صحیح مدِمقابل ہیں۔ آپ کی عظیم قلمرو میں قسطنطنیہ کا قصد بڑے سمندر میں چھوٹی مچھلی کی حیثیت سے داخل ہوگا، صرف اس خیال سے کہ بڑے سمندر میں چھوٹی مچھلیوں کی بھی جگہ ہوتی ہے۔ ممکن ہے آپ یہ سوچیں کہ بایزید مسلمان حکمراں ہے اور ہم عیسائی۔ اس لیے ایک مسلم حکمراں کے خلاف ایک عیسائی مملکت کی حمایت میں تلوار نہیں اٹھانی چاہیے لیکن امیر (تیمور) کو بایزید کی اِس سوچ کو بطورِ خاص ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ اِن دنوں امیر کے دو معتوب بایزید کے مہمانِ خصوصی ہیں اور یہ دونوں بایزید کو امیر کے خلاف تلوار اُٹھانے کا مشورہ دے رہے ہیں کیا یہ بات امیر کے لیے ہتک آمیز نہیں، اگر امیر نے اپنے ہم عصر چھوٹے سے مسیحی حکمراں کی اِس بات پر توجہ نہ دی تو عین ممکن ہے کہ بایزید امیر کے علاقوں پر تاخت و تاراج شروع کر دے۔ اگر ایسا ہوا تو امیر کے لیے بڑی مشکلات کھڑی ہو جائیں گی۔ ہم آپ کو بایزید کے خلاف مدد دینے کا وعدہ کرتے ہیں!“

تیمور کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ اس نے مسیحی قاصد سے سوال کیا: ”تیرا بادشاہ ہماری کیا مدد کر سکتا ہے؟“

قاصد ادب سے دو زانو ہو گیا۔ سر جھکا کر بولا: ”ایشیا کے عظیم الشان اور بے مثل فاتح کی ہمارا معمولی آقا کیا مدد کر سکتا ہے۔ حقیقتاً ہمارے بادشاہ کی یہ پیش کش ایک فضول سی بات ہے!“

تیمور نے حد درجہ آمرانہ انداز میں کہا: ”صرف فضول ہی نہیں ہتک آمیز بھی ___ ہم اس کے باوجود بایزید کو مجبور کریں گے کہ وہ قسطنطنیہ کو اس کے حال پر چھوڑ دے اور ہمارے معتوب ہمارے حوالے کر دے!“

قاصد نے عاجزی سے عرض کیا: ”لیکن گستاخی معاف، ترک فاتح اپنی فتح مندیوں کے نشے میں اتنا سرشار ہے کہ کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتا!“

”ہوں!“ تیمور رعونت سے بولا: ”اگر اس نے اپنی جہالت کی روش نہ چھوڑی تو ہم انگورہ پہنچ کر اسے عملاً یہ بتا دیں گے کہ جس طرح اس دنیا کا خدا ایک ہے، اسی طرح بادشاہ بھی ایک ہی ہونا چاہیے اور تیمور کے لیے یہ کوئی ایسی ناممکن بات نہیں۔ بایزید اگر چاہے گا تو ہم اسے اپنے نمایندے کی حیثیت سے حکمراں رہنے دیں گے!“

قاصد اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر چکا تھا۔ اب وہ یہ چاہتا تھا کہ تیمور فوراً ہی سمرقند واپس چلے اور وہاں سے بایزید کے مقابلے پر روانہ ہو جائے لیکن تیمور اِس مہم کو اتنی آسان بھی نہ سمجھتا تھا۔ اس نے قیصر کے قاصد کو یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ ”تم قسطنطنیہ واپس جاؤ اور اپنے بادشاہ سے کہو کہ وہ محصور ہو کر بایزید کو روکے رکھے، ہم بہت جلد پہنچنے کی کوشش کریں گے!“

تیمور نے فوراً ہی واپسی کا اعلان کر دیا۔ ہندوستان کی دولت ہاتھیوں، اونٹوں اور چھکڑوں وغیرہ پر بار کی گئی۔ صناع، ہنرمند، اطبا اور دوسرے فن کار تیموری لشکر کے زیرِ حراست سمرقند روانہ کر دیے گئے۔ ان میں ہندوستان کے ایک لاکھ قیدی بھی تھے جو شکستِ فاش اٹھا کر غلام بنا لیے گئے تھے اور تیمور انھیں بھی سمرقند لیے جا رہا تھا۔ سمرقند پہنچنے کی جتنی جلدی تھی ایک لاکھ قیدیوں کی نگرانی اور ان کا سفر اتنا ہی دشوار ہوتا جا رہا تھا۔ تیمور کی پاٹ دار آواز کبھی بالفضا میں گونجی کہ ”سمرقند تیز رفتاری سے پہنچنے کی کوشش کی جائے!“ لیکن قافلے کی سست رفتاری میں کوئی فرق نہ آیا۔ تیمور نے دیکھا کہ ایک سنگ باشی (ایک ہزاری کماندار) قیدیوں کو مار مار کر بار بار تیز رفتاری پر مجبور کر رہا ہے لیکن قیدی اڑیل ٹٹو کی طرح آگے بڑھنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ تیمور گھوڑا دوڑا کر سنگ باشی کے قریب پہنچ گیا اور اس سے پوچھا: ”تیرا نام؟“

سنگ باشی نے جواب دیا: ”فیض الاسلام لیکن لوگ مجھے فیضی فیضی کہتے ہیں!“

تیمور کی باچھیں خفیف سی مسکراہٹ سے متحرک ہو کر پھیل گئیں: ”تو تو فیضی ہے! خوب لیکن یہ تو بتا ہمیں تیری ذات سے کیا فیض پہنچا؟“

فیضی نے ندامت سے جواب دیا: ”یہ غلام حضور کی نذر کو اپنی حقیر سی جان ہتھیلی پہ لیے پھرتا ہے اور یہ کسی دن بھی امیر پہ صدقے ہو جائے گی!“

تیمور نے بے نیازی سے پوچھا: ”یہ ہندی غلام چلنے میں سستی کیوں دکھا رہے ہیں؟ انھیں سمجھاؤ کہ ہمیں جلد از جلد سمرقند پہنچ جانا ہے، ہمیں سست روی سے نفرت ہے!“

فیضی نے جواب دیا: ”یہ تو ممکن ہی نہیں کہ امیر اس حقیقت سے لاعلم ہوں کہ ہند کی آب و ہوا آدمی کو سست بنا دیتی ہے۔ اسی لیے ایران کے کسی قدیم بادشاہ نے اپنے آدمیوں کو یہ نصیحت کی تھی کہ اگر ہندوستان جانا ہو جائے تو آب و ہوا کے اثر انداز ہونے سے پہلے ہی وہاں سے واپس آ جانا ورنہ کاہل ہو جاؤ گے!“

تیمور نے اسی وقت بیگلا بیگی (امیرالامرا)، تومان آگاشی (دس ہزاری)، یوزباشی (ایک صدی) اور اون باشی (دس سپاہیوں کے کماندار) کو اپنے روبرو طلب کیا اور انھیں حکم دیا: ”چونکہ ہندی قیدی تیز رفتاری میں ہمارا ساتھ نہیں دے سکتے اور ہمیں سمرقند جلد از جلد پہنچ جانا چاہیے اس لیے بہتر ہے کہ ان ایک لاکھ قیدیوں کی مصیبت سے نجات حاصل کر لی جائے اور نجات حاصل کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ انھیں قتل کر دیا جائے!“

اسی وقت بجلی کی رَو کی طرح تیمور کی خواہش، حکم بن کر لشکر میں پھیل گئی۔ اس حکم کی تعمیل میں ہر لشکری کو اپنے بازوؤں کو حرکت میں لانا تھا۔ کسی کے حصے میں پانچ قیدی آئے، کسی کے دس اور کسی کے حصے میں پندرہ۔ چونکہ ان قیدیوں سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کرنے کا فرمان صادر ہو چکا تھا اس لیے انھیں جلد از جلد مارنے میں جدت اور اختراع سے کام لیا گیا۔ کسی نے تلوار سے کام لیا۔ کسی نے گلا گھونٹنے کا طریقہ اختیار کیا۔ کسی نے بڑا سا گڑھا کھودا اور اس میں دس دس پانچ پانچ کی مشکیں کس کر اور اس گڑھے میں گرا کر اسے بند کر دیا ___

ایک مذہبی آدمی کے حصے میں پندرہ قیدی آئے۔ وہ رحم دل تھا اور چاہتا تھا کہ اس کی یہ خدمت کوئی اور انجام دے دے۔ اس تامل اور ہچکچاہٹ کا تیمور کو بھی پتہ چل گیا۔ وہ اپنا گھوڑا اُڑاتا ہوا اس رحم دل مذہبی آدمی کے سر پہ پہنچ گیا: ”تیرے حصے میں کتنے آدمی آئے؟“

اس نے جواب دیا: ”پندرہ!“

”تو تو انھیں فوراً ہی ہلاک کیوں نہیں کر دیتا!“ تیمور نے کڑک دار آواز میں ملامت کی: ”تو ہچکچا کیوں رہا ہے؟“

مذہبی شخص نے جواب دیا: ”امیر کے حکم کی تعمیل کر دی جائے گی لیکن ___“

”لیکن ویکن کچھ نہیں!“ تیمور نے اپنی تلوار کی نوک اس کے داہنے گال میں چبھو دی: ”تجھے یہ سزا دی جاتی ہے کہ تو اپنے حصے کے پندرہ قیدیوں کو تلوار کے بجائے گلا گھونٹ کر ہلاک کرے گا۔ معلوم ہوتا ہے ہندوستان کی آب و ہوا تجھ پہ اثر انداز ہو چکی ہے!“

مذہبی سپاہی گھوڑے سے اُترا اور رسّی کے ٹکڑوں سے اپنے حصے کے قیدیوں کے ہاتھ پیر باندھنے لگا۔ پھر انھیں زمین پر چت لٹا دیا اور باری باری ان کے گلوں کو اپنے پیروں سے دبا دبا کر ہلاک کرنے لگا۔ مرنے والے یوں ڈکارتے جیسے ذبح ہوتے ہوئے مویشی ڈکارتے ہیں۔ چند قیدی اپنے ساتھیوں کے حشر سے خوفزدہ ہو کر اِدھر اُدھر ملیچھے کھانے لگے اور اوندھے منہ لیٹ گئے۔ اس سپاہی نے انھیں گدّیوں سے روند کر ہلاک کر دیا۔ اِدھر سے مطمئن ہو چکنے کے بعد تیمور نے سنگ باشی فیضی کو حکم دیا کہ سمرقند پہنچنے پر اس مذہبی رحم دل سپاہی کو دوبارہ اس کے روبرو پیش کیا جائے!

چند گھنٹوں میں ایک لاکھ قیدی ہلاک کر دیے گئے اور تیمور نے اس غیر ضروری بوجھ سے نجات حاصل کر کے سکون کی سانس لی اور تیز رفتاری سے سمرقند روانہ ہو گیا۔

♥

سمرقند سے دو میل دُور، دریائے زرفشاں کے کنارے حدِ نظر تک خیموں کا شہر آباد ہو چکا تھا۔ یہاں پندرہ ہزار خیمے نصب تھے۔ خیموں کی اس بستی کے وسط میں تیمور کا خیمہ تھا۔ پانچ سو سے زائد رسّوں نے اس خیمے کو سنبھال رکھا تھا۔ مرکزی خیمے کی چھت گنبد نما گول تھی اور ایک طاقتور انسان کی کلائی جتنے موٹے موٹے بارہ نیلے اور سنہرے ستون اس کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھے۔ اس کے دونوں طرف برآمدے تھے۔ خیمے کے بیرونی پردے ریشمی تھے جن کی سیاہ، زرد اور سفید دھاریاں بڑی بھلی لگتی تھیں۔ خیمے کے چاروں کونوں میں بڑے بڑے کھلے پروں والے عقاب بنائے گئے تھے۔ خیمے کے گرداگرد رنگ دار اونچی دیوار تھی جس میں چھوٹے چھوٹے برج اور مینار بنے ہوئے تھے۔ یہ امیر تیمور کا خیمہ تھا۔ اس سے ذرا ہٹ کے ملکہ اور شہزادیوں کے خیمے تھے، جن پر زردار گلابی کمخابی پردے پڑے ہوئے تھے۔ ان خیموں سے دُور امرا اور دوسرے منصب داروں کے خیمے تھے اور سب سے آخر میں سپاہیوں اور تاجروں کے خیمے تھے۔ فاتح کی تشریف آوری کی خوشی میں یہاں ایک جشن برپا تھا۔

فیضی، رحم دل مذہبی سپاہی کے خیمے میں داخل ہوا اور اسے امیر تیمور کا یہ عجیب و غریب حکم سنایا کہ شب کو اس کے بیٹے میراں شاہ کی بیوی خانزادی نے فاتح سمرقند کی تشریف آوری کے اعزاز میں شراب کی جو دعوت دی ہے اس میں اسے بھی شریک ہونا ہے۔ سپاہی کو شبہ گزرا کہ تیمور اس کے قتل کے بہانے تلاش کر رہا ہے۔ اس نے فیضی سے آزردہ لہجے میں کہا۔

”امیر صاحبِ امر ہے، اسے میرے قتل کے لیے کسی بہانے کی کیا ضرورت؟“

فیضی نے حکماً کہا: ”تم بھولے انسان یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ امیر تم پر مہربان ہے۔ تم اس کی مہربانی کو سمجھو اور اس سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرو!“ پھر پوچھا: ”تمھارا نام کیا ہے؟“

سپاہی نے جواب دیا: ”حسن تاباں۔“ پھر کچھ فکر مند لہجے میں بولا: ”میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ شہزادیوں کی محفلِ شراب نوشی کے آداب کیا ہیں۔ میں وہاں پہنچ کر یقیناً کسی لغزش یا غلطی کا مرتکب ٹھہروں گا اور بے گناہ مارا جاؤں گا!“

فیضی نے تقریباً سرگوشی میں کہا: ”تیرا چہرہ ترکوں سے ملتا جلتا ہے۔ امیر تجھے ایک خاص مہم پر بایزید کی مملکت میں بھیجنا چاہتے ہیں۔ اگر تو نے امیر کی یہ مہم پوری دانش مندی اور احتیاط سے سر کر لی تو یہ میرا ذمہ کہ تو کسی بڑے منصب اور گراں قدر انعام و اکرام کا مستحق قرار پائے گا!“

حسن تاباں کو فیضی کی کسی بات کا یقین نہ آتا تھا۔ یہ مجال نہ تھی کہ وہ شہزادی کی تقریبِ مے نوشی میں شریک ہونے سے انکار کر دیتا۔ رات کو محفل کے شایانِ شان لباس پہنا اور فیضی کے ساتھ اس تقریبِ خصوصی میں شامل ہو گیا۔ اس مخصوص محفل کا سماں ہی عجیب تھا۔ طویل و عریض خیمے کے ہال میں مہ وشوں کا ہجوم تھا۔ ان سے ذرا دُور ہٹ کے عمر رسیدہ سپاہی للچائی نظروں سے

شراب کی صراحیوں اور مہوشوں کو گھور رہے تھے، شہزادیاں اور معزز خواتین اپنی مخصوص نشستوں پر اِک شانِ بے نیازی سے گاؤ تکیوں کے سہارے بیٹھی ہوئی تقریبِ ناؤ نوش کا تماشا کر رہی تھیں، مختلف سمتوں سے چند نوعمر غلام سونے کی صراحیاں لیے نمودار ہوئے ان کے ساتھ ہاتھوں میں طشتریاں اور طشتریوں میں پیالے لیے ہوئے دوسرے غلام تھے ان کے ہاتھوں پر کپڑا لپٹا ہوا تھا، مے بدست غلام شہزادیوں اور خواتین کے روبرو پہنچے اور پیالوں میں شراب اُنڈیل انڈیل کر ان کی طرف ادب سے پیش کرنے لگے، ہاتھوں پر لپٹا ہوا کپڑا غلام اور شہزادیوں کے ہاتھوں کو مَس ہونے سے بچا رہا تھا۔ غلام پہلے تو کئی بار جھک کر ان معزز خواتین کو آداب بجالاتے اس کے بعد شراب کا پیالہ پیش کرتے، یہ پری پیکر مسکرا مسکرا کر پیالے وصول کرتیں اور غٹا غٹ حلق میں اُتار جاتیں۔

حسن تاباں اس سرور انگیز تقریب میں پہلی بار شریک ہوا تھا اور بن پیے ہی بدمست ہو رہا تھا۔ فیضی نے اسے سمجھایا کہ اعتدال میں رہے اور جب تک اس محفلِ ناؤ نوش میں رہے یہ سمجھتا رہے کہ وہ پُل صراط سے گزر رہا ہے، اتنے میں چند خوبصورت لڑکیاں صراحی بردوش اور جام بکف مردوں میں آگئیں اور مسکرا مسکرا کر شراب کی تقسیم شروع کر دی۔ فیضی اور حسن تاباں نے ایک ساتھ جام لیے اور ایک سانس میں پی گئے حالانکہ دوسرے عمر رسیدہ مے نوش گھونٹ گھونٹ پی رہے تھے۔ حسن تاباں نے اپنے ساتھی سے پوچھا "میں اس لڑکی سے کتنے جام تک مانگ سکتا ہوں؟"

فیضی نے ترنگ میں جواب دیا "جتنے بھی پی سکو!"

حسن تاباں نے چند جام تو ذرا تکلف سے پیے اس کے بعد کیف و مستی میں بے قابو ہو گیا، اس نے پیتے ہی پیتے لڑکی کا ہاتھ پکڑ لیا اور مستی میں ڈوبی ہوئی آواز میں پوچھا "اے رشکِ ناہید! تیرا نام کیا ہے؟"

فیضی نے اس کا شانہ دبایا، ہونٹ بھینچ کر بولا "یہ کیا غضب کرتے ہو؟ کیا تمھیں زندگی عزیز نہیں ہے؟"

حسن تاباں نے فیضی کا ہاتھ جھٹک دیا۔ غرّا کر بولا "کیا فضول کی بک بک کرتا ہے زیادہ ستائے گا تو وہ ہاتھ دوں گا کہ کابلوں کی سرزمین ہندوستان جاگرے گا!" اس کے فوراً بعد لڑکی سے مخاطب ہوا "ہاں جی تو تم نے ہمیں اپنا نام نہیں بتایا؟"

لڑکی ہنسی پر قابو پانے کی کوشش میں دُہری ہوتی جا رہی تھی، اسے اس جرأت مند سپاہی پر ہنسی آ رہی تھی۔

حسن تاباں نے اس کا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لیا "بخدا تم ذرا دل کی حرکت تو دیکھو، یہ کیسا مچل رہا ہے سینے میں، ایسا لگتا ہے جیسے پسلیاں توڑ کر باہر ہی تو نکل آئے گا اور تمھارے قدموں میں تڑپنے لگے گا!"

لڑکی نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی، بولی "اور پیو گے یا میں آگے جاؤں؟"

حسن تاباں نے بے نیازی سے جواب دیا "آگے کہاں جاؤ گی جانِ من، صراحی کی ساری شراب ہمیں پلا دو، بخدا تم جیسا پلانے والا ہو اور مجھ جیسا پینے والا، پھر بس کی نوبت کا ذکر ہی کیا!"

فیضی پریشان ہو رہا تھا۔ اس نے کنکھیوں سے حاضرینِ محفل کے تاثرات اور کیفیات کا جائزہ لینے کی کوشش کی، چند عمر رسیدہ سپاہی حسن تاباں کی پیش دستی ناگواری سے دیکھ رہے تھے لیکن خواتین بے ساختہ ہنسے جا رہی تھیں، حسن تاباں نے لڑکی کا ہاتھ نہایت مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ لڑکی نے چھڑانے کی کوشش کی تو گرفت اور زیادہ سخت ہو گئی، وہ جھنجلا کر بولی "میرا ہاتھ تو چھوڑو، میں شراب کیونکر انڈیلوں؟"

"پہلے تم اپنا نام بتاؤ مجھے، پھر ہاتھ چھوڑوں گا!"

دوسری شراب تقسیم کرنے والی لڑکیاں اس لڑکی کی بے بسی اور مجبوری سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

فیضی نے ذرا درشت لہجہ اختیار کیا، کہا "تم جتنی زیادہ لغزشیں کر سکتے ہو کر لو، جتنے زیادہ بہک سکتے ہو بہک لو، موت تمھارے قریب کھڑی تمھیں اپنے ساتھ لے جانے کی منتظر ہے!"

"بخدا!" حسن تاباں بے خوفی سے بولا "جب تک یہ حورِ بہشتی مجھے اپنا نام نہ بتائے گی، میں موت کو اپنے قریب تک آنے دوں گا، اگر موت واقعی کہیں میرے آس پاس موجود ہے تو دوست! یہ لڑکی ہی وہ موت ہو گی!"

"تم بہت زیادہ بہک رہے ہو!" فیضی نے عاجز آ کر کہا۔

لڑکی نے ایک زور کا جھٹکا دیا لیکن حسن تاباں سے ہاتھ نہ چھڑا سکی، آخر تنگ آ کر بولی "میرا نام الجائی خانم ہے، لو بتا دیا میں نے اپنا نام، اب تو میرا ہاتھ چھوڑ دو!"

حسن تاباں نے فوراً ہاتھ چھوڑ دیا اور نہایت سرشار اور للچائی نظروں سے لڑکی کو گھورتا ہوا مسکرا کر بولا۔

"الجائی خانم! خوب کیا نام ہے لڑکی تمھارا، اتنا لطیف اور پیارا نام تمھاری ترنم ریز آواز میں کچھ زیادہ ہی اچھا لگتا ہے، خیر ابھی تم جانا مت، مجھے جی بھر کے پی لینے دو پہلے۔"

لڑکی پلاتی رہی، وہ پیتا رہا اور اس نے اتنی زیادہ پی لی کہ فیضی کو یقین ہو گیا کہ اب شاید تیمور کو اس کے قتل کا حکم نہیں دینا پڑے گا، یہ خود ہی مر جائے گا!

لیکن وہ نہیں مرا، پوری محفل میں سب سے زیادہ شراب پی لینے کے باوجود وہ زندہ رہا اور جب وہ نشے میں بالکل بے اختیار ہو گیا تو لڑکھڑاتے قدموں سے وہ وہ تماشے دکھائے کہ معزز خواتین اور شہزادیاں خوب خوب محظوظ ہوتیں، انھیں بھی نشے نے بے حال کر رکھا تھا، حسن تاباں نے سب سے زیادہ شراب پی تھی اور وہ سب سے زیادہ ہی بہک بھی رہا تھا۔ جب نشے کی وارفتگی میں حسن تاباں میں اتنی طاقت نہ رہی کہ وہ الجائی خانم کو روک سکتا تو مجبوری سے چلا جانے دیا لیکن لڑکھڑاتی بدمست آواز میں یہ بھی کہہ دیا۔

"لڑکی! تم نے کیا نام بتایا تھا اپنا؟ — الجائی خانم!! میں تمھارا پتہ کہاں پوچھتا پھروں گا تم خود مجھے تلاش کر لینا، میں تمھارا انتظار کروں گا، الجائی تم نے تو میرا دل جیت لیا ہے!"

کافی رات گئے تک یہ جشنِ ہاؤ ہو برپا رہا۔ عمر رسیدہ سپاہیوں کی داڑھیاں، بانچھوں سے بہتی ہوئی شراب سے تر بتر تھیں، اور وہ اپنے ہوش میں نہ ہونے کے باوجود مہوشوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے کی کوششوں سے باز نہ آتے تھے، فیضی بھی نشے میں تھا لیکن اسے حسن تاباں کی غیر ضروری جرأت مندیوں نے بہت زیادہ خوفزدہ کر رکھا تھا۔ جب لوگ اس محفل سے رخصت ہونے لگے تو حسن تاباں اتنا مدہوش ہو چکا تھا کہ وہ اپنے پیروں سے واپس نہ جا سکا۔ فیضی نے اسے اپنے کاندھے پر ڈال لیا اور اس محفل سے نکل گیا۔

○

صبح جب خمار کے اُتار سے اعضا ٹوٹنے لگے اور وہ ہوش میں آ گیا تو اسے اپنی بے اعتدالیوں سے خوف محسوس ہونے لگا، فیضی موجود نہ تھا۔ اسے الجائی خانم یاد آئی، اس کا ہنستا مسکراتا طرزِ تکلم اور کیف و مستی میں ڈوبی ہوئی شوخ و شنگ ادائیں یاد آئیں تو دل مسوس کر رہ گیا، بے چین ہو گیا۔ اس نے سوچا وہ معلوم نہیں کون تھی، اور اب دوبارہ ملاقات ہو بھی سکے گی یا نہیں، الجائی خانم کے سرور انگیز تصور کے ساتھ ہی اسے اپنی رات کی بے اعتدالیاں پھر یاد آئیں، اسے ساری باتیں خیالوں کے مرغولے بن کر یاد آ رہی تھیں، رفتہ رفتہ خوف نے شدت اختیار کرنی شروع کر دی اور وہ کانپنے لگا۔ ذرا سا کھٹکا موت کے فرشتے کی آہٹ بن کر سہما دیتا۔ اسے خدشہ ہی نہیں یقین تھا کہ رات کی بے اعتدالیوں کی اسے سزا مل کر رہے گی، اس میں دیر تو ہو سکتی ہے لیکن ٹل نہیں سکتی، اس نے رات ضرورت سے زیادہ پی لی تھی، اتنی زیادہ کہ شاید زندگی میں رات سے پہلے کبھی بھی اتنی نہ پی تھی، وہ شاید ذرا سی پی کر بس کر دیتا لیکن الجائی خانم جیسا ساقی جب ہنس ہنس کے پلائے تو کون کافر ہے جو احتیاط اور مقدار کا خیال کرے گا۔

یکایک خیمے کے باہر سے قدموں کی آہٹ سنائی دینے لگی، کوئی شخص دم بہ دم خیمے کے قریب آتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کوئی خدمت گار ہو گا جو تیمور کی سزائے موت کا پروانہ لے کر آ رہا ہے لیکن ذرا دیر بعد خیمے میں فیضی داخل ہوا، اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی، آتے ہی بولا "حسن تاباں! تم خوش قسمت ترین انسان ہو، تم نے رات اتنی زیادہ شراب پی لی تھی کہ امیر (تیمور) تمھیں میرے دوش پر مدہوش دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور اپنی پسندیدگی کا اظہار فرمایا!"

حسن تاباں کو ایسا محسوس ہوا جیسے فیضی اس سے مذاق کر رہا ہو لیکن فیضی نے بات پوری کر دی "رات تم نے سب سے زیادہ شراب پی، اتنی زیادہ کہ گزشتہ پانچ سال میں اس کی دوسری کوئی مثال نہیں ملتی، پھر تم نے عالمِ سرمستی میں جس جرأت اور پیش دستی کا مظاہرہ کیا، امیر اس سے بھی خوش ہوئے اور تمھیں بیطر (ہیرو) کا خطاب مرحمت فرمایا ہے، یہ وہ خطاب ہے جو بہت کم لوگ حاصل کر پاتے ہیں!"

حسن تاباں کو خطاب سے زیادہ الجائی خانم کی فکر تھی، اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ اس لڑکی کی بابت فیضی سے کس طرح سوال جواب کرے۔

بیطر (ہیرو) کا خطاب مل جانا کوئی معمولی بات نہ تھی، اس کا بڑا چرچا ہوا، دوستوں نے حسن تاباں کے اعزاز میں ایک چھوٹی سی تقریب کا اہتمام کیا اور یہ تقریب فیضی کے خیمے میں منعقد ہوئی، یہیں حسن تاباں کی الجائی خانم سے دوسری ملاقات ہوئی۔ ہلکے نیلے لباس میں ملبوس الجائی خانم آسمانی حور بن کر فیضی کے پرتکلف خیمے میں جلوہ گر تھی، بغیر آستینوں کا ریشمی جبہ پہنے اور سر پر شوکلی (اونچی ٹوپی) پہنے وہ جنگلی تتلی کی طرح خیمے میں لہراتی پھر رہی تھی، جبہ گلے تک پہنچتے پہنچتے تنگ ہو گیا تھا۔ شوکلی (اونچی ٹوپی) میں قیمتی موتی ٹنکے ہوئے تھے، ٹوپی کا اوپری حصہ کالر کی شکل اختیار کر گیا تھا جس میں پَر لگے ہوئے تھے، اور یہ پَر لٹکنے بڑے تھے کہ آنکھوں پر سایہ کر رکھا تھا، جب وہ حرکت کرتی تو پَر ہلنے لگتے۔ وہ حسن تاباں کو دیکھ کر مسکرائی کیونکہ وہ اس بلانوش گستاخ کو خوب اچھی طرح پہچان چکی تھی، حسن تاباں کا یہ حال ہوا کہ بے پیے ہی سرشار ہو گیا۔

الجائی خانم نے اسے مبارک باد پیش کی "— بلانوش اور گستاخ نوجوان! الجائی خانم تجھے بیطر کا خطاب ملنے پر مبارک باد پیش کرتی ہے!"

حسن تاباں حسن کے احترام میں گھٹنوں کے بل بیٹھ کر الجائی خانم کے روبرو تقریباً سجدہ ریز ہو گیا اور فرطِ جذبات میں شیخ کمال الدین خجندی کا شعر پڑھا "اگر تو محل ہے تو خوبصورتی اور رعنائی کا محل ہے، شراب کا پیالا لا تاکہ میں دونوں جہانوں سے بے فکر و بے نیاز ہو جاؤں!"

الجائی خانم نے مسکرا کر جواب دیا "بلانوشی تیری بہت بڑی خوبی سہی لیکن اسے کبھی کبھی کے لیے اٹھا رکھ، تو سپاہی ہے کچھ سپاہیوں جیسے کام بھی تو دکھا، ورنہ امیر کی نظر سے گر جائے گا!"

حسن تاباں نے الجائی خانم کا ہاتھ پکڑ کے آنکھوں سے لگا لیا اور پھر اسے چومتا ہوا بولا "بخدا اگر تو میری رفیق بن جائے تو حسن تاباں دنیا کا دشوار ترین کام تک انجام دے سکتا ہے!"

فیضی یہ تماشا بہ جبر دیکھ رہا تھا، اپنی جگہ سے اٹھا اور آہستہ آہستہ چل کر دونوں کے قریب پہنچا اور ٹھہر ٹھہر کر کہنے لگا "حسن تاباں! تم آج کی تقریب کے مہمانِ خصوصی ہو اور یہ میرا خیمہ ہے، کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تمھاری رات جیسی بلانوشی اور جسارتیں تمھیں کسی نئے خطاب یا اعزاز سے ہمکنار کر دیں گی میں

امیر تیمور نہیں ہوں، براہِ کرم اس خیمے میں رات جیسے مظاہروں سے گریز اختیار کرو۔“ اس کے بعد الجائی خانم سے کہا: ”الجائی خانم! تم بھی محتاط رہنا!“

دونوں بے دلی سے علیحدہ ہو گئے۔ فیضی سنگ باشی (ایک ہزاری کماندار) تھا اور حسن تاباں یوز باشی (ایک صدی کماندار) مناصب کی برتری کمتری آڑے آئی اور حسن تاباں نے ضبط سے کام لیا۔

آہستہ آہستہ دوستوں اور اس تقریب میں مدعو کیے جانے والوں کی آمد شروع ہو گئی اور عشا کے بعد مے نوشی کا شاندار جشن برپا ہوا لیکن اس رات حسن تاباں کی بلانوشی میں فرق آ چکا تھا اور اس کی گستاخیاں بھی تقریباً مفلوج ہو گئی تھیں، جس کا بنیادی سبب یہ تھا کہ الجائی خانم اس سے دور رکھی گئی تھی، اس وقت وہ فیضی کے لیے مخصوص ہو چکی تھی، گاہ گاہ حسن تاباں کی نظریں الجائی خانم کی طرف اُٹھ جاتیں، اسی لمحے الجائی خانم بھی حسن تاباں کو دیکھتی۔ لیکن ان دونوں کی متصادم نظریں فیضی سے بھی محفوظ نہ رہتیں، فیضی اُنھیں ناگواری سے دیکھتا اور دونوں گھبرا کر نگاہیں نیچی کر لیتے، اس بار حسن تاباں کو شراب پلانے والا ایک کم عمر غلام تھا، وہ بجھا بجھا اُداس اُداس شراب پیتا رہا اور یہ گتھی سلجھانے میں مصروف رہا کہ آخر الجائی کا فیضی سے رشتہ کیا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال تھا کہ فیضی سے نہیں کیا جا سکتا تھا۔

محفل کے برہم ہونے سے ذرا پہلے فیضی حسن تاباں کو اپنے خیمے کے داہنی طرف نسبتہً چھوٹے خیمے میں لے گیا اور کہنے لگا: ”میں چاہتا ہوں کہ تم الجائی کی طرف سے کسی بڑے مغالطے کے شکار نہ ہو جاؤ۔ کل تک الجائی خانم تیموری خواتین اور شہزادیوں کی ایک کنیز تھی لیکن امیر نے اسے خوش قسمتی سے میرے حوالے کر دیا ہے، اب میں اس کا مالک ہوں، تمھیں اس سے غلط توقعات نہیں لگانی چاہئیں!“

حسن تاباں کا دم سینے میں گھٹنے لگا، یہ اطلاع قضا کے تیر کی طرح دل میں پیوست ہو گئی۔

فیضی نے مزید کہا: ”حکومت، دولت اور عورت جواں مردی کے عوض ملتے ہیں، ایک بار میں نے بھی ایک غیر معمولی کارنامہ انجام دیا تھا جس کے صلے میں سنگ باشی کے منصب سے سرفراز کیا گیا، یہ الجائی خانم اسی بڑے انعام کے ضمیمے کے طور پر مجھے مرحمت کی گئی ہے۔ اگر تم چاہو تو تمھیں بھی کسی ایسے ہی دلکش انعام سے نوازا جا سکتا ہے!“

حسن تاباں نے گھٹی گھٹی آواز میں پوچھا: ”وہ کس طرح؟“

فیضی نے جواب دیا: ”کوئی غیر معمولی کارنامہ انجام دو اور غیر معمولی انعام حاصل کر لو!“

حسن تاباں تو الجائی خانم پر ریجھ گیا تھا اور اسے اس بات پر یقین نہ تھا کہ وہ کوئی غیر معمولی کارنامہ انجام دے کر الجائی خانم جیسی کوئی دوسری حسین لڑکی ــــ انعام میں حاصل کر سکتا ہے! اس نے فیضی کو کوئی جواب نہ دیا۔ فکرمند چہرہ بنا کر خاموشی اختیار کر لی۔

فیضی کی کیفیت یہ بتاتی تھی کہ وہ کوئی اہم بات کہنا تو چاہتا ہے لیکن کہنے کا معقول اسلوب نہیں مل رہا۔ کچھ غور و خوض کے بعد فیضی نے کہا۔ ”ایک نیا اور بڑا محاذ کھل چکا ہے اور اس محاذ پر دو بڑے شاطر اور ماہرِ جنگ اپنے اپنے حصے کے کام کا آغاز کر چکے ہیں، ہم دونوں اس بڑے محاذ اور بڑی بساط کے پیادے ہیں، ہم اگر چاہیں اور کوشش کریں تو کوئی بڑی مات دے کر غیر معمولی کارنامہ انجام دے سکتے ہیں!“

حسن تاباں نے بے تابی سے کہا: ”میرے حصے کا کام بتاؤ، میں الجائی کے لیے بڑے سے بڑا کارنامہ انجام دے سکتا تھا لیکن اب ــــ لیکن اب ــــ امیر کا رعب اور حکم ہی کوئی نہ کوئی بڑا کارنامہ انجام دلوا سکتا ہے!“

فیضی نے کہا: ”ایک دوسرا بڑا فاتح بایزید جسے اہلِ مغرب یلدرم (برقِ خاطف) کہتے ہیں، شاید امیر کا حریف بن کر نمودار ہونے والا ہے، امیر تیمور ہتھیاروں کی جنگ سے پہلے ہوشیاری اور عقل کی جنگ شروع کر دینا چاہتا ہے۔ اس عقلی جنگ کا آغاز ہم کریں گے، نہایت ہوشیاری اور عقل مندی کے ساتھ!“

حسن تاباں ہتھیاروں کی جنگ تو بارہا لڑ چکا تھا لیکن یہ عقلی اور ہوشیاری کی جنگ کیا ہوتی ہے، شاید اس نے پہلی بار اس عجیب و غریب جنگ کا نام سنا تھا، پوچھا: ”سپاہی ہتھیاروں کی جنگ تو صدیوں سے لڑ رہے ہیں لیکن یہ ہوشیاری اور عقلی جنگ کیا ہوتی ہے؟“

فیضی نے جواب دیا: ”تمھیں یاد ہو گا سلطان نے تمھیں دیکھ کر ایک بار یہ کہا تھا کہ تم اپنے چہرے مہرے اور خط و خال سے بالکل ترک معلوم ہوتے ہو، امیر کی یہی رائے خود میری بابت بھی رہی ہے اور ہمارے ہی جیسے اور بہت سے لوگ بھی ہیں، امیر کا حکم ہے کہ ہم لوگ عام شہریوں، کاریگروں اور ہنرمندوں کی طرح انگورہ میں داخل ہو جائیں اور بایزید کی تاتاری سپاہ میں بددلی پھیلانا شروع کر دیں، ہم انھیں نہایت ہوشیاری سے یہ یقین دلانے کی کوشش کریں گے ــــ کہ امیر تیمور کے سپاہیوں کو تنخواہیں زیادہ ملتی ہیں، امیر اپنی سپاہ میں ایک شفیق باپ کی حیثیت رکھتا ہے اور انھیں اکثر و بیشتر گرانقدر انعام و اکرام سے نوازتا رہتا ہے جبکہ بایزید کی فوج کو یہ سہولتیں اور یہ مہربانیاں نہیں حاصل ہیں، بایزید کی تاتاری سپاہ ہماری اس تشہیر سے بدظن ہو کر ٹوٹ جائے گی جو ہتھیاروں کی جنگ سے پہلے ایک اہم فتح ثابت ہو گی!“

حسن تاباں نے بے دلی سے اکتا کر کہا: ”یہ کام اتنا بڑا تو نہیں کہ انجام دینا مشکل ہو!“

فیضی نے مضطرب لہجے میں کہا: ”اگر یہ کام مشکل نہیں ہے تو تم اس کی انجام دہی کا بیڑا اُٹھا لو، یہ منصوبہ چونکہ میری نگرانی میں دے دیا گیا ہے اس لیے میں یہ کوشش کروں گا کہ اس منصوبے کے جو کردار بھی ہیں، میں ان سے بہر قیمت کام لوں۔“

حسن تاباں نے جواب دیا: ”میں امیر کا نمک خوار ہوں، مجھے جو کام بھی تفویض ہو گا پوری دیانت اور محنت سے انجام دوں گا!“ پھر پوچھا: ”مجوزہ لوگ اپنے منصوبے پر کب روانہ ہوں گے؟“

فیضی نے جواب دیا: ”بہت جلد لیکن اس کا آغاز دونوں فاتحوں کے خطوط سے ہو گا!“

”اچھا!“ حسن تاباں نے ٹالنے والے انداز میں کہا: ”مجھے امیر نے بیطر کا خطاب دیا ہے، بلانوشی کا بیطر، میں پوری کوشش کروں گا کہ دوسرے میدانوں کا بھی بیطر ثابت ہوں!“

”شاباش!“ فیضی نے کہا: ”مجھے تم سے یہی اُمید ہے!“

اس بات چیت کے دوران الجائی خانم بھی وہیں پہنچ گئی۔ حسن تاباں نے اسے دیکھا اور کچھ دیر دیکھتا ہی رہ گیا، فیضی نے دونوں کو ترچھی نظروں سے دیکھا اور الجائی خانم کو کندھے سے پکڑ کر خیمے کے ملحق کمرے میں لے چلا گیا، حسن تاباں بھی ان کے پیچھے پیچھے وہیں پہنچ گیا۔

فیضی کے منصوبے کے بعض کارکن تھوڑی ہی دیر کے لیے امیر تیمور کی خدمت میں پیش کیے گئے۔ ان سب کی مجموعی تعداد ہزاروں میں تھی، ان میں بعض بڑھئی تھے، بعض راج، بعض دستکار اور دوسرے ہنرمند لوگ، بوڑھے تیمور نے ان سے بس چند باتیں کیں: ”کام، کام اور کام، ہر قیمت پر کام، وہ کام جو امیر کی طرف سے اسے تفویض ہوا ہے، زندگی اور موت کی پروا کیے بغیر، زندگی کی آخری سانسوں تک کام!“

حسن تاباں ذرا اکھڑ طبیعت رکھتا تھا اور یہ اس کی طبیعت کا خاصہ تھا کہ اگر وہ کسی بات سے بھاگ رہا ہو یا پیچھے ہٹ رہا ہو، اگر اسے کسی طرح اس بات پر مائل کر دیا جائے تو پھر وہ اپنی جان کی بازی لگا کر اسی بات میں لگ جاتا تھا۔ اس میں سوچ سمجھ کا مادہ کم تھا۔ کسی بات پر بھی جوش اُبال کی طرح پیدا ہوتا تھا۔ اس اُبال سے کام بھی لیا جا سکتا تھا اور اسے ضائع بھی کیا جا سکتا تھا۔ اس کی خواہشات سرکش اور سرپھرے سانڈ کی طرح سر اُٹھاتی تھیں، انھیں امیر کا دبدبہ اور خوف ہی قابو میں رکھ سکتا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی امیر کا ذرا سا مشفقانہ رویہ اس میں حوصلہ اور جرأت پیدا کرنے کا موجب بھی بن سکتا تھا چنانچہ جب امیر نے اس سے نرم لہجے میں کہا: ”تو وہی شخص ہے نا جس نے بلانوشی کی ایک مثال قائم کی تھی؟“

تو حسن تاباں نے خوش ہو کر فخریہ انداز میں کہا: ”ہاں یہ ناچیز وہی ہے جسے امیر نے بیطر کا خطاب مرحمت فرمایا ہے لیکن اس غلام کو بے جان لفظ بیطر سے کیا فائدہ پہنچے گا؟“

امیر نے اس گستاخ مگر صاف گو کو غور سے دیکھا، پھر ذرا تامل سے کہا: ”تجھے خدا نے ایک موقع فراہم کیا ہے، تجھے جو کام سونپا گیا ہے اسے اس طرح انجام دے کہ تیرے دوسرے ساتھی اس طرح نہ انجام دے سکیں، پھر تو یقیناً انعام میں جاندار چیزیں بھی حاصل کر سکے گا!“

امیر کے نرم طرزِ تخاطب نے اسے جری کر دیا، بولا: ”امیر کا لشکر سمندر کی طرح ہے جس کا یہ ناچیز بھی ایک قطرہ ہے، غلام کو الجائی خانم اتنی زیادہ پسند آ گئی ہے کہ اگر امیر کسی طرح اسے اس ناچیز کے حوالے فرما دیں تو بندہ نہ صرف بے حد شکر گزار ہو گا بلکہ خدماتِ مفوضہ کی ادائی میں سر دھڑ کی بازی لگا دے گا۔“

امیر نے درشت لہجے میں جواب دیا: ”اپنی خدمات کے صلے میں کچھ مانگنا گستاخی ہے لیکن ہم تیرے جذبے کی قدر کرتے ہیں، عشق کے جذبے کی قدر۔ عاشق سب کچھ کر سکتا ہے، جا، ترکی چلا جا اور اپنی مفوضہ خدمات دیانت اور محنت سے انجام دے، الجائی سے نہیں تو کسی اور سے ضرور نوازا جائے گا!“

اس کے بعد امیر نے تالی بجا کر خدمت گار کو طلب کیا اور اسے حکم دیا: ”اسے نمک حراموں کے حشر سے آگاہ کیا جائے!“

خدمت گار اسے بغلوں میں ہاتھ دے کر باہر لے آیا اور اسے ایک دوسرے خدمت گار کے سپرد کر کے اپنی جگہ جا بیٹھا۔ امیر کے خیمے سے دور راستے میں فیضی بھی مل گیا۔ امیر کے خدمت گار نے اسے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ فیضی نے پوچھا: ”امیر سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا؟“

”ہاں؟“ حسن تاباں نے جواب دیا۔

فیضی نے پوچھا: ”کوئی ناخوشگوار لمحہ تو نہیں آیا؟“

”نہیں!“ حسن تاباں نے جواب دیا لیکن اس کے متردد چہرے سے اندیشے ظاہر تھے۔

خدمت گار اسے ایک ایسے خیمے میں لے گیا جس کے دروازے پر بھیانک چہروں والے برہنہ شمشیر بردار کھڑے پہرا دے رہے تھے، فیضی باہر ہی کھڑا رہ گیا، خدمت گار برہنہ شمشیروں کے سائے سے گزار کر حسن تاباں کو اندر لے گیا۔ خدمت گار نے اسے بتایا: ”یہاں وہ لوگ رہتے ہیں جو یا تو غدار تھے یا پھر کسی اور سنگین جرم کے مرتکب ہوئے، امیر جب یہ محسوس کرتے ہیں کہ انھیں کسی شخص کو اس کی غداری یا دوں ہمتی کے انجام سے مطلع کر دیا جائے تو اسے یہاں ضرور بھیجا جاتا ہے۔“

حسن تاباں خاموشی سے قید خانے کی سیر کرنے لگا۔ یہاں اعضا بریدہ قیدی رہتے تھے، کسی کا ہاتھ کاٹ دیا گیا تھا، کسی کے پیر، کسی کے کان غائب تھے، کسی کی ناک، انھیں دیکھتا ہوا وہ ایک ایسی جگہ پہنچا جہاں ایک شخص زیرِ تعزیر تھا، اس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے اور منہ میں کپڑا ٹھونس کر ایک مضبوط شہتیر سے جکڑ دیا گیا تھا۔ چند آدمی اسے اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھے اور ایک دیو قامت بڑے بڑے بالوں والا تاتاری ایک موٹے اور خوفناک موچنے سے اس کی انگلیوں سے ناخن جدا کر رہا تھا۔ موچنے سے ناخن کو پکڑ کر جھٹکے سے کھینچ لیتا، ناخن موچنے میں رہ جاتا اور اُنگلی سے خون کا فوارہ بہہ نکلتا، منہ میں کپڑا

ٹھنسا ہونے کی وجہ سے وہ شخص چیخ بھی نہ سکتا تھا۔ ایک لرزہ کراہ جو ناک سے نکلتی تھی چہرے کا کرب اور اذیت سے دھندلا جانے والا رنگ اور آنکھوں سے بہہ نکلنے والے آنسو اس کی اذیت کو ظاہر کرتے تھے۔ اسی طرح ہاتھ پیر کی تمام انگلیوں سے ناخن علیحدہ کر دیے گئے۔ آخر میں وہ شخص بے ہوش ہو گیا لیکن بے ہوشی میں بھی کسی کسی لمحے اس کی کراہ نکل جاتی۔ قید خانے کا یہ سب سے زیادہ دردناک منظر تھا۔

واپسی میں خدمت گار نے لاپرواہی سے کہا۔ "یہ چند معمولی سزائیں ہیں جن سے غدار اور دھوکے باز لوگ دوچار ہوتے ہیں ورنہ اس سے بڑی سزائیں بھی دی جاتی ہیں لیکن مجھے صرف اسی قید خانے کی سیر کرانے کا حکم دیا گیا تھا۔" حسن تاباں کے ہوش و حواس جاتے رہے۔ اس نے زیرِ لب کہا۔ "خطرناک لیکن لوگ غداری کرتے ہی کیوں ہیں؟"

خدمت گار نے جواب دیا۔ "آدمی کو غداری پر کئی چیزیں آمادہ کر دیتی ہیں۔ دشمن کا جور و ظلم، دشمن کی طرف سے کسی عظیم انعام کی طمع، عورت یا دولت کا لالچ۔ بس یہی چند چیزیں ہیں جو آدمی کو غداری کی طرف لے جاتی ہیں!"

اکھڑا اور سلطی حسن تاباں کوئی اور ہی منصوبہ بنا رہا تھا۔ ترکی پہنچ کر امیر سے نجات حاصل کرنے کا منصوبہ۔

خدمت گار حسن تاباں کو فیضی کے حوالے کر کے واپس چلا گیا۔

ل

اعصاب برید ہیدلیل کا ہیبت تاثر لیے ہوئے وہ فیضی کے ساتھ انگورے پہنچ گیا۔ وہ اس سفارتی مہم میں شامل تھا جو تیمور کا نامہ لے کر بایزید یلدرم کے دربار میں پہنچی تھی۔ تیمور کا پیغام نہایت مختصر اور سادہ تھا۔ تیمور نے لکھا تھا۔

• میں خدا کا بندہ تیمور، ترکی کے فاتح سلطان سے کہتا ہوں کہ وہ میرے معتوب افراد کی مہمان نوازی کی غلطی نہ کرے۔ سلطان میرا بھائی ہے اور ایک بھائی کو دوسرے بھائی کی دل آزاری سے بچنا چاہیے۔

بایزید یلدرم تیمور کے خط سے غضب ناک ہو گیا۔ چہرہ سرخ اور پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ وہ شیر کی طرح گرجا۔

"خانہ بدوشوں کی اولاد! تیری یہ مجال کہ ترک فاتح کو بھائی کہے۔ ٹھہر جا! ہم تجھے سمرقند ہی میں مزہ چکھائیں گے!" پھر سفرا کو مخاطب کیا۔ "واللہ اگر تم نامہ بر نہ ہوتے تو ہم اس ذلیل مکتوب کی وجہ سے تمہیں قتل کرا دیتے لیکن ہم تمہیں کوئی سزا نہ دیں گے۔ تم اپنے ذلیل اور خانہ بدوش لیڈر سے کہہ دینا کہ بایزید برقِ خاطف ہے جس نے مغرب کے سرکش علاقوں کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ اب برقِ خاطف سمرقند اور بخارا پر گرنے والی ہے۔ کہنا، ہمارا انتظار کرو!"

فیضی نے دلیری سے جواب دیا۔ "ترک فاتح کو جو کچھ کہنا ہے ہمیں لکھ کر دے دے کیونکہ ہمارے امیر نے بھی تحریر ہی کے ذریعے بات چیت شروع کی ہے!"

بایزید کو اس تاتاری سفیر کی جرأت پر غصہ تو آیا پھر بھی برداشت کر گیا اور تیمور کے خط کا جواب لکھوا کر فیضی کے حوالے کر دیا۔

بایزید کا جواب تھا:۔

• او تیمور نامی کتے! تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ ترک اپنے دوستوں کو پناہ دینے سے انکار کرنے کے عادی نہیں اور نہ وہ دشمنوں کے ساتھ برسرِ پیکار ہونے سے گریز کرتے ہیں، وہ جھوٹ اور دھوکے کے بالکل عادی نہیں۔ ہم میں اور تجھ میں بہ زمین آسمان کا فرق موجود ہے کہ تو خانہ بدوش نسل سے تعلق رکھتا ہے اور ہم حکمراں خاندان سے۔ ہم تجھے وہ سبق دیں گے کہ رہتی دنیا تک قومیں یاد رکھیں گی!"

جب یہ کارروائی ہو رہی تھی حسن تاباں کو اپنے بیکار ہونے کا احساس بری طرح ستا رہا تھا۔ وہ بایزید کے روبرو کوئی ایسا کارنامہ پیش کرنے والا تھا جو اس کے ساتھی فیضی کے امکان اور حوصلے سے بالا ہو۔ اس کا خیال تھا کہ بایزید کے سامنے چند ایسی باتیں ضرور کی جا سکتی ہیں، جن سے وہ جرأتِ گفتار کا بیطل قرار دیا جا سکے۔ وہ ہیرو بننے کی فکر میں تھا۔

یکایک بایزید کی آواز گونجی۔ وہ تیموری وفد کو حقارت سے مخاطب کر رہا تھا۔ "او تیموری خرافات کے نامہ بردار! تم کوئی زبانی پیغام تو نہیں لائے ہو؟"

فیضی نے جواب دیا۔ "ہم اپنے آقا کے ترجمان نہیں، محض نامہ بر ہیں!"

بایزید نے کہا۔ "تم اپنے آقا سے کہنا کہ اگر وہ پسند کرے تو ہم اسے اپنا بھائی تو نہیں، بیٹا بنا سکتے ہیں اور اس کے بیٹا بن جانے کے بعد وہ ہماری شفقتوں کا مستحق قرار پائے گا اور اس کی لغزشوں اور گستاخیوں سے درگزر کیا جائے گا۔"

حسن تاباں نے غیر معمولی دلیری کا ثبوت دیا، بولا۔ "میں اپنے آقا امیر تیمور کو اس پر آمادہ کر لوں گا کہ وہ ترک فاتح کی فرزندی میں آ جائے لیکن اس سے پہلے میں ترک فاتح سے یہ کہوں گا کہ وہ خود بھی میری فرزندی میں آنے کا گرانقدر اعزاز حاصل کر لے کیونکہ میں بلانوشی کے صلے میں اپنے آقا تیمور سے بیطل (ہیرو) کا غیر معمولی خطاب حاصل کر چکا ہوں اور یہ ایک مسلّم امر ہے کہ ترک فاتح بلانوشی میں میرا مقابلہ نہیں کر سکتا!"

اسی لمحے کسی ترک امیر کا ہاتھ بلند ہوا اور حسن تاباں کے داہنے رخسار پر چپک گیا۔ امیر کی مشتعل آواز گونجی۔ "ہمارے بادشاہ کی ہمارے روبرو توہین! واللہ اگر اس جگہ تیمور سے بھی یہی گستاخی سرزد ہوتی تو اسے بھی یہی سزا دی جاتی!"

حسن تاباں نے جواب دیا۔ "میرا آقا تیمور اتنا پُررعب انسان ہے کہ تیری تو اس کے سامنے آنکھ تک نہ اُٹھ سکے گی!"

بایزید نے گرج کر حکم دیا۔ "تم سب دفعان ہو جاؤ یہاں سے۔ ورنہ ہم تمہیں دھکے دے کر نکلوا دیں گے!"

فیضی، حسن تاباں کو لے کر دربار سے چلا آیا اور اس نے حسن تاباں کے جواب کی بڑی داد دی، اس نے حسن تاباں کو یقین دلایا کہ جب یہ گفتگو امیر تیمور کے روبرو دہرائی جائے گی تو ہو سکتا ہے امیر تمہیں جرأتِ گفتار کا صلہ بیطل کے مزید خطاب سے نواز کر نہ ادا کرے۔"

لیکن جب تیمور کو ان واقعات کا علم ہوا تو اس نے حسن تاباں اور فیضی سے بس ایک ہی سوال کیا۔

"کیا بادشاہ کچھ مرعوب نہیں ہوا تھا۔ کیا وہ بہت جلد مشتعل ہو جاتا ہے؟"

اس طرح وہ یلدرم کی ذرا ذرا سی بات معلوم کرنا چاہتا تھا۔ تیمور نے حسن تاباں سے بلا کر کہا۔ "تمہیں اپنی جرأت کا غیر معمولی صلہ بھی ملے گا۔ تم انگورہ واپس جاؤ اور کسی بھی طرح اپنی مفوضہ خدمات انجام دو!"

حسن تاباں نے اندرونی پریشانی چھپانے کی کوشش کی، بولا۔ "ترک بادشاہ اس ناچیز کو اچھی طرح پہچان چکا ہے۔ یہ ناچیز آخر اس کی فوج میں کس طرح بددلی پھیلا سکے گا؟!"

تیمور نے غرا کر حکم دیا۔ "یہ تیرا کام ہے، تیری ذمہ داری ہے کہ تو وہاں کس طرح پہنچے لیکن ہم اپنا حکم واپس نہیں لیا کرتے!"

حسن تاباں نے الحاقی کے تصور میں حماقت کی، بولا۔ "کیا اس ناچیز نے ترک بادشاہ کی اہانت نہیں کی؟ کیا امیر کے غلام نے بایزید کو منہ توڑ، دنداں شکن جواب نہیں دیا؟"

تیمور کا درجۂ حرارت بڑھنے لگا۔ پھر بھی تحمل سے کہا۔ "وہ تیرا فرض تھا، ایک حاضر جواب، وفادار اور نمک حلال غلام کا فرض!"

حسن تاباں نے سادگی سے عرض کیا۔ "اگر غلام کے دل میں امیر کا خوف اور الحاق کی محبت یکجا ہو جائیں تو اس ناچیز سے اسی نوع کے کارنامے سرزد ہو سکتے ہیں!"

تیمور نے آواز دی۔ "ارے کوئی ہے، دفعان کرو اس احمق کو۔ یہ تو ضرورت سے زیادہ بے وقوف نکلا۔ اس کی آواز ہے یا شیطان کا غلغلہ؟"

ایک خدمت گار تیزی سے اندر داخل ہوا اور حسن تاباں کو گدی سے پکڑ کر باہر لے جانے لگا۔ تیمور نے اسے حکم دیا۔ "اور ہاں اس بات کا خیال رکھنا کہ یہ احمق گستاخ ہونے کے ساتھ ہی وفادار اور نمک حلال بھی ہے۔ اسے اس کی خدمت کی انجام دہی کے لیے ترک قلمرو کے اس پار دھکیل دیا جائے!"

تیموری حکم کی پوری طرح، نہایت بے دردی اور سفاکی سے تعمیل کر دی گئی اور حسن تاباں سے سب کچھ چھین کر بایزید کی قلمرو میں دھکیل دیا گیا!

O

فیضی کو حسن تاباں کے انجام پر دکھ ہوا۔ تیمور نے فیضی کو بھی ڈانٹا اور کہا۔ "فیضی! تو کتنا بے وقوف انسان ہے کہ ایسے گستاخ کو ہمارے روبرو

لے آیا۔ اس کی حماقت تو دیکھو الجائی کی محبت اور ہمارے خوف کو ایک ہی دل میں جگہ دیے پھرتا ہے' اس نے ایک معمولی کنیز کو ہماری ہمسری کا مرتبہ عطا کر دیا۔"

فیضی نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔ "امیر کا فرمانا بجا ہے لیکن اس غلام نے اس کی وفاداری اور اکھڑپن کے پیش نظر کچھ ذمے داریاں سونپ دی تھیں لیکن بالآخر یہ بھید کھلا کہ نادان کی دوستی میں جی کا زیاں اور عزت آبرو کا نقصان ہی ہوتا ہے!"

تیمور نے پوچھا۔ "ترک فاتح نے کوئی زبانی پیغام بھی دیا تھا؟"

فیضی نے جواب دیا۔ "وہ زبانی پیغام دے تو ضرور رہا تھا لیکن امیر کے غلام میں اُسے دُہرانے کی ہمت نہ تھی' اس لیے اس نے بایزید سے کہہ دیا کہ امیر کے فرمان کا جواب تحریری دیا جائے!"

"ہونہہ!" تیمور پشت پر ہاتھ باندھے اور سر جھکائے ٹہل ٹہل کر کچھ سوچ رہا تھا۔ اسی وقت بیگا بیگی (امیرالامرا) کو بلوا کر بایزید کو جواب لکھوایا گیا۔ تیمور کا جواب اس بار پھر نہایت مختصر اور سادہ تھا۔ اس نے لکھا تھا۔

• میں خدا کا بندہ تیمور' بایزید کو اس کی اصل یاد دلا رہا ہوں' اس کا جدِ اعلا عثمان بھی ایک خانہ بدوش ہی تھا' اِس لیے نسب کی رُو سے بایزید بھی خانہ بدوش ہی ٹھہرتا ہے' میں تمھاری اصل سے خوب واقف ہوں' بایزید کو ایسے ہاتھیوں کے خلاف بڑھنے سے پہلے یہ ضرور سوچ لینا چاہیے کہ یہ ہاتھی اسے کچل دیں گے' بایزید نے جو رویہ اختیار کیا ہے اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ ترک عام طور پر غور کرنے کے عادی نہیں ہوتے! اگر بایزید میرے مشورے پر عمل نہیں کرے گا تو پچھتائے گا! •

تیمور کا نامہ لے کر جب فیضی وفد کے دوسرے ممبران کے ساتھ انگورہ کے قریب پہنچا تو وہاں پریشان حال حسن تاباں سے بھی ملاقات ہو گئی۔ وہ تیمور سے بہت ناراض تھا اور اسے بہت زیادہ بُرا بھلا کہہ رہا تھا۔ فیضی کو حسن تاباں سے ہمدردی تھی' اس نے کہا۔ "حسن تاباں! مجھے تم سے ہمدردی ہے اور تمھارے ساتھ جو کچھ بھی ہوا' میں اس پر نادم ہوں' امیر کو اپنے ایک جری اور وفادار غلام کے ساتھ یہ ظالمانہ سلوک نہیں کرنا چاہیے تھا!"

حسن تاباں کی اکڑفوں وہی تھی' ذرا غرور سے بولا۔ "میں تو امیر کو عقل مند سمجھتا تھا لیکن وہ تو بہت ہی بے وقوف نکلا' میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اتنے بے وقوف شخص پر قسمت اور اقبال مندی اتنی مہربان کیوں ہے؟"

فیضی نے غمزدہ لہجے میں کہا۔ "میں تو یہ طے کر کے ترک قلمرو میں داخل ہوا ہوں کہ اب مجھے واپس نہیں جانا ہے' امیر کے خط کا جواب میں وفد کے دوسرے ممبران کے حوالے کر کے بایزید ہی کے پاس ٹھہر جاؤں گا اور کوشش کروں گا کہ بایزید مجھے اپنی فوج میں ملازم رکھ لے کیونکہ امیر اپنے سپاہیوں کی وہ عزت نہیں کرتا جس کے سپاہی مستحق ٹھہرتے ہیں!"

حسن تاباں کو غداروں کا قید خانہ اور اعضا بریدہ قیدی یاد آ گئے' ڈر کر بولا۔ "میں تو یہ کہوں گا کہ کچھ بھی کرو لیکن غداری مت کرو کیونکہ امیر اپنے غداروں کو بڑی عبرت ناک سزائیں دیتا ہے!"

فیضی نے لاپروائی سے جواب دیا۔ "مجھے امیر کے پاس واپس ہی نہیں جانا' میں تو یہیں کہیں ملازمت کر لوں گا۔ سچ پوچھو تو مجھے یلدرم تیمور سے زیادہ اچھا لگتا ہے کیونکہ وہ تیمور جتنا ظالم نہیں ہے!"

حسن تاباں کو سنی ہوئی بات پر یقین نہ آیا' بولا۔ "یہ تم کہہ رہے ہو' فیضی' جس پر امیر نے کئی مہربانیاں کیں اور الجائی خانم جیسی آسمانی حور انعام میں بخشی' اگر تم یہاں رہ جاؤ گے تو الجائی کا کیا کرو گے؟"

فیضی نے جواب دیا۔ "میں الجائی کو اپنے ساتھ لایا ہوں' میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ الجائی جیسی پری چہرہ کو سمرقند میں چھوڑ آتا۔ جہاں میں رہوں گا وہیں الجائی بھی رہے گی!"

حسن تاباں کے منہ میں پانی بھر آیا' بے چینی سے پوچھا۔ "کہاں ہے الجائی؟"

فیضی نے قافلے کے درمیان میں کھڑے ہوئے ایک اونٹ کے کجاوے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس میں ہے' میں اسے کتنی مشکل سے نکال کر لایا ہوں' یہ کچھ میں ہی جانتا ہوں' اگر امیر کو میرے ارادوں کا ذرا سا بھی علم ہو جاتا تو میرا بھی وہی حشر ہوتا جو دوسرے بہت سے غداروں کا اب تک ہوتا رہا ہے!"

حسن تاباں ذرا خوش ہوا' پوچھا۔ "اب تمھارا کیا ارادہ ہے؟"

فیضی نے جواب دیا۔ "زندہ رہنے کے لیے کچھ تو کرنا ہی ہے' پہلے تو وفد کے ساتھ یلدرم کے پاس جاؤں گا اور اسے امیر کا خط پہنچاؤں گا' پھر وہیں میں یہ سنسنی خیز اعلان کروں گا کہ میں امیر تیمور کے مظالم کے پیش نظر اس کے پاس واپس نہیں جانا چاہتا اور ترک فاتح کی خدمات انجام دینا چاہتا ہوں' اس اعلان کے صلے میں اگر یلدرم نے مجھے ملازم رکھ لیا تو ٹھیک ہے ورنہ کچھ اور سوچوں گا!"

حسن تاباں نے تشویش سے پوچھا۔ "اور مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

فیضی نے جواب دیا۔ "تم بھی تو امیر کے ظلم کے شکار رہ چکے ہو' جو میں کر رہا ہوں' وہی تم بھی کرو!"

حسن تاباں کے تصور میں وہ غدار گھوم گیا جس کے بیسیوں ناخن موچنے کی مدد سے بے دردی کے ساتھ نوچ کر علیحدہ کر دیے گئے تھے' اس نے جھرجھری لیتے ہوئے پوچھا۔ "اگر امیر تیمور اور یلدرم میں مقابلہ ہو گیا اور اس میں امیر نے یلدرم کو شکست دے دی تو ہم کہاں جائیں گے؟ ہمارا کیا حشر ہو گا؟"

فیضی نے ناگواری سے ناک بھوں چڑھا کر جواب دیا۔ "کیا تم امیر کی فتح پر یقین رکھتے ہو؟ میں سچ کہتا ہوں کہ جب سے میں نے بایزید کو دیکھا ہے اس کا قائل ہو گیا ہوں کہ اسے یلدرم (برقِ خاطف) غلط نہیں کہا گیا یہ خدا کے قہر کا تیر ہے جو تیمور پر چلایا جانے والا ہے!"

حسن تاباں نے افسردگی سے کہا۔ "اگر تم کہتے ہو تو میں بھی تمھارے نقشِ قدم پر چلنے کو تیار ہوں لیکن میں پھر یہی کہوں گا کہ ہمیں نہایت سوچ سمجھ کر قدم اُٹھانا چاہیے' ایسا قدم جو بعد میں ہمیں شرمندہ نہ کرے!"

فیضی نے جواب دیا۔ "تم ذرا منہ پھٹ اور صاف گو انسان ہو اور اسی خوبی نے تمھیں ذلیل و خوار اور بے گھر ویسے دیار کیا ہے' اب کوشش یہ کرنا کہ تمھیں تمھاری زبان کی وجہ سے یلدرم کا عتاب نہ سہنا پڑے!"

"میں وعدہ کرتا ہوں!" حسن تاباں نے کہا۔ "لیکن دوست! ذرا الجائی سے ملاقات تو کراؤ!"

فیضی نے بُرا مانتے ہوئے جواب دیا۔ "میں تمھیں الجائی سے ملا تو ضرور دوں گا لیکن تم سے ذرا ڈر ہی لگتا ہے' ہم دونوں اِس وقت دیارِ غیر میں ہیں' کہیں ایسا تو نہیں کہ تم مجھے یہاں مجبور کر دو کسی بات پر؟"

حسن تاباں نے جواب دیا۔ "نہیں' ایسا کیونکر ہو سکتا ہے؟ تم مطمئن رہو!"

فیضی نے کہا۔ "اس پردیس میں ہم سب ایک ساتھ ہی تو رہیں گے تم فکر نہ کرو' الجائی بھی ہمارے ساتھ ہی ہو گی' تم اس سے جی بھر کے باتیں کیا کرنا!"

حسن تاباں کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی' اسے یقین نہ آتا تھا کہ یہ سب کچھ واقعتہً ہو رہا ہے!

❁

وہ منظر بھی بڑا دردناک اور عجیب تھا کہ بایزید یلدرم کی خدمت میں امیر تیمور کا خط پیش کر کے' وفد کے چند ارکان زار و قطار رونے لگے اور سُلطان سے حفظ و اماں کے طالب ہوئے' انھوں نے امیر تیمور کے مظالم کا رونا روتے ہوئے عرض کیا کہ "چونکہ ترک فاتح ایک با اُصول حکمراں ہے اور وہ پناہ میں لیے ہوئے لوگوں کی مردانہ وار ذمے داری قبول کرتا ہے اس لیے ان مظلوموں کا ساتھ بھی دیا جائے!"

بایزید نے پوچھا۔ "تمھیں کس طرح ستایا گیا ہے؟"

فیضی نے جواب دیا۔ "امیر کو معلوم نہیں کس بات پر یہ شبہ ہو چکا ہے کہ ہم لوگ غدار ہیں اور ترک فاتح سے مل گئے ہیں' وہ اپنے غداروں کو بڑی عبرتناک سزائیں دیتا ہے!" پھر تیمور کے ظلم کی داستان سُناتا ہوا بولا۔ "وہ اپنے معتوب' مفرور اور غدار افراد کے ناخن گوشت سے جُدا کرا دیتا ہے!"

بایزید نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن اس سے پہلے ہی وفد کا ایک جراَت مند رکن بولا۔ "فیضی! تم نے یہاں جو غداروں کی روش اختیار کی ہے اس کا نتیجہ بہت خراب نکلے گا' بے وقوف انسان کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ ترک فاتح موم کی ناک ہے کہ تو جدھر چاہے گا اسے موڑ لے گا؟ ترک فاتح تجھے روک لینے یا پناہ دینے کی خطرناک اور سنگین غلطی کا ارتکاب ہرگز نہیں کر سکتا۔"

فیضی سے پہلے یلدرم نے جواب دیا۔ "ترکی مظلوموں کی پناہ گاہ ہے تیموری مظلوم جب بھی چاہیں ہماری قلمرو میں داخل ہو کر ہم سے امداد و اعانت طلب کریں' ہم ان مظلوموں کی مدد کریں گے' انھیں پناہ دی جائے گی اور ہم یہ کوشش کریں گے کہ خط و کتابت میں مزید وقت نہ برباد کیا جائے!"

بایزید نے جواب میں پہلے تو اپنی فتح مندی کی طولانی فہرست درج کرائی' اس کے بعد لکھوایا۔

• تیموری کُتّے! ہم اسلام کے محافظ ہیں اور یورپ کی ساری طاقتیں بھی ہمارا کچھ نہ بگاڑ سکیں' ہم ایک مدت سے تم سے جنگ کرنے کا ارادہ کر رہے تھے' خُدا کا شکر ہے کہ وہ دن آ چکا ہے' اگر تم انگورہ نہ پہنچے تو ہم خود سمرقند آ جائیں گے اور یہ دیکھیں گے کہ کون فاتح بنتا ہے اور کس کے نصیب میں شکست لکھی جاتی ہے! •

تیموری وفد یہ جواب لے کر واپس چلا گیا اور بایزید نے ازراہِ ہمدردی فیضی اور اس کے ساتھیوں کو حلقۂ ملازمین میں داخل کر لیا' فیضی نے بایزید کو بتایا کہ تیمور کی فوج کے بہت سارے لوگ اس کی سخت گیری کے شاکی ہیں اور وہ کسی وقت بھی ادھر سے ٹوٹ کر بایزید کی فوج میں شامل ہو سکتے ہیں اور فیضی بھرپور کوشش بھی کرے گا کہ امیر تیمور کے باغی سپاہیوں کو توڑ لیا جائے۔

حسن تاباں کہنے کو تو بایزید کی فوج میں داخل ہو گیا تھا لیکن جب

"پبلک لائبریری!" ٹیلیفون آپریٹر نے جواب دیا' لیکن دوسری جانب سے کوئی جواب نہ ملا۔ ذرا دیر بعد پھر گھنٹی بجی اور آپریٹر نے پھر شائستگی سے کہا "پبلک لائبریری!" جواب ندارد تھا۔ آپریٹر تنگ آ گیا۔ گھنٹی پھر بجی۔ ٹیلی فون آپریٹر نے پھر کہا "پبلک لائبریری"

دوسری طرف سے کسی عورت نے پوچھا "کیا یہ واقعی پبلک لائبریری ہے؟"

آپریٹر نے جواب دیا "جی ہاں محترمہ! آپ کس سے بات کرنا چاہتی ہیں؟"

دوسری طرف سے جواب ملا "شکریہ جناب! ٹیلی فون کا یہ نمبر مجھے اپنے شوہر کی جیب سے ملا تھا"

کبھی اسے تیمور کے باغیوں کا حشر یاد آتا وہ بہت پریشان ہو جاتا۔ وہ فیضی سے بار بار یہی پوچھتا کہ کیا اسے اس بات کا یقین ہے کہ بایزید امیر تیمور کو شکست دے دے گا۔ فیضی ہمیشہ یہی جواب دیتا کہ "ترک فاتح بھی تیمور سے کسی طرح کم نہیں، امیر تیمور کی فتح مندیوں اور کامرانیوں کا بھرم یہ شاید کھل کر رہے گا!"

الجاقی کا قرب میسر آچکا تھا۔ حسن تاباں کی وحشت کے لیے الجاقی کا قرب بہترین علاج تھا۔ دونوں ایک ہی مکان میں رہتے تھے اب وہ الجاقی کو بہت قریب سے دیکھ سکتا تھا۔ پھر ایسا ہوا کہ فیضی بہت زیادہ مصروف رہنے لگا۔ وہ بایزید کے ساتھ اہم فرائض کی انجام دہی میں مصروف تھا۔ اس نے ہزاروں تاتاریوں کو خفیہ خطوط لکھ لکھ کر انگورے بلوا لیا اور انھیں بایزید کی فوج میں شامل کرا دیا۔ فیضی کی عدم موجودگی میں الجاقی سے خوب گھٹتی۔ وہ الجاقی کا دل ٹٹول رہا تھا کہ وہ بھی اس سے کچھ لگاؤ رکھتی ہے یا نہیں الجاقی بہت چالاک نکلی، وہ اسے باتوں میں اڑا دیتی۔

شام کے دھندلکے گہرے ہو گئے۔ اس نے مکان کے دروازے سے مویشیوں کو اپنے گھروں کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ سامنے کی کچی سڑک پر گرد اڑاتے ہوئے گھڑ سوار اور مویشی بے ترتیب قطاروں میں گزر رہے تھے حسن تاباں کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اس نے حدِ نظر تک نظریں دوڑائیں اور فیضی کو تلاش کیا۔ اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اندر فیضی اور الجاقی خانم کا کمرہ الگ تھا اور حسن تاباں کا الگ، جب فیضی چلا جاتا تو الجاقی دونوں کمروں کے درمیان کا دروازہ مقفل کر دیتی۔ حسن تاباں کو یہ طریقہ ناگوار گزرتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ مغائرت کی روش دور کر دی جائے لیکن کس سے کہہ کر یہ روش ختم کی جائے، الجاقی سے یا فیضی سے یہ ایک دوراہا تھا جس پر حسن تاباں مذبذب کھڑا تھا۔

حسن تاباں نے دوسرے کمرے میں جھانک کر دیکھا، الجاقی چراغ جلا رہی تھی۔ اس نے کئی بار ہاتھ اٹھا کر دروازہ تھپتھپانے کی نیت کی لیکن کچھ سوچ کر رک جاتا۔ جب اندھیرا زیادہ پھیل گیا تو اس نے بے اختیار دروازہ تھپتھپا دیا۔ دوسری طرف سے الجاقی کی مترنم آواز سنائی دی۔ "کیا ہے؟"

حسن تاباں نے جواب دیا۔ "میری طرف اندھیرا ہے کیا کوئی شمع مل جائے گی؟"

تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور الجاقی نے ایک شمع حسن تاباں کی طرف بڑھا دی۔

حسن تاباں شمع لے کر دروازے کے بیچوں بیچ کھڑا ہو گیا۔ اب دروازہ بند نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کا خیال تھا الجاقی گھبرا جائے گی لیکن وہ ذرا بھی نہ گھبرائی۔ حسن تاباں نے اسے آغوش میں لینے کی کوشش کی تو وہ سمٹ کر ایک طرف ہو رہی اور ناگوار لہجے میں کہا۔ "واللہ! یہ صریحاً بدتمیزی ہے حسن تاباں ہوش میں آؤ تم یہ کیا کر رہے ہو؟"

حسن تاباں ایک ہی سرپھرا تھا، اس کے لیے کسی بات کا ارادہ کر لینا ہی کافی تھا۔ پھر وہ پیچھے کہاں ہٹتا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر الجاقی کو اپنی گرفت میں لے لیا اور عالمِ سرمستی میں بولا۔ "میں تیری ایک ہم آغوشی اور چند بوسوں کی خاطر اپنی زندگی قربان کر سکتا ہوں!"

الجاقی نے اپنے چہرے کے قریب آتے ہوئے منہ کو ہتھیلی سے پیچھے ہٹانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ حسن تاباں وحشی بن کر پیار کرتا رہا۔ دفعتاً الجاقی کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور اس نے خود کو حالات کے حوالے کر دیا۔ بولی۔ "دیکھو، جو کچھ چاہتے ہو اسے پورے ہوش و حواس سے حاصل کرو۔ کیا تم نے باہری دروازہ بند کر دیا ہے، پہلے اسے بند کر آؤ کیونکہ آج فیضی جلدی آنے والا تھا!"

حسن تاباں کے لیے الجاقی کی آمادگی ایک غیر متوقع خوشی تھی، اسے کچھ کچھ تو یہ شبہ ضرور تھا کہ الجاقی اسے پسند کرتی ہے اور یہی بات وہ جاننا بھی چاہتا تھا۔ الجاقی کی رضامندی کی خوشی میں وہ فوراً باہری دروازہ بند کرنے چلا گیا۔ اس نے ایک بار پھر دروازے کے باہر اندھیرے میں فیضی کو دیکھنے کی کوشش کی لیکن دھندلی دھندلی فضا میں دور دور تک اس کا پتہ نہ تھا۔ اس نے اندر سے دروازہ بند کیا اور جب دوبارہ الجاقی سے ملنا چاہا تو پتہ چلا کہ دروازہ دوسری طرف سے مقفل ہو چکا ہے۔ حسن تاباں کی خفت اور ندامت عروج پر پہنچ گئی۔ اس کے جی میں آیا کہ اسی وقت دروازہ توڑ کر دوسری طرف چلا جائے اور الجاقی کو اس کی دھوکا دہی کا وہ مزہ چکھائے کہ وہ زندگی بھر یاد رکھے، اس نے دروازے پر زور زور سے ٹکّے مارے لیکن اس کا کوئی اثر نہ ہوا بلکہ دوسری طرف سے الجاقی کی بھنچی بھنچی ہنسی کی آواز آتی رہی۔ حسن تاباں نے غصے میں کہا۔ "الجاقی! تو نے مجھے دھوکا دے کر اچھا نہیں کیا۔ میں اپنی حماقت اور تیری چالاکی کا تجھ سے خوفناک بدلہ لوں گا!"

الجاقی نے جواب دیا۔ "چالاکی کی ابتدا تو تمھاری طرف سے ہوئی تھی کہ شمع مانگنے کے بہانے دروازہ کھلوا لیا تھا۔ میں نے تو تمھاری چالاکی کا اپنی چالاکی سے محض جواب دیا ہے، احمق نوجوان! عورت کا دل دشمن کا قلعہ تو نہیں کہ جسے تو طاقت سے زیر کر لے، اسے تو محبت اور خلوص ہی سے جیتا جا سکتا ہے لیکن تو نے اسے جبر اور زبردستی سے جیتنا چاہا جسے میں نے ناکام بنا دیا۔"

حسن تاباں سے جو حماقت سرزد ہو گئی تھی، اس کی تلافی کی تدبیر سمجھ میں نہ آتی تھی، اسے خوب اچھی طرح معلوم تھا کہ فیضی نے بایزید کے مزاج میں کافی اثر و رسوخ حاصل کر لیا ہے اور اسے جیسے ہی یہ معلوم ہوگا کہ حسن تاباں نے الجاقی کے ساتھ ایسی ناگفتہ بہ اور شرمناک حرکت کی ہے، خدا معلوم کیا قدم اٹھا بیٹھے، مشکل تو یہ تھی کہ اب وہ سمرقند بھی نہیں واپس جا سکتا تھا کیونکہ امیر تیمور اسے ترک قلمرو میں جلاوطن کر چکا تھا اور وہ بایزید کی سپاہ میں داخل ہو کر

غداری کا مرتکب ہو چکا تھا۔ اسے خوب اچھی طرح معلوم تھا کہ فیضی جیسے ہی گھر میں داخل ہوگا اور الجائی سے اس واقعے کا علم ہوگا تو اس کی طرف سے حسن تاباں کے خلاف دو ہی قدم اُٹھ سکتے تھے۔ ایک تو یہ کہ غصے اور جوشِ انتقام میں فیضی خود ہی اس کے مقابلے پر آ جاتے اور اسے ہلاک کرنے کی کوشش کرتے اور اگر اس نے یہ قدم نہ اُٹھایا اور ذرا تحمل اور صبر سے کام لیا تو دوسرا قدم یہ ہوگا کہ واقعے کی اطلاع بایزید کو کر دے اور اس سے دادرسی چاہے اور بایزید یقیناً اسے ایسی سخت سزا دے گا کہ شاید وہ زندہ بھی نہ رہے قتل کر دیا جائے۔ اس مہیب اور خطرناک مایوسی میں اسے اپنی بچت کی ایک ہی راہ نظر آئی۔ وہ یہ کہ خود ہی پہل کرے اور فیضی کو دھوکے سے قتل کر کے کسی طرف فرار ہو جائے اور فرار ہونے سے پہلے ایک آخری کوشش کے ذریعے الجائی کو بھی ساتھ لے جانے کی کوشش کرے۔

فیضی کے بجائے ایک ترک فوجی افسر حسن تاباں کو اپنے ساتھ لے گیا اور اس سے طرح طرح کے سوالات کرنے لگا۔ وہ تیمور کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ تیمور کی فوج کیسی ہے؟ خود تیمور کیسا ہے؟ فوجیوں کی اس کے بارے میں کیا رائے ہے؟ فوج کتنی ہے؟ خود اسے تیمور سے کیا کیا شکایات رہی ہیں؟ اور سب سے آخر میں اسے یہ بھی یاد دلایا گیا کہ جب وہ پہلی بار امیر تیمور کا نامہ بایزید کے نام لے کر آیا تھا تو اس نے امیر تیمور کی جانب سے بایزید کے دربار میں نہایت گستاخانہ مکالمے ادا کیے تھے۔ آخر اس وقت وہ اپنے امیر تیمور سے اتنی محبت کیوں کرتا تھا اور اب نفرت کیوں کرنے لگا؟

جواب میں حسن تاباں نے کھرے کھرے اور نفرت آمیز کلمات استعمال کیے۔ اس نے اپنے دل کی گہرائیوں سے کہا: "امیر نے مجھ سے ناانصافی کی ہے۔ وہ اپنے ملازمین سے نہایت غیر منصفانہ توقعات رکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر ملازم کبھی یہ محسوس کرے کہ اس کا آقا (تیمور) اس پر ویسا مہربان نہیں ہے جیسا پہلے ہوا کرتا تھا تو اس ملازم کو یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہیے کہ اس میں تیمور غلطی پر ہے بلکہ اسے بھی اپنی ہی غلطی تصور کرے۔" اس کے بعد حسن تاباں ذرا جوش میں بولا: "ایک ایماندار ملازم کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ غیر منصف مزاج اور ہٹ دھرم آقا کی ملازمت کرے۔"

ترکی افسر نے پوچھا: "سلطان (بایزید) کو تم پر اعتبار نہیں ہے۔ وہ تمھیں اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتے۔ ان کی خواہش ہے کہ تم سیواس چلے جاؤ۔ سیواس میں سلطان کا بیٹا ارطغرل موجود ہے، وہ تمھیں خوش آمدید کہے گا۔"

حسن تاباں نے مایوسی سے پوچھا: "اور میرا ساتھی فیضی کہاں رہے گا؟"

ترکی افسر نے جواب دیا: "وہ یہیں سلطان کے پاس رہے گا!"

حسن تاباں اکھڑ لہجے میں بولا: "واہ جی، یہ کس طرح ممکن ہے کہ میں سیواس چلا جاؤں اور میرا ساتھی یہاں سلطان کے پاس رہے۔ یا میں خود بھی یہیں رہوں گا یا میرے ساتھی فیضی کو بھی میرے ساتھ سیواس ہی بھیج دو۔"

ترکی افسر نے تحکمانہ کہا: "تم یہ بات کس طرح کرتے ہو؟ یہاں سلطان کے احکام چلتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے تیمور سخت گیر ہونے کے ساتھ ساتھ نرم مزاج بھی ہے کہ تم جیسے بدتمیز اور گستاخ لوگ بھی اس کے دربار سے وابستہ ہیں۔"

حسن تاباں مصلحتاً چپ ہو رہا لیکن تھوڑے تحمل اور سکوت کے بعد اتنا ضرور کہہ دیا: "ٹھیک ہے جناب! میں تمھاری قلمرو میں ہوں جیسا حکم دو گے تعمیل کروں گا لیکن سپاہی کو اتنی آزادی ضرور حاصل ہونی چاہیے کہ وہ اپنی رائے اور خواہش کا آزادانہ اظہار کر سکے!"

ترکی افسر شاید جذباتی تھا۔ غصے میں بولا: "تم مشتبہ لوگ سلطان کے پاس کس طرح رہ سکتے ہو؟ جو سپاہی اپنی وفاداری بدل کر دوسرے آقا کے پاس جاتا ہے وہ مشکل ہی اعتماد قائم کر پاتا ہے!"

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ فیضی بھی اسے تلاش کرتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ حسن تاباں اسے دیکھتے ہی بوکھلا گیا اور اسے اپنا منصوبہ یاد آ گیا۔ اسے یقین تھا کہ الجائی نے اسے سب کچھ بتا دیا ہوگا اور اب فیضی کا اس کے ساتھ سلوک معاندانہ اور منتقمانہ ہوگا۔ اس نے پہلو سے پیش قبض نکال کر فیضی پر حملہ کر دیا لیکن ترک افسر اس کی کڑی نگرانی کر رہا تھا اور کسی حد تک اس کے ارادے سے واقف ہو چکا تھا۔ اس نے حسن تاباں کو گرا دیا اور کلائی مروڑ کر پیش قبض چھین لی۔ اس حملے سے فیضی کے پہلو میں ہلکا سا زخم آیا۔ وہ کراہ اُٹھا اور نہایت خلوص سے پوچھا: "آہ میرے دوست حسن تاباں! یہ تجھے ہو کیا گیا ہے؟ تو مجھے کیوں مارنا چاہتا ہے؟" پھر ترک افسر سے کہا: "میرے ترک دوست! اسے چھوڑ دو، یہ میرا دوست ہے۔ اسے ضرور کسی قسم کی غلط فہمی ہو گئی ہے ورنہ اس سے یہ غیر معمولی فعل ہرگز سرزد نہ ہوتا!"

ترک افسر نے افسوس سے جواب دیا: "یہ شخص کچھ احمق نظر آتا ہے۔ اس کی ہر حرکت اور ہر فعل غیر معمولی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس نے اب تک اپنی فوجی خدمات کس طرح انجام دی ہوں گی!"

فیضی نے کہا: "یہ شخص انتہا پسند اور ہر بڑے فوری جذبے پر مٹنے کا وصف رکھتا ہے۔ جو لوگ اسے سمجھ لیں گے، انھیں اس سے کوئی شکایت نہ ہوگی اور اس سے بڑے سے بڑا کام بآسانی لے لیں گے۔" اس کے بعد فیضی نے حسن تاباں سے پوچھا: "تمھیں مجھ سے کوئی شکایت ہے؟"

حسن تاباں، فیضی کے نرم رویے پر حیران بھی تھا اور شرمندہ بھی۔ اس نے رک رک کر پوچھا: "کیا تم گھر سے آ رہے ہو؟"

زخمی فیضی نے جواب دیا: "ہاں میں گھر سے آ رہا ہوں۔ تم یہ سوال کیوں کر رہے ہو؟"

حسن تاباں نے جھجک جھجک کر پوچھا: "تمھیں الجائی نے کچھ بھی نہیں بتایا؟"

"نہیں تو!" فیضی نے کہا: "وہ مجھے کیا بتائے گی؟"

حسن تاباں سمجھ گیا کہ الجائی نے اپنی زبان بند رکھی ہے۔ اس کے دل میں امید کا جو چراغ بجھ چکا تھا۔ الجائی کی خاموشی کے انکشاف نے اسے پھر روشن کر دیا۔ اور اسے یقین سا ہو گیا کہ الجائی اسے چاہتی ضرور ہے لیکن اس محبت کا ایک دم اظہار نہیں کرنا چاہتی۔

ترک افسر نے کہا: "تم لوگ معلوم نہیں کیسی باتیں کر رہے ہو۔ گھر چل کر باتیں کر لینا۔ تم زخمی ہو چکے ہو۔ تمھاری مرہم پٹی ہونی چاہیے!"

تینوں گھر پہنچے۔ الجائی نے دروازہ کھول دیا۔ خود پردے میں چلی گئی اور ترک افسر، فیضی اور حسن تاباں اندر داخل ہو گئے۔ الجائی، فیضی کو زخمی دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ فیضی نے کراہتے ہوئے دونوں سے سرگوشی میں کہا: "خبردار جو اس حادثے کی بابت الجائی کو کچھ معلوم ہوا!"

گھر میں مرہم موجود تھا۔ الجائی نے مرہم اور کپڑا دیا اور دونوں نے بہت سارا مرہم پھاہے پر رکھ کر زخم کو باندھ دیا۔

ترک افسر چلا گیا تو فیضی نے الجائی کو آواز دی۔ الجائی ان دونوں کے پاس آ گئی۔ حسن تاباں آنکھ ملانے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔

اچانک زخمی فیضی کی آواز سنائی دی، وہ کہہ رہا تھا: "حسن تاباں! تم ایک عورت کی خاطر اپنے دوست کو ہلاک کر دینا چاہتے تھے!"

حسن تاباں اس انکشاف سے بہت زیادہ پریشان ہو گیا کہ فیضی سب کچھ جانتا ہے اور تھوڑی دیر پہلے وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ جوانی کا جوش پھر اُبل پڑا اور جی میں آئی کہ فیضی کو مزید بولنے کا موقع نہ دیا جائے۔ یکایک فیضی کی آواز پھر سنائی دی: "میں نہیں چاہتا کہ اپنے دشمنوں پر اپنے اختلافات ظاہر کروں۔ مجھے معلوم ہے کہ تم الجائی سے محبت کرتے ہو۔ میں اگر چاہوں تو الجائی کو تمھارے حوالے کر سکتا ہوں لیکن اس سلسلے میں دو بڑی رکاوٹیں آڑے آتی ہیں۔ ایک یہ کہ الجائی امیر تیمور کا عطیہ ہے۔ اگر میں یہ عطیہ تمھیں عطا کر دوں تو اس میں امیر کی ہتک کا پہلو نکلتا ہے۔ دوسرے یہ کہ میں نے یہ عطیہ بڑی قربانی اور بڑا کارنامہ انجام دے کر حاصل کیا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ تم بھی کوئی غیر معمولی کارنامہ انجام دیتے تو میں اسے قیمت میں شمار کر کے الجائی کو تمھارے حوالے کر دیتا!"

حسن تاباں نے شرمندگی سے جواب دیا: "فیضی! تمھاری قسمت تھی کہ بچ گئے ورنہ میں یہ تہیہ کر چکا تھا کہ تمھیں قتل اور الجائی کو اغوا کر کے یہاں سے چلا جاؤں گا لیکن اب ایسا ناممکن ہو گیا ہے!"

فیضی مسکرانے لگا۔ بولا: "بھائی ایسی جلدی کرنا بھی نہیں چاہیے۔ آؤ ہم دونوں عہد کریں کہ ایسی غلطی آئندہ نہیں سرزد ہوگی۔"

حسن تاباں نے اچٹتی نظروں سے الجائی کی طرف دیکھا۔ وہ ہونٹ دباتے مسکرا رہی تھی۔

کچھ ہی عرصے بعد تیمور کا ایک خط اور آ گیا۔ یہ خط بھی سادگی اور سیاست کا اعلیٰ نمونہ تھا لیکن پچھلے خطوط کے مقابلے میں ذرا طویل ضرور تھا۔ تیمور نے لکھا تھا۔

• خدا کا بندہ تیمور کہتا ہے کہ کیا تمھیں یہ بات معلوم نہیں کہ ایشیا کا بہت بڑا حصہ ہماری تلواروں کے سائے میں ہمارے قانون کا پابند ہے اور ہماری فوجیں ایک سمندر سے دوسرے سمندر تک پھیلی ہوئی ہیں۔ دنیا کے حکمران ہمارے دروازے کے سامنے صف باندھے مؤدب کھڑے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ تیری گستاخی اور حماقت کی بنیاد کیا ہے؟ مجھے اعتراف ہے کہ تو نے مغربی مسیحیوں پر کچھ فتوحات حاصل کر لی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے تیری تلوار کو برکات سے مشرف فرمایا ہے اور کفار کے خلاف جہاد میں تو نے قرآن کے احکام کی پیروی کی ہے اور اب تک اسی وجہ سے ہم تیرے ملک کے خلاف قدم اُٹھانے میں متامل رہے ہیں اور اسے اسلامی دنیا کا مورچہ سمجھتے رہے ہیں۔ بایزید! ہوش و حواس سے کام لو، سوچو اور مخالفت سے باز آ جاؤ اور ہمارے انتقام کی برق خاطف سے بچو جو تمھارے سر پر معلق ہو چکی ہے۔ بایزید! تمھاری حیثیت ایک چیونٹی جیسی ہے۔ آخر چیونٹیاں کسی بڑے منصب کے حق دار کی طرح اپنی حیثیت کو کیوں بھلا رہی ہیں، ہاتھی انھیں کچل دیں گے۔

سنا ہے تم نے میرے آدمیوں کو توڑ کر انھیں ملازم رکھ لیا ہے۔ آخر یہ حرکتیں کیوں کر رہے ہو؟ کیا تم مجھے نہیں پہچانتے؟ اب تک میں تمھاری ریاست کے احترام میں خاموش تھا لیکن اب ایسا کرنا مشکل ہے۔ میرے آدمی تم میرے پاس بھیج دو! •

بایزید نے یہ خط اپنے اُمرا کو بھی پڑھنے کے لیے دیا اور خود جواب دینے کی تیاری کرنے لگا!

اس نے جواب لکھوایا۔

• تیمور! تیرے پاس بے شمار فوج ہے مگر فوج کی زیادتی سے کیا ہوتا ہے۔ راہِ فرار اختیار کرنے والے تاتاریوں کے تیر، میرے ثابت قدم اور ناقابلِ شکست ینی چریوں کے تبر و شمشیر کے سامنے کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ جن لوگوں نے میری پناہ حاصل کر لی ہے، ان کا محافظ میں ہوں۔ وہ میرے خیموں میں بیٹھے ہیں۔ تمھاری حیثیت ایک خراج گزار حکمراں جیسی ہے۔ اگر تم نے خراج کی رقوم نہ روانہ کیں تو میں خود آ کر وصول کر لوں گا۔

میں سمرقند پہنچ رہا ہوں اور وہاں تیری متکبرانہ حیثیت کو زمین میں دفن کر کے تیرے حرم اپنی سپاہ میں تقسیم کرا دوں گا اور تیری چہیتی بیوی کو اپنی کنیز بنا لوں گا! •

بایزید کا خط جب درباریوں کو بآوازِ بلند پڑھ کر سنایا گیا تو

وہ بہت خوش ہوتے لیکن فیضی پر اس کا برا اثر ہوا، ان دبے لفظوں میں سلطان سے کہا۔ "جناب والا! اگر میں اس خط کی تعریف کروں گا تو یہ میری منافقت ہوگی اور اگر اعتراض کروں گا تو گستاخی شمار کی جائے گی اس لیے بہتر یہی ہے کہ میری رائے نہ لی جائے!"

بایزید نے کہا۔ "تم منافقت سے بچو اور جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کہہ دو!"

فیضی نے نہایت افسوس سے کہا۔ "خط کا مضمون متکبرانہ اور پُر از اہانت ہے چونکہ تیمور میرا آقا رہ چکا ہے اس لیے مجھے اس سے تکلیف پہنچی!"

بایزید ہنس دیا کہا۔ "وہ اسی قسم کے خطوط کا مستحق ہے ہم نے تو پھر بھی ذرا رعایت اور احترام سے کام لیا ہے ورنہ تیمور اس سے زیادہ اہانت کا مستحق ہے!"

حسن تاباں کس طرح خاموش رہتا فوراً عرض کیا۔ "سرِ دست ہماری وفاداریاں سلطان کے ساتھ ہیں اس لیے سلطان جو قدم بھی اٹھائیں گے اسے ہم سب کی تائید ہونی چاہیے! لیکن ..." وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

بایزید نے ڈانٹا۔ "جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کہو ہمیں منہ میں چاول ڈال کر اور آہستہ آہستہ جگالی کر کے باتیں کرنا بالکل پسند نہیں!"

حسن تاباں نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔ "جناب والا! میں کوئی بڑا کارنامہ انجام دینے کی فکر میں ہوں تاکہ بڑا آدمی کہلایا جاؤں اور انعام میں حسین ترین خواتین حاصل کروں!"

بایزید نے خشمناک لہجے میں کہا۔ "ارے اس گستاخ کا منہ بند کرو، اس کے منہ میں جو آتا ہے بک دیتا ہے اگر ہم نے اسے پناہ نہ دی ہوتی تو اسے قتل کرا دیتے!"

حسن تاباں کو بس ایک ہی بات نکتے کی معلوم تھی کہ جرأت حوصلہ بے باکی اور حاضر جوابی آدمی کی وہ خصوصیات ہیں جو اسے بڑا اور ہر دل عزیز بناتی ہیں اور بادشاہ ان کی قدر کرتے ہیں، چنانچہ اس نے بے باکی اور حاضر جوابی کا مظاہرہ کیا کہنے لگا۔ "جہاں جایئے برہنہ تلوار سر پر لٹکی ملتی ہے تلواریں دشمنوں کے لیے ہوتی ہیں یا اپنوں کے لیے؟"

یلدرم نے غصے میں کہا۔ "یہ یہاں کیوں ہے؟ اسے تو ہم نے سیواس بھیجا یا تھا۔ یہ یہاں کیوں نظر آرہا ہے، اسے فوراً سیواس روانہ کرو!" پھر حسن تاباں سے کہا۔ "تو کارنامے انجام دے اور زبان بند رکھ ورنہ بڑے نقصان اٹھائے گا!"

حسن تاباں نے جواب دیا۔ "سلطان کا حکم سر آنکھوں پر، یہ ناچیز خود ہی سیواس چلا جائے گا بس ذرا تعارف نامہ دے دیا جائے بقیہ کام یہ ناچیز خود ہی انجام دے لے گا!"

یلدرم نے اس کی تائید کی اور کہا۔ "ہم صرف ایک بات جانتے ہیں، وہ یہ کہ آدمی اگر چاہے تو بڑے سے بڑا کارنامہ انجام دے سکتا ہے، تیمور کسی دن اور کہیں بھی حملہ آور ہو سکتا ہے اس وقت کے لیے ہم تم سب یہی کہیں گے کہ جنگ بے مروتی سے لڑی جائے اور ذہن سے سابق رشتے نکال دیے جائیں۔"

وہاں سے اٹھ کر فیضی اور حسن تاباں کچھ اداس اداس ہو گئے، حسن تاباں نے کہا۔ "میں ایک تعارفی چٹھی لے کر سیواس چلا جاؤں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ بلاوجہ تاخیر ہوتی رہے اور میں سلطان کی نظر میں خوار ہوتا رہوں!"

فیضی نے کہا۔ "اچھا خدا حافظ مگر ایک بات میری یاد رکھو، وہ یہ کہ وفاداریاں اتنی جلدی جلدی مت فروخت کیا کرو، اس سے آدمی کی قدر و قیمت گر جاتی ہے، یہ زندگی کوئی معمولی چیز تو نہیں جس طرح زندگی غیر معمولی شے ہے اسی طرح ایک سپاہی کو کارنامہ بھی غیر معمولی ہی انجام دینا چاہیے!"

حسن تاباں نصیحتوں کی بھرمار سے عاجز آگیا۔ بولا۔ "میں تو ایک ہی بات جانتا ہوں، میں عنقریب کوئی کارنامہ انجام دے کر تمھارے پاس چلا آؤں گا اور تم سے اپنی الجائی مانگ لوں گا!"

فیضی نے ناگواری سے کہا۔ "تم بڑے بھونڈے انداز میں بات کرتے ہو!"

حسن تاباں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "بھونڈے لہجے میں نہیں کھرے اور صاف صاف انداز میں بات کرتا ہوں کیونکہ بے باکی اور صاف گوئی وہ وصف ہیں جو کسی بڑے آدمی ہی میں پائے جاتے ہیں کسی معمولی آدمی کے پاس یہ اوصاف تو پھٹکتے بھی نہیں!"

رخصت ہونے سے پہلے رشیدہ الجائی کے پاس چلا گیا اور کہنے لگا "بس جانِ من! چند دن اور صبر کرو، سیواس پہنچتے ہی کوئی ایسا کارنامہ انجام دوں گا کہ اس کے صلے میں فیضی تمھیں فوراً میرے پاس روانہ کر دے گا تم گھبرانا مت!"

حسن تاباں سیواس چلا گیا اور فیضی اس جاہل اور بے ادب کی بے باکیوں کا ماتم کرنے لگا۔

تیمور، بایزید کا خط پڑھ کر غضب ناک ہو گیا۔ اس نے ایک دو سطری خط یلدرم کو لکھا۔

• اگر بایزید چاہے تو ہمارے مفرور اور معتوب افراد کو ہمارے حوالے کر کے جنگ کی زحمت سے بچ سکتا ہے! •

بایزید نے جواب دیا۔ "میں جنگ کے لیے تیار ہوں!"

تیمور نے تیزی سے جنگی تیاریاں مکمل کیں، اور شمال کے بجائے

جنوب میں روانہ ہو گیا، اس نے شام، عراق اور مصر پر فوج کشی کی، اور انھیں اپنے قدموں میں گرا لیا۔ اس نے دمشق کو تباہ کر کے آگ لگا دی اور پھر بغداد پر حملہ آور ہوا۔ بغداد کو تباہ و برباد کر دیا گیا، پہلے بغداد دارالسلام کہلاتا تھا لیکن اس دن اسے دارِ جہنم کہا گیا۔ بغداد کا حکمران سلطان احمد فراج کشتی میں بیٹھ کر فرار ہونے لگا، مگر تیموری سپاہ نے اسے تیروں کی زد میں لیا اور اس کی لاش دریا کے کنارے کھینچ لائے، بغداد میں قتل عام کا بازار گرم ہوا اور تقریباً نوے ہزار آدمیوں کے سروں سے ایک سو بیس کلہ مینار (سروں کے مینار) تعمیر کیے گئے یہ تیموریوں کی فتح کے یادگاری نشان تھے۔

بایزید نے اسے جو شرمناک اور دھمکی آمیز جواب دیا تھا، یہ اس مہم کا آغاز تھا۔ تیمور کی حکمت عملی یہ تھی کہ پہلے بایزید کے حمایتیوں کو ختم کیا جائے اس کے بعد ترک فاتح پر فیصلہ کن ضرب لگائی جائے، ان چھوٹی بڑی قوتوں کو ختم کیے بغیر ترک فاتح سے لڑنے کا یہ مطلب تھا کہ بغلی گھونسوں کو شرارت کرنے کا موقع دیا جائے۔ تیمور شام، بغداد اور مصر کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد سمرقند واپس آیا، اور انگورے پر حملہ آور ہونے کی تیاری کرنے لگا۔

تیمور تبریز ہوتا ہوا بایزید کے سرحدی شہر سیواس پہنچ گیا۔ سیواس کا قلعہ بایزید کے بیٹے ارطغرل کے ماتحت تھا۔ یہیں حسن تاباں بھی تھا۔ اس نے تیموری سپاہ کو محاصرہ کرتے جو دیکھا تو بہت پریشان ہو گیا، اسے یقین تھا کہ سیواس کے لوگ اس قلعے کو نہیں بچا سکیں گے، اس نے اسی دوران ایک بڑے خیمے پر سفید جھنڈا لہراتے دیکھا۔ بایزید کا بیٹا ارطغرل یہ سمجھا کہ تیمور جنگ کے بجائے صلح کرنا چاہتا ہے اس نے حسن تاباں سے کہا "کیا تم ہمارے آدمیوں کے وفد کے ساتھ اپنے سابق امیر تیمور کے پاس صلح و مفاہمت کی بات چیت کرنے جا سکتے ہو؟"

حسن تاباں نے حیرت سے پوچھا۔ "آپ کو یہ کس طرح معلوم ہوا کہ تیمور صلح کا خواہش مند ہے؟"

شہزادے نے تیمور کے خیمے پر لہراتے ہوئے سفید جھنڈے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس نے اپنے خیمے پر صلح کا سفید پرچم لہرا رکھا ہے!"

حسن تاباں نے جواب دیا۔ "شہزادے! آپ کو غلط فہمی ہوتی ہے تیمور صلح کیوں کرے گا، اس کے پاس بہت بڑی خونخوار فوج ہے، اس جھنڈے کا مطلب ہے کہ اگر شہری باشندے چاہیں تو تیمور کی اطاعت کے نام پر تباہی سے بچ سکتے ہیں، آپ دیکھ لیجیے گا کل سفید کی جگہ سرخ پرچم لہرا دیا جائے گا اور پرسوں سرخ کی جگہ سیاہ جھنڈا لہرا رہا ہوگا!"

شہزادے نے پوچھا۔ "سرخ اور سیاہ پرچموں کا کیا مطلب ہوگا؟"

حسن تاباں نے جواب دیا۔ "سرخ کا یہ مطلب ہوگا کہ اگر شہری اب بھی اطاعت اختیار کر لیں تو انھیں معاف کر دیا جائے گا لیکن ان کے سرداروں کو تہ تیغ کر دیا جائے گا اور تیسرے دن سیاہ پرچم کے لہرائے جانے کا یہ مطلب ہوگا کہ اب پورے شہر کو تیمور سے کفن دفن کے علاوہ کسی اچھے سلوک کی توقع رکھنی فضول بات ہے!"

شہزادے نے کہا۔ "ہمارے پاس چار ہزار سپاہی ہیں، ہمیں جنگ لڑنی چاہیے یا اطاعت اختیار کر لیں؟"

حسن تاباں نے جواب دیا۔ "جنگ جتنا مشکل ہی نہیں ناممکن سی بات ہے صلح سے جان بچائی جا سکتی ہے لیکن افسوس کہ میں تیمور کے پاس نہیں جانا چاہتا!"

شہزادے نے پوچھا۔ "کیوں؟ کس لیے؟"

حسن تاباں نے جواب دیا۔ "میرے امیر تیمور سے سخت اختلافات ہیں!"

شہزادے نے عجیب نظروں سے حسن تاباں کو دیکھا اور نفرت سے کہا۔ "تمھارے امیر تیمور سے سخت اختلافات ہیں! کیا مطلب؟ تمھارا امیر تیمور سے کیا مقابلہ! تم اس کے ایک ادنا ملازم رہ چکے ہو لیکن بات اس طرح کر رہے ہو گویا امیر تیمور اور تم مساوی سطح کے انسان ہو!"

حسن تاباں نے منہ بنا کر جواب دیا۔ "کبھی میں بھی یوزباشی ہوا کرتا تھا میرے ماتحت سو آدمی ہوتے تھے، میں نے بھی حکومت کی ہے میں نے بھی حکم چلایا ہے، حکومت ایک سو پر کی جائے یا ایک لاکھ پر بات تو ایک ہی ہوتی!"

شہزادے نے اس صاف گو شخص کے دماغ میں کچھ خلل سا محسوس کیا، آہستہ سے بولا۔ "کچھ بھی ہو میں جنگ کروں گا۔ ہتھیار ڈال دینا اور وہ بھی بغیر جنگ کیے شرمناک بات ہے!"

حسن تاباں نے کہا۔ "شہزادے! اگر آپ میرے مشورے پر عمل نہیں کریں گے تو پچھتائیں گے، دوسرے یہ کہ میرے مشورے کو رد کر کے آپ میری خدمات سے محروم ہو جائیں گے اور میں کنارہ کشی اختیار کر لوں گا!"

شہزادے کو سخت غصہ آیا۔ اس نے اپنے محافظ دستے کو حکم دیا۔ "یہ شخص ہمیں غدار نظر آتا ہے اسے اس وقت تک قید میں رکھا جائے جب تک ہم اس کے سابق آقا تیمور سے نبرد آزما ہیں، اس کے بعد اس

کے خلاف تحقیقات عمل میں آئے گی!"

حسن تاباں کو بُری طرح مار پیٹ کر قید کر دیا گیا جب اسے قید خانے میں ڈال کر دروازہ بند کیا جا رہا تھا تو حسن تاباں نے بآوازِ بلند چیخ کر کہا "تم لوگ اپنے مخلص اور صائب الرائے مشیر کا مشورہ نہیں مانو گے تو تمہارا بھی وہی حشر ہو گا جو اس سے پہلے خونخوار تیمور کے دوسرے مخالفین کا ہوتا رہا ہے!"

حسن تاباں کو کچھ پتہ نہ تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے لیکن ارطغرل نے دوسرے دن حسن تاباں کے بقول سُرخ اور تیسرے دن سیاہ جھنڈا لہراتے دیکھا، فصیل کی بنیادوں میں تیموری سپاہ جھکی ہوئی کھدائی میں مصروف تھی، شہزادے نے اپنے باپ کے پاس صورتِ حال کی تفصیلات کے ساتھ قاصد روانہ کر دیے لیکن ابھی یہ قاصد راستے ہی میں ہوں گے کہ تیمور نے سیواس کے قلعے کی دیواریں زمیں بوس کرا دیں اور اپنے لشکرِ عظیم کے ساتھ شہر میں داخل ہو گیا۔ شہزادے کی فوج نے ہتھیار ڈال دیے، شہزادہ حسن تاباں کے پاس پہنچا اور اسے قید خانے سے نکالتے ہوئے کہا "کیا تم اپنے سابق امیر سے ہمیں معافی دلوا سکتے ہو؟"

لیکن اگر شہزادہ غور سے حسن تاباں کی شکل دیکھتا تو اسے معلوم ہو جاتا کہ شہزادے سے زیادہ حسن تاباں خوفزدہ ہے، شہزادے کی بات اس طرح سُنی تھی جیسے کسی نے اسے عالمِ خواب میں مخاطب کیا ہو۔ اس نے بدحواسی میں سوال کیا "ابھی شہزادے نے مجھ سے کیا کہا تھا؟"

شہزادے نے کہا "ہم چاہتے ہیں کہ تم اپنے امیر سے ہمیں معافی دلوا دو!"

حسن تاباں نے جواب دیا "ایسا ممکن تو ہے تم ہمیں امیر تیمور کے پاس لے چلو، یا تو وہ ہمیں معاف کر دے گا یا پھر قتل کرا دے گا!"

شہزادے کو پھر یہی محسوس ہوا کہ حسن تاباں کا دماغی توازن درست نہیں ہے اس نے کہا "ظاہر ہے کہ یا تو وہ ہمیں معاف کر دے گا یا پھر قتل کرا دے گا!"

حسن تاباں نے پریشانی میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ تیموری سپاہی لوگوں کو رسیوں سے جکڑتے بڑھے چلے آ رہے تھے، اس نے شہزادے سے کہا "ہو سکتا ہے تیمور تمھیں معاف کر دے کیونکہ تم ترک فاتح کے بیٹے ہو لیکن میں اپنے لیے کیا کروں؟ یہ خونخوار مجھے تو کسی طرح بھی معاف نہیں کرے گا!"

شہزادے نے جواب دیا "اسی سبب اور اسی رشتے سے وہ تمھیں بھی معاف کر سکتا ہے کہ تم بھی تو حکمران رہ چکے ہو، حکومت سو آدمیوں پر کی جائے یا سو ہزار پر، بات تو ایک ہی ہے!"

حسن تاباں نے غصے میں شہزادے کو گھورا، بولا "اب میں تیری سفارش کر چکا، تیار ہو جا مرنے کے لیے میرا مذاق اُڑانے والا مفتوح میری سفارش کس طرح حاصل کر سکتا ہے!"

تیمور کو ترک شہزادے کی بطورِ خاص تلاش تھی، جب ترک شہزادہ تیمور کی خدمت میں پیش ہوا تو اس کے ساتھ ہی حسن تاباں کو بھی پیش کر دیا گیا۔ تیمور نے اسے حیرت سے دیکھا اور پوچھا "تو یہاں سیواس میں کیا کر رہا تھا؟"

حسن تاباں نے گڑگڑا کر جواب دیا "یہ ناچیز ترک شہزادے کو یہ مشورہ دے رہا تھا کہ ہمارے آقا سے مقابلہ بے سود ہے لیکن یہ نہیں مانا اور ہمارے آقا کے عتاب کا مستحق قرار پایا!"

شہزادے اور تیمور کی نظریں چار ہوئیں تو تیمور نے سوال کیا "تو ذرا سی فوج کے بل بوتے پر اس غلط فہمی کا شکار کیونکر ہو گیا تھا کہ ہماری عظیم اور ناقابلِ شکست افواج سے لڑ سکے گا؟"

شہزادے نے ترک شجاعت کا مظاہرہ کیا، بولا "صلح اور مفاہمت کا اختیار والد (بایزید) کو حاصل ہے۔ ہم ان کے نمائندے اور فرماں بردار ہونے کی حیثیت سے اس وقت تک جنگ کرنے پر مجبور ہیں جب تک اُوپر سے کوئی خاص حکم نہیں آتا!"

تیمور نے سر کے خفیف اشارے سے خدمت گار کو حکم دیا "اسے بھی عام قیدیوں میں شامل کر دیا جائے!"

حسن تاباں نے سفارش کی "شہزادہ ابھی نوجوان ہے حضور اگر اس کی جاں بخشی فرما دیں تو عین نوازش ہو گی!"

تیمور نے قہر کی نظروں سے حسن تاباں کو گھورا اور کرخت آواز میں کہا "کیا سانپ کو اس لیے معاف کر دیا جائے کہ وہ ابھی پورا سانپ نہیں بنا ہے اور پھر تو... تو سفارش کرتا ہے جو خود بھی مجرم ہے، غدار دھوکے باز، مکار، بے وقوف، کیا تجھے اس بات کا یقین ہے کہ تو سزا سے بچ جائے گا؟"

حسن تاباں خوف سے تھر تھر کانپنے لگا۔

تیمور نے جنگی مجرمین کے خلاف اپنا فیصلہ صادر کر دیا "ان سے بڑے بڑے گڑھے کھدوائے جائیں۔"

قیدیوں کی رسیاں کھول دی گئیں اور وہ سب بڑے بڑے گڑھے کھودنے میں مصروف ہو گئے، جب بہت سارے گڑھے کُھد چکے تو تیمور کی محافظ سپاہ نے تیمور کو مطلع کیا کہ حکم کی تعمیل ہو چکی ہے!"

تیمور اپنے خیمے سے چل کر ان قیدیوں کے درمیان پہنچا اور کھدے ہوئے گڑھوں کا معائنہ کیا، جن گڑھوں میں کوئی عیب تھا اسے دُور کرایا اور اس کے بعد جنگی مجرموں کو دیکھ کر مسکرایا۔ طنز سے بولا "تم تیموری عتاب سے آنکھیں ملانے کے لیے اس کے سامنے آئے تھے!"

شہزادے نے احساسِ شکست خوردگی کے بوجھ تلے دبی ہوئی نظریں لمحے بھر کے لیے تیمور کی طرف اُٹھائیں اور جواب دیا "جب دو فریق لڑتے ہیں تو ان میں سے ایک فاتح ہوتا ہے اور دوسرا مفتوح، قسمت کی بات ہے کہ تیمور فاتح ہے اور ہم مفتوح لیکن جنگ کا آخری فیصلہ ابھی کہاں ہوا ہے اور کون جانتا ہے کہ آخری فتح کس کے مقدر میں لکھی ہے!"

تیمور نے اس جری شہزادے کو اچٹتی نظر سے دیکھا اور اشارے سے اپنے ایک سپاہی کو شہزادے کے قریب جانے کا حکم دیا۔ اِدھر اُدھر قیدیوں کی رسیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ تیمور نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا "شہزادے کے سر کو گھٹنوں کے بیچ سے گزار کر اس کے دونوں ہاتھ گدی پر رکھ کے باندھ دیے جائیں!"

حکم کی نہایت بے دردی سے تعمیل کر دی گئی، شہزادہ گٹھڑی بن گیا تیمور ایک ثانیے اسے دیکھتا رہا۔ ابھی کچھ کسر باقی تھی، دونوں ٹانگیں بندھی نہ ہونے کی وجہ سے پھیل گئی تھیں، تیمور نے دوسرا حکم دیا "دونوں ٹانگیں پنڈلیوں کو ملا کر باندھ دی جائیں!"

اس حکم کی بھی تعمیل کر دی گئی، اب شہزادہ زمین پر گیند کی طرح پڑا ہوا تھا۔

تیسرا حکم تھا "تمام قیدیوں کو اسی طرح باندھ دیا جائے!"

کُل سپاہی چار ہزار تھے ان سبھوں کو اسی طرح باندھ کر گیند کی طرح زمین پر ڈال دیا گیا۔

حسن تاباں بھی یہ تماشا دیکھ رہا تھا، وہ سمجھا میرا بھی یہی حشر ہونے والا ہے، زار و قطار رونے لگا۔ تیمور ابھی اس سے بہت دُور تھا۔ اس لیے وہ اس کی یہ کیفیت نہیں دیکھ سکا۔

تیمور کا چوتھا حکم تھا "ہمارے سپاہی انھیں اپنی ٹھوکروں کی مدد سے کھدے ہوئے گڑھوں میں گرا دیں، اور اس حکم کی تعمیل دلچسپ کھیل یا خوشگوار مشغلے کی طرح کی جائے!"

حکم ملتے ہی تاتاریوں کا خونخوار ریلا ان انسانی گیندوں پر ٹوٹ پڑا اور ٹھوکریں مار مار کر انھیں گڑھوں کی طرف لے چلا۔ مجبوروں کی کربناک چیخیں بلند ہوتی رہیں لیکن ان چیخوں سے زیادہ شور تاتاریوں کے قہقہوں کا تھا وہ اس سفاک کھیل کو پوری دلچسپی اور انہماک سے انجام کو پہنچا رہے تھے، جب سارے قیدی گڑھوں میں گرائے جا چکے تو تیمور نے پانچواں حکم نافذ کیا "گڑھوں کو مٹی ڈال کر بند کر دیا جائے!"

بے شمار انسانوں کی کوششیں گڑھوں کو پاٹ دینے میں صَرف ہونے لگیں، اور دیکھتے ہی دیکھتے دُنیا چار ہزار جنگی قیدیوں کے وجود سے پاک ہو چکی تھی، اور زمین نے اُنھیں اپنی آغوش میں چھپا لیا تھا۔

تیمور نے روتے ہوئے حسن تاباں کو اپنے خیمے میں طلب کیا اور اس سے پوچھا "کیا یہ صحیح ہے کہ تو نے ہمیں خونخوار کہا اور یلدرم کی فوج میں ملازمت کر لی تھی؟"

حسن تاباں نے روتے ہوئے کہا "یہ ناچیز امیر کے ہتھے چڑھ گیا ہے اس لیے مجھے بہت بڑا مجرم گردانا جا رہا ہے، حالانکہ فیضی اور اس جیسے ہزاروں تاتاری یلدرم کی فوج میں پہنچ چکے ہیں!"

تیمور نے کہا "وہ بھی مجرم ہیں اُنھیں بھی ان کی غداری اور بے وفائی کی سزا ملے گی!"

حسن تاباں نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا "یہ ناچیز جب ترکوں کی سرحد میں دھکیل دیا گیا تو اسے ذریعۂ معاش کے لیے کچھ تو کرنا ہی تھا!"

تیمور نے تیوریوں پر بل ڈال کر کہا "ذریعۂ معاش کا مطلب یہ نہیں کہ ہمارے مقابل آنے والی فوج میں شامل ہو کر ہمارے مقابلے پر آ جاؤ، یہ تو سراسر نمک حرامی اور غداری ہے!"

حسن تاباں لاجواب ہو گیا لیکن کچھ سوچ کر فوراً ہی بولا "حضورِ والا! یہ آدمی کی فطرت ہے کہ یہ دوسروں کو جو کچھ کرتے دیکھتا ہے خود بھی وہی کرنے لگتا ہے، میں نے امیر کے بہت سارے آدمیوں کو جب بایزید کی فوج میں ملازمت کرتے دیکھا تو خود بھی ملازم ہو گیا!"

"ہونہہ!" تیمور سخت غصے میں تھا "اور وہ الجائی سے دست درازی اور فیضی پر حملہ آور ہونے والا اقدام کس کی تقلید یا اتباع میں ہوا تھا؟"

بو علی سینا

چیزوں کی کمی بیشی سے پیدا ہونے والی وقعت اور بے وقعتی پر تقریر کر رہا تھا۔ اس نے بتایا "جو چیز مقدار میں جتنی بڑھتی چلی جائے گی، اس کی وقعت اور قیمت اتنی ہی گھٹتی چلی جائے گی، لیکن ایک چیز ایسی بھی ہے جو جتنی بڑھے گی اس کی وقعت اور قیمت میں اتنا ہی اضافہ ہوتا چلا جائے گا!"

شریکِ درس شاگرد نے پوچھا "وہ کون سی چیز ہے؟"

بو علی سینا نے جواب دیا "علم اور صرف علم، کیونکہ اس کے بغیر تو عقل بھی آگے نہیں بڑھ سکتی!"

حسن تاباں گڑگڑاتا ہوا تیمور کے قدموں میں گر گیا۔ "رحم، دُنیا کے سب سے بڑے فاتح رحم۔ شاہوں کے شاہ، خُدا کے لیے رحم کیجیے!"

تیمور نے حقارت سے اسے نظر انداز کر دیا لیکن حسن تاباں اتنی عقل ضرور رکھتا تھا کہ اگر تیمور کے خیمے سے جان کی امان کا وعدہ لیے بغیر چلا گیا تو پھر اسے دُنیا کی کوئی طاقت بھی موت سے نہ بچا سکے گی، اس نے تیمور کے پاؤں پکڑ لیے لیکن تیمور پیچھے ہٹ گیا۔ حسن تاباں نے روتے ہوئے کہا: "اچھا اس وقت تک مجھے زندہ رکھا جائے جب تک کہ میرے ہی جیسے دوسرے مجرم بھی نہ پکڑ لیے جائیں، ان کے ساتھ مرنا زیادہ آسان ہو جائے گا!"

تیمور نے آنکھ کے اشارے سے معلوم نہیں کیا حکم دیا کہ دو سپاہی حسن تاباں کو زبردستی اُٹھا لے گئے۔ چونکہ حسن تاباں کو تیمور کا حکم نہیں سُن سکا تھا، اس لیے اسے کچھ بھی نہیں معلوم تھا کہ سپاہی اسے قتل کرنے کے لیے لے جا رہے ہیں یا محض قید کرنے کے لیے۔ سپاہیوں نے اسے قید کر دیا اور کہا: "امیر نے تمہیں اس وقت تک زندہ رکھنے کا حکم دیا ہے جب تک تمہارے ساتھ کے دوسرے غدار بھی نہ پکڑ لیے جائیں!"

حسن تاباں نے اشکبار آنکھوں سے سپاہیوں کو گھورا اور پوچھا "کیوں بھائی! بہت سارے آدمیوں کے ساتھ مرنا زیادہ آسان ہوتا ہے یا تنہا مر جانا؟"

کسی سپاہی نے ہنس کر جواب دیا: "شاید دونوں ہی طرح، ورنہ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے خود تو ان دونوں ہی طرح کی موت کا کوئی تجربہ نہیں!"

حسن تاباں نے ناراض ہو کر منہ بنایا اور آنسو پونچھتا ہوا بولا "ہنستے ہو، اگر میری جگہ تم ہوتے اور پھر ہنستے تو سمجھتا کہ بڑی ہمت کے آدمی ہو!"

سپاہی نے اسے ایک ٹھوکر رسید کی، بولا: "میں کیوں ہوتا تیری جگہ، تو غدار ہے اور غداری سے خُدا بچائے یہ جُرم تو وہ ہی کرتا ہے جس سے قضا کا فرشتہ یارانہ گانٹھ لیتا ہے!"

حسن تاباں تلملا کر رہ گیا، اور خاموشی اختیار کی کیونکہ خوب جانتا تھا کہ اگر اس نے مزید زبان چلائی تو یہ سپاہی امیر کے حکم کے بغیر ہی پٹائی شروع کر دے گا۔

بیٹے کے عبرتناک انجام کی خبر سُن کر بایزید اتنا مشتعل ہوا کہ ایک لاکھ بیس ہزار سپاہ کے ساتھ سیواس چل پڑا۔ تیمور کے جاسوسوں نے اسے بایزید کی پیش قدمی سے فوراً ہی مطلع کر دیا۔ تیمور اس کی آنے والی راہ سے واقف تھا۔ اس نے ایک نہایت شاطرانہ چال چلی، دریا کے ایک کنارے کنارے بایزید آ رہا تھا۔ اور دوسرے کنارے سے دُور دُور تیمور اپنی فوج کے ساتھ انگورے کی طرف بڑھ رہا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ سیواس تک بایزید کا اپنی فوج لے جانا اور پھر سیواس سے انگورے پہنچنا۔ اس کی فوج کے لیے تھکا دینے والا عمل ثابت ہوگا اور اس حالت میں، جبکہ بایزید کی فوج میں پیادوں کی کثرت تھی، تیمور کے ساتھ پانچ لاکھ سے زائد سپاہ تھی اور انھیں بیسیوں جنگوں کا تجربہ حاصل تھا۔

تیمور کی پانچ لاکھ سے زائد فوج نے سو میل کا فاصلہ تین دن میں طے کیا۔ اور انگورے کے میدان میں پہنچ گئے، یہاں بایزید کی سپاہ کے خیمے نصب تھے جنھیں ایک معمولی دستے کی نگرانی میں چھوڑ دیا گیا تھا اور جو تیموری لشکر کو دیکھتے ہی راہِ فرار اختیار کر چکا تھا۔ تیمور نے ان خیموں پر قبضہ کر لیا۔ بایزید کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ تیمور درمیانی شہروں اور علاقوں کو چھوڑتا ہوا سیدھا انگورے پہنچ جائے گا۔ اور چھوٹی چھوٹی جنگوں اور جھڑپوں کے بجائے ایک ہی فیصلہ کُن جنگ لڑنے کو ترجیح دے گا۔

بایزید کو جیسے ہی یہ معلوم ہوا کہ تیمور اس کے شہر کا محاصرہ کر چکا ہے تو وہ فوراً ہی واپس ہوا اور جب انگورے کے قریب پہنچا تو یہ دیکھ کر اسے افسوس ہوا کہ "تاتاری اس کے معسکر پر قابض ہو چکے ہیں، بایزید تیمور سے بارہ میل دور تھا، پہلے تیمور یہ چاہتا تھا کہ بایزید کی واپسی تک انگورے پر قبضہ کر لیا جائے لیکن جب اسے یہ معلوم ہوا کہ بایزید اس سے بارہ میل کی دُوری پر ہے تو اس نے شہر کی طرف سے توجہ ہٹائی اور بایزید کے مقابلے کی تیاری کرنے لگا۔

تیمور نے بایزید کی فوج کو دریا کے پانی سے محروم کر دینے کی غرض سے اُس کا رُخ موڑ دیا۔ ترکوں کے لیے اب ایک چشمہ رہ گیا تھا جس کا پانی وہ استعمال کر سکتے تھے لیکن تیمور نے اس میں غلاظت کا انبار لگا دیا۔ اور اس لائق نہ رکھا کہ بایزید کی فوج اس کا پانی استعمال کر سکتی، بایزید کو پہلی بار تیمور کی خطرناک اور چالاک شخصیت کا کچھ کچھ اندازہ ہوا۔

بایزید کے سامنے جنگ چھیڑنے کے علاوہ کوئی صورت بھی نہ رہ گئی تھی کیونکہ تاخیر سے سپاہیوں اور گھوڑوں کے پیاس سے مر جانے کا خطرہ

باقی آئندہ

پیدا ہو گیا تھا۔ تیمور خوش تھا کہ اس نے ترک فاتح کو تدبیرات اور تدبیر کی جنگ میں مات دے دی تھی۔

پریشان بایزید سے فیضی نے ایک پریشان کن ملاقات کی اور اسے بتایا کہ ترک سپاہ میں کچھ ایسے آدمی بھی موجود ہیں جو تیمور کی حمایت میں کام کر رہے ہیں اور تاتاری صفوں کو یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ تیمور اسلامی دنیا کا مجدّد ہے۔ اس کے بعد اس نے ایک کاغذ نکال کر بایزید کے سامنے رکھ دیا، اس میں لکھا تھا:۔

● مسلمانو! ہر سو سال بعد ایک مجدّد پیدا ہوتا ہے جو دین کو نئی زندگی بخشتا ہے امیر تیمور اس عہد کا مجدّد ہے علمائے کرام اور صلحائے عظام دعاگو ہیں کہ خدا تیمور کی مدد کرے اور اس سے دینِ محمدیؐ کو قوت و استقامت عطا فرمائے اور اس کے ہاتھوں اس کو تباہ و برباد کرے جو دینِ محمدیؐ کو پریشان کرنے کی کوشش کرے●

عبارت کے آخر میں بڑے بڑے علما اور صلحا کے دستخط تھے۔

بایزید نے پوچھا "یہ کس کے پاس سے نکلا ہے؟"

فیضی نے جواب دیا "اس شخص کو قید کر دیا گیا ہے اور اسی سے یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ خود اور اس جیسے دوسرے بہت سے سپاہی علمائے کرام کے اس فتوے پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کی فوج میں تشہیر اور تبلیغ کر رہے ہیں!"

بایزید نے فکرمندی سے فیضی کو دیکھا اور کہا "جن لوگوں کا یہ کام ہے تمھیں ان سے واقف ہونا چاہیے کیونکہ یہ وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو وفاداریاں تبدیل کر کے تمھارے ساتھ ہماری فوج میں آگئے ہیں"

فیضی نے جواب دیا "حضور کا قیاس درست ہے اور ہمیں یقین ہے کہ یہ لوگ ہم سے بچ کر بھاگ نہیں سکتے۔ ہم انھیں کیفرِ کردار کو پہنچائے بغیر چین سے نہ بیٹھیں گے!"

بایزید نے تحکمانہ کہا "اس وقت تک تم خود بھی کہیں نہیں جا سکتے جب تک میں کوئی نیا حکم نہ دوں"۔ اس کے بعد اس نے اپنی محافظ سپاہ کے ایک افسر کو حکم دیا "اس کو اس کے ساتھیوں سمیت فیصلۂ جنگ تک حراست میں رکھا جائے!"

حکم کی تعمیل ہوئی اور فیضی حراست میں لے لیا گیا۔

دوسری طرف تیمور فوج کی ترتیب قائم کر رہا تھا۔ بڑھاپے میں اس نے زرہ پہننی ترک کر دی تھی لیکن ترکوں کے مقابلے میں اس نے زرہ بھی پہن لی تھی اور اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر لشکر کا جائزہ لیتا رہا۔ تیمور نے اپنی فوج کو حکم دے رکھا تھا کہ جب تک ترکوں کی طرف سے جنگ میں پہل نہ ہو، خود پہل نہ کریں۔ پانی کی ایک ایک بوند کو ترستے ہوئے ترک جنگ کے لیے بے تاب تھے۔ انھوں نے طبل و نقارے اور شہنائی کی آوازوں کے ساتھ ہی پیش قدمی شروع کر دی لیکن تیموری سپاہ خاموش کھڑی ان کا انتظار کرتی رہی۔ تیمور اپنی سوار فوج کے پیچھے ایک پہاڑی پر چڑھ گیا اور وہاں گھوڑے سے اتر کر پیادوں کے بیچ میں کھڑا ہو گیا۔ اس کے گرد و پیش صرف چالیس سوار تھے

جنگ کا آغاز بایزید کے لڑکے سلیمان نے تاتاریوں کے دلہنے بازو پر حملے کی صورت میں کر دیا۔ اسی وقت مشینی انداز میں تاتاریوں کی طرف سے تیروں کی بارش شروع ہو گئی اور شعلہ بار مادّے نے ترکوں کو جھلسانا شروع کر دیا اگلی صفوں کے سپاہی کٹے ہوئے درختوں کی طرح زمین پر بچھ گئے اور پچھلی صفوں کی سپاہ انھیں روند کر آگے بڑھی۔ تیروں کی سرسراہٹ، ہتھیاروں کے ٹکرانے کا شور، سپہ داروں اور فوجی افسروں کی ہشیار باش، مردانہ پیش بیا، شاباش کی آوازیں گونجنے لگیں۔

یہ جنگ پھیلتے پھیلتے ہر محاذ تک پہنچ گئی تیموری سپاہ نے ترکوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک دیا اور بہت جلد انھیں پسپا کر کے پیچھے دھکیلنے لگے جب جنگ اپنے عروج پر پہنچ گئی تو بایزید بھی اپنی ینی چری کے ساتھ آگے بڑھا اور برقِ خاطف بن کر ٹوٹ پڑا۔ بایزید کی ینی چری بہادری میں اپنا کوئی جواب نہ رکھتی تھی۔ یہ ینی چری (نئی فوج) پیادہ فوج کی سرکشی کو دبانے کے لیے مفتوح قوموں کے لڑکوں سے تیار کی گئی تھی۔ انھیں مفتوح حکومتیں ہر سال ہزاروں کی تعداد میں خراج کی طرح بھیجتی تھیں۔ یہ نو عمر لڑکے ہوتے تھے انھیں فوجی تربیت دے کر بادشاہ کا خاص محافظ دستہ بنا دیا گیا تھا۔ چونکہ ان کا کوئی خاندان نہ ہوتا تھا۔ اس لیے یہ مارنا اور مر جانا ایک معمولی بات سمجھتے تھے۔ بایزید کو اپنی ینی چری پر بڑا ناز تھا۔ اس جنگ میں بایزید کا داہنا بازو زخمی ہو گیا۔ وہ ایک پہاڑی پر ینی چری کے درمیان کلہاڑی پکڑے کھڑا تھا اور اپنے جوانوں کو لڑا رہا تھا لیکن قسمت اور اقبال مندی نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ اس کے آس پاس ایک ہزار ینی چری باقی رہ گئے تھے اور تاتاری اس کی طرف بڑھے چلے آ رہے تھے، اسی عالم میں اسے خبر ملی کہ اس کی فوج کے تاتاری سپاہی اس کا ساتھ چھوڑ کر جا چکے ہیں۔

شام قریب تھی اور جنگ کا انجام اس کے سامنے تھا، اس کے وفاداروں نے اسے کئی بار مشورہ دیا کہ وہ فرار ہو جائے لیکن اس کی غیرت اور شجاعت اس کے پیر پکڑے ہوئے تھی پھر جب وہ بالکل ناامید ہو گیا تو اس نے اپنا گھوڑا طلب کیا اور اس پر سوار ہو کر اپنے محافظوں کے مختصر دستے کی معیت میں تاتاریوں کو چیر کر نکل جانا چاہا۔ تاتاریوں نے ان کا مقابلہ کیا اور بایزید کے ساتھیوں کو تیروں کی زد میں لے کر ایک ایک کر کے گرا دیا اور آخر میں بایزید کے گھوڑے کو بھی زخمی کر کے گرا دیا۔ بایزید ابھی سنبھل بھی نہ سکا تھا کہ تاتاریوں نے اسے گھیر کر رسیوں سے جکڑ دیا۔

جب جنگ شروع ہوئی تو حسن تاباں ایک ایسے خیمے سے اس کا مشاہدہ کرنے لگا جہاں اس کا کوئی نگران تک نہ تھا۔ حسن تاباں نے خیمے سے باہر جھانک کر دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس کے نگران کہاں گئے پھر اسے شبہ گزرا کہ شاید جنگ کا پانسہ بایزید کے حق میں پلٹ چکا ہے اور تیمور کا ایک ایک سپاہی میدانِ جنگ میں نبرد آزما ہے اس نے سوچا موقع غنیمت ہے، چپ چاپ فرار ہو جانا چاہیے کیونکہ اگر اس موقع سے فائدہ نہ اٹھایا گیا تو سزائے موت یقینی ہے وہ خاموشی سے باہر نکلا اور خیموں کی آڑ سے گزرتا ہوا اس سمت بڑھا جدھر جنگ نہیں ہو رہی تھی۔ خیموں کی حد سے ذرا آگے ایک خالی گھوڑا میدانِ جنگ سے آتا دکھائی دیا۔ اس کا سوار غالباً کام آ چکا تھا۔ اس نے پھرتی سے بڑھ کر اسے روک لیا اور اچک کر سوار ہو گیا اب اس کا حوصلہ بہت زیادہ بڑھ چکا تھا۔ اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور نسبتاً سنسان پہاڑی راستے پر ہو گیا۔ ابھی اس نے تقریباً ایک میل کا فاصلہ طے کیا تھا کہ سامنے سے کچھ سوار آتے دکھائی دیے یہ دیکھ کر ایک طرف ہو رہا اور ایک چٹان کی آڑ میں کھڑے ہو کر سواروں کے گزر جانے کا انتظار کرنے لگا۔ چٹان چھوٹی تھی اس کا سر چٹان کے اوپر نکلا ہوا صاف دکھائی دے رہا تھا اس کا خیال تھا کہ تیز رفتار سوار اسے دیکھے بغیر گزر جائیں گے لیکن ان سواروں میں سے کسی ایک نے حسن تاباں کو دیکھ لیا اور شور کر دیا دوسرے سوار بھی اس طرف متوجہ ہو گئے، اور اسے ہر طرف سے گھیر لیا۔ حسن تاباں نے ان سینکڑوں سواروں میں فیضی کو پہچان لیا اور خوف ڈر دل میں بیٹھا ہوا تھا کم ہو گیا۔ وہ چٹان کی آڑ سے باہر نکلا اور فیضی کی طرف بڑھتا ہوا بولا "بہت اچھا ہوا جو تم مل گئے۔ میں بڑی مشکلوں سے امیر کی گرفت سے نکلا ہوں میرا خیال ہے تم بھی کسی طرف فرار ہو رہے ہو!"

فیضی نے پوچھا "تم تھے کہاں؟ سو اس کے بعد تو تمھارا پتہ ہی نہ چلا میں تو یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ ترکی سپاہ کے ساتھ تم بھی ہلاک کر دیے گئے!"

حسن تاباں نے خوفزدہ لہجے میں پوچھا "یہ جگہ بالتفصیل بات کرنے کی نہیں ہے، یہاں سے کہیں نکل چلو پھر باتیں کروں گا!"

فیضی نے اسے اپنے آدمیوں کے گھیرے میں لے لیا اور کہا "تم ہمارے ساتھ چلو!"

حسن تاباں نے دیکھا ان سواروں کا رخ تیمور کے معسکر کی جانب تھا وہ چاہتا تو بھاگ نکلنے کی کوشش ضرور کرتا لیکن وہ یہ بھی تو جانتا تھا کہ فیضی خود بھی غداری اور بے وفائی کا مجرم ہے وہ خود کس طرح تیمور کے لشکر میں جانے کی غلطی کر سکتا تھا۔ وہ فیضی کے ساتھ ہو لیا اور یہ سب تیمور کے معسکر میں داخل ہو گئے، مغرب کا وقت تھا اور یہ وہ وقت تھا جبکہ بایزید پابجولاں تیمور کے خیمے کی جانب لے جایا جا رہا تھا۔ فیضی اپنے آدمیوں کے ساتھ بایزید کے قریب سے گزرا۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں تو فیضی مسکرانے لگا۔ بایزید نے فیضی کی طرف تھوک دیا اور غصے میں کہا "دغاباز فریبی!"

فیضی نے کوئی جواب نہ دیا۔

جس وقت یہ لوگ تیمور کے خیمے پر پہنچے وہ اپنے بیٹے کے ساتھ شطرنج کھیلنے میں مشغول تھا۔ جب اسے یہ اطلاع ملی کہ بایزید خیمے کے در پہ حاضری دینے کی اجازت کا منتظر ہے تو تیمور نے کھیل چھوڑ دیا اور مفتوح بادشاہ کی پیشوائی کو آگے بڑھا اور ہنس کر اس کا استقبال کیا۔

بایزید شکست کھانے کے باوجود شاہانہ جاہ و جلال سے آگے بڑھا اور شکوہ و طنز کے ملے جلے انداز میں تیمور سے کہا "فتح و شکست خدا کی طرف سے ہے تمھیں ہم پر ہنسنا نہیں چاہیے!"

تیمور نے جواب دیا "ہم تیری شکست یا اپنی فتح مندی پر نہیں ہنس رہے بلکہ یہ سوچ رہے ہیں کہ اگر تو فاتح ہوتا اور میں مفتوح تو میرا کیا حشر ہوتا!"

بایزید کوئی جواب نہ دے سکا۔

تیمور نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا "بروسہ سے سلطان کا خزانہ کنیزیں

انگلستان

میں گداگری قانوناً قابلِ تعزیر جرم ہے۔ اس کے باوجود ایک گداگر نے ایک دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلا اور ایک شخص نے پوچھا "فرمائیے!"

گداگر نے نظریں جھکالیں، کہنے لگا "جناب! میں کئی وقتوں کا بھوکا ہوں، آج کا پورا دن بھوک میں گزر گیا اور کل....."

اس کی زبان یوں رک گئی کہ غیر ارادی طور پر اس نے جو ایک طرف دیکھا تو سامنے سے کانسٹیبل آتا دکھائی دیا۔ گداگر نے چستی سے گردن اکڑائی اور سینہ تان کر بولا "اور اگر کل بھی مجھے کھانے کو کچھ نہ ملے تو کوئی پروا نہیں، میرا حوصلہ بہت بلند ہے!"

اور سلطان کا شاہی لباس لایا جائے!"
اس کے جرنیل اپنے امیر کے حکم کی تعمیل میں بروسہ (ترکوں کا دارالسلطنت) روانہ ہو گئے۔

بایزید نے فیضی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "تاتاری فاتح! ہم دونوں کی جنگ دو بہادروں کی جنگ ہرگز نہ تھی اس میں تم نے ہم پر عیاری اور چالاکی سے فتح حاصل کی ہے!"

تیمور نے جواب دیا "بایزید! تم اپنی شجاعت کے نشے میں یہ بھول گئے تھے کہ فیصلہ کن فتح حاصل کرنے کے لیے محض بہادر اور شمشیر زن ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس میں اعلا تدبر اور ذہانت کی ضرورت بھی پیش آتی ہے!"

اس کے بعد تیمور نے فیضی کو حکم دیا "تم اپنے خیموں میں واپس جاؤ' جب طلب کروں آجانا!"

حسن تاباں تھر تھر کانپ رہا تھا' اسے تعجب ہوا کہ امیر تیمور نے اسے دیکھ کر کوئی توجہ نہ دی اور فیضی کو ہدایات دیتا رہا!

رات گہری ہو چکی تھی۔ بروسہ سے بادشاہ کا شاہی لباس لے آیا گیا۔ بوڑھے تاتاری نے بایزید کو حکم دیا "شاہی لباس زیب تن کیا جائے!"

حالات کے ہاتھوں بے بس اور مجبور بایزید نے تیمور کے حکم کی تعمیل کی اور شاہی لباس زیب تن کیا جڑاؤ عمامہ سر پر رکھنے کے بعد سنہری گرز ہاتھ میں لے لیا۔ تیمور نے بایزید کے لیے وہی مشروبات طلب کیے جس کا وہ عادی تھا اس کے بعد تیمور نے حکم دیا "فتح کی خوشی اور مفتوح بادشاہ کی آمد کے اعزاز میں جشن برپا کیا جائے!"

جشن کا انتظام کیا گیا' بایزید کی تمام کنیزیں گرفتار ہو کر تیمور کے خیمے میں لائی جا چکی تھیں' انھی میں بایزید بھی شامل کر دیا گیا۔ تیمور نے پوچھا "تو اپنی کس بیوی کو بہت زیادہ چاہتا ہے!"

بایزید نے کوئی جواب نہ دیا۔ تیمور کا جذبۂ انتقام پورے شباب پر تھا لیکن وہ اس کے حامیانہ مظاہرے سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس کے خیمے کے بڑے ہال میں جشن برپا ہوا بڑے بڑے امرا اور اس کے جاں نثار اس جشن میں شریک ہوئے' تیمور نے بایزید کو اپنے قریب بٹھایا اور اپنے آدمیوں کو حکم دیا "سلطان کی کنیزوں سے معلوم کرو۔ بادشاہ کی سب سے زیادہ چہیتی بیوی کون ہے؟"

تھوڑی دیر بعد جواب آگیا "ڈسپینا۔ سربیا کے عیسائی بادشاہ پیٹر کی بہن"۔

تیمور نے حکم دیا "فاتحین کے اعزاز میں جام بکف برہنہ رقص شروع کیا جائے!"

ایسا معلوم ہوا جیسے یہ سب کچھ پہلے ہی سے طے کیا جا چکا تھا امیر کے حکم کے ساتھ ہی بایزید کی کنیزیں اور بیویاں برہنہ کر دی گئیں اور انھیں ناچنے کا حکم دیا گیا۔ خیمے کا بڑا ہال لوبان اور دوسری خوشبویات کے دھوئیں میں عجیب پُراسرار منظر پیش کر رہا تھا۔ ہلکی روشنی میں بوڑھا تیمور اپنے جرنیلوں کے ساتھ گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھا ترک بیگمات کے برہنہ رقص سے لطف اندوز ہو رہا تھا' یہ مجبور اور بے بس خواتین خوشبویات کے دھوئیں میں یوں تھرک رہی تھیں' جیسے یہ کوئی مادی دنیا کے علاوہ ماورائی مقام ہو۔

تیمور کے جرنیل اور دوسرے امرا بایزید پر نظریں جمائے اس کی نفسی کیفیات کا اندازہ لگانے میں منہمک تھے' تیمور کی ساری کوششیں یہ تباہی تھیں کہ وہ بایزید کو اس کے ناشائستہ اور تکلیف دہ خطوط کی یاد دلانے میں کوشاں ہے بایزید غصے سے پاگل ہوا جا رہا تھا چونکہ وہ اس کے اظہار پر قادر نہ تھا اس لیے اسے پی جانے کی کوشش کر رہا تھا۔

بایزید شاہی گرز پکڑے بیٹھا تھا' تیمور نے اس سے پوچھا "کیا یہ رقص تمھیں پسند آیا؟"

بایزید کوئی جواب نہ دے سکا۔ تیمور نے اسے پھر مخاطب کیا' بولا "ہم اپنے معزز مہمان کو خوش کرنا چاہتے ہیں' سلطان ہمیں بتائے کہ وہ اور کیا دیکھنا پسند کرے گا!"

بایزید نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن تاتاری محافظوں نے اسے اٹھنے نہیں دیا۔

تیمور یہ سب کچھ لاپروائی اور بے نیازی سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے برہنہ خواتین کو حکم دیا۔

"محبت کے گیت گائے جائیں!"

انھوں نے دل کش دھنوں میں محبت کے ترکی گیت شروع کر دیے' بایزید ابھی تک تو برداشت کرتا چلا آ رہا تھا لیکن یہ گیت اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھے' وہ محافظوں کی پروا کیے بغیر جھٹکا دے کر اٹھ کھڑا ہوا اور وہاں سے ہٹ کر ایک طرف جانے لگا۔ محافظوں نے روکنے کی کوشش کی لیکن تیمور نے ہاتھ کے اشارے سے اجازت عطا کر دی کہ ترک سلطان کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے' دو محافظ اٹھے اور انھوں نے بایزید کے بازو تھام لیے اور آہستہ آہستہ اس محفلِ رقص و سرود سے باہر نکال لے گئے۔ خیمے کے دوسرے حصے تک پہنچتے پہنچتے بایزید کا سر ایک طرف ڈھلک گیا وہ ناقابلِ برداشت صدموں کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو چکا تھا۔

تھوڑی دیر بعد بایزید کی چہیتی بیوی ڈسپینا بھی چند تاتاریوں کے ساتھ وہیں پہنچ گئی۔ تاتاری سپاہیوں نے بے ہوش بایزید کو تیمور کے اس فیصلے سے آگاہ کیا کہ "امیر ترک سلطان کی چہیتی بیوی اسے واپس کر رہا ہے' حالانکہ خود بایزید نے امیر کو کوئی اور ہی دھمکی دی تھی!"

فتح کی یادگاریں سروں کے مینارے تعمیر کیے جا رہے تھے' ایک مینارے کی تعمیر کے دوران کچھ سر کم پڑ گئے تو تیمور نے ترکوں کی تلاش میں اِدھر اُدھر سپاہی روانہ کر دیے جو شکاری کتوں کی طرح بُو سونگھتے ہوئے ترکوں کو تلاش کرنے لگے' بالآخر جب وہ مل گئے تو ان کے سروں سے مینارے کی تعمیر تکمیل کو پہنچائی گئی۔

اب تیمور ان آدمیوں کی طرف متوجہ ہوا جو یا تو اس سے انعام و اکرام حاصل کرنے کے مستحق قرار پائے تھے' اور یا وہ لوگ تھے جنھیں کسی جرم کی سزا بھگتنا تھی' ان میں حسن تاباں بھی شامل تھا۔ تیمور کے خیمے کے باہر ان کا اجتماع تھا' اور وہ ہر ایک کو باری باری طلب کر رہا تھا۔ جب یہ لوگ اندر سے نکلتے تو ان میں بعض تو خوش و خرم نکلتے اور بعض کا منہ لٹکا ہوتا۔ باہر جو لوگ کھڑے تھے' ان میں حسن تاباں کے ساتھ ہی فیضی بھی تھا۔

حسن تاباں نے فیضی سے پوچھا "کیا خیال ہے امیر ہمیں کس قسم کی سزا دے گا؟"

فیضی نے جواب دیا "میں کیا بتا سکتا ہوں لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ وہ غداروں کو معاف نہیں کرتا۔ امیر وفاداریاں تبدیل کر دینے والوں کے حق میں موت کی تلوار ہے!"

حسن تاباں نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہا "پھر کوئی پروا نہیں کیونکہ اگر میں غدار ہوں تو تم بھی غدار ہو اور تمھارے تمام ساتھی غدار ہیں سبھی ایک ساتھ یکساں سزا بھگتیں گے!"

فیضی نے کوئی جواب نہ دیا تو حسن تاباں نے چڑ کر کہا "میں تو پہلے ہی تم سے یہ کہتا تھا کہ موقع ملا ہے تو کہیں بھاگ چلو لیکن تم خود مصیبت میں گرفتار ہوئے اور اپنے ساتھ مجھے بھی واپس لے آئے اب اذیت ناک موت کے لیے تیار ہو جاؤ!"

اسی وقت فیضی کو طلب کر لیا گیا اور فیضی کے فوراً بعد حسن تاباں کا نمبر آگیا۔ حسن تاباں کی پنڈلیاں سنسنا رہی تھیں' ان کا دم کھنچ چکا تھا۔ اور اس سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ حسن تاباں نے دیکھا۔ اندر تیمور کے پاس ایک ترک بھی موجود ہے' تیمور کے آس پاس اس کے چند امرا تھے۔

تیمور نے فیضی سے کہا "تمھاری خدمات اس لائق ہیں کہ تمھیں بیطر (ہیرو) کا خطاب عطا کیا جائے' آج سے تم عقل و تدبیر کے بیطر ہو!" اس کے بعد اجنبی ترک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "فیضی! کیا تم

اس بزرگ ترک سے واقف ہو؟"

فیضی نے نفی میں گردن ہلا دی' تیمور نے مسکرا کر جواب دیا "یہ آق شہر (سفید شہر) کا خواجہ نصر الدین ہے' وہی نصر الدین جس کی تمسخر اور مزاح میں لپٹی ہوئی عقل و دانش کی باتیں دُور دُور شہرہ حاصل کر چکی ہیں' ہمارے آدمی اسے بھی پکڑ لاتے تھے لیکن ہم اسے کوئی سزا نہیں دیں گے کیونکہ اس کی باتوں نے ہمیں بہت لطف اندوز کیا ہے!" اس کے بعد خواجہ سے کہا "ہم تم سے کوئی تازہ لیکن نادر واقعہ سننا چاہتے ہیں!"

خواجہ نصر الدین نے مسکینوں جیسا منہ بنا کر عرض کیا "جب اس ناچیز نے یہ سنا کہ حضور والا ترکی تشریف لا رہے ہیں تو حقیر نے کفایت شعاری اختیار کر لی کیونکہ میں حضور والا کو نذرانے میں کچھ پیش کرنا چاہتا تھا' اور نذرانے کے لیے رقم پس انداز کر رہا تھا۔ میرے پاس ایک گدھا تھا۔ ایک دن میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ اگر میں گدھے کی خوراک تدریج کم کرتا چلا جاؤں تو ایک دن ایسا ضرور آجائے گا کہ میں اسے کچھ کھلائے پلائے بغیر زندہ رہنے کا عادی بنا دوں گا۔ چنانچہ میں ایک ماہ سے یہ تجربہ کر رہا تھا۔ پرسوں تجربے کا آخری دن تھا لیکن آج گدھا چل بسا!" پھر منہ بسور کر بولا "بس ذرا افسوس اس بات کا ہے کہ جب ذرا بچت کا وقت آیا تھا تو گدھا جواب دے گیا!"

حاضرین کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی' خود تیمور بھی ہنس دیا اس کے بعد حسن تاباں کی طرف اشارہ کرتا ہوا بولا "ہمارے پاس بھی ایک گدھا ہے ہم اس پر بھی یہی تجربہ کرنے والے ہیں اور ممکن ہے کہ ہم اس تجربے میں کامیاب ہو جائیں!"

حسن تاباں سمجھ گیا کہ امیر اسے بھوکا پیاسا رکھ کر مار دینا چاہتا ہے۔ بے اختیار رونے لگا۔ گڑگڑا کر بولا "حضور والا! یہ میری کتنی بڑی بدنصیبی ہے کہ میرا ایک ساتھی تو انعام و اکرام اور بیطر کے خطاب سے نوازا جائے اور مجھے بھوکا پیاسا رکھ کر ہلاک کر دینے کی سزا دی جائے!"

تیمور نے جواب دیا "احمق انسان! فیضی تو اعلا منصوبے پر کام

کر رہا تھا تجھے بھی اسی کام پر مامور کیا گیا تھا لیکن کم عقل نے تجھے کچھ سمجھنے ہی نہ دیا اور تو نے غیر ضروری عقل کے وہ وہ کرشمے دکھائے کہ اگر فیضی ہوشیاری سے کام نہ لیتا تو تو نے ہمارا سارا منصوبہ ہی خاک میں ملا دیا ہوتا!"

حسن تاباں کے پاس اب کوئی جواب نہ تھا۔

تیمور نے کرخت آواز میں پوچھا "کیا یہ غلط ہے کہ تو ترک فوج میں شامل ہو کر ہم سے جنگ آزما ہونے والا تھا؟"

انکار کی ہمت نہ تھی، اثبات میں گردن ہلا دی۔

تیمور نے پھر کہا "کیا یہ غلط ہے کہ تو سیواس میں دشمن کی فوج میں ایک سپاہی کی حیثیت سے شامل تھا!"

اس نے پھر تائید میں گردن ہلا دی۔

تیمور پھر گرجا "کیا یہ بھی غلط ہے کہ اگر تجھے موقع مل جاتا تو تو بایزید کی فوج میں شامل ہو کر ہم سے جنگ کرنے آجاتا؟"

اس نے ایک بار پھر 'ہاں' میں گردن ہلا دی۔

"اور پھر" تیمور کہہ رہا تھا "تو نے الجاتی خانم سے دست درازی کی اور فیضی کو قتل کر دینا چاہا، کیا یہ معمولی جرم ہیں؟"

حسن تاباں نے جب یہ سمجھ لیا کہ اب وہ سزا سے کسی طور بھی نہ بچ سکے گا تو ذرا جرأت سے کام لیا، کہنے لگا "اس ناچیز نے یہ سب اس لیے کیا تھا کہ اس نے عقل مندوں اور بہادروں سے یہ سن رکھا تھا کہ حوصلہ مندی اور بے باکی کے بغیر کوئی شخص بڑا آدمی نہیں بن سکتا، ہاں اس کا اس حقیر کو اعتراف ہے کہ بڑا آدمی بننے کی کوششوں میں اس سے چند غلطیاں بھی سرزد ہو گئی ہیں!"

اس کے جواب پر لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹ کی شادابی دوڑ گئی خود تیمور بھی ہنسی نہ روک سکا۔ ہنسی کو چھپاتا ہوا بولا "اور کچھ یا بس؟ تجھے اپنی صفائی میں کچھ اور تو نہیں کہنا؟"

حسن تاباں کی فطری بے باکی عود کر آئی۔ اس کا چہرہ کسی اندرونی خوشی سے دمکنے لگا۔ جیسے کوئی زبردست نکتہ ہاتھ آگیا ہو کہنے لگا "یہ ناچیز بس ایک بات اور کہے گا اس کے بعد امیر کو اختیار ہو گا کہ چاہیں تو معاف کر دیں اور نہ چاہیں تو سزا دے دیں!"

تیمور نے اجازت دی "عرض کیا جائے!"

حسن تاباں نے جواب دیا "حضور والا! اگر یہ ناچیز اس بات کا دعوا کرے کہ امیر کو ترک بادشاہ پر فتح اس حقیر کے طفیل حاصل ہوئی ہے تو بے جا نہ ہو گا!"

حاضرین اس کے اس دعوے پر حیران رہ گئے اور تیمور ششدر اس کی صورت دیکھنے لگا، پوچھا "وہ کس طرح؟"

حسن تاباں نے جواب دیا "ادھر کچھ عرصے سے یہ ناچیز ایسا محسوس کر رہا ہے کہ جس فوج میں یہ شامل ہو گا۔ اس کی شکست یقینی ہو جائے گی اگر میں خدانخواستہ امیر کی فوج میں ہوتا تو معلوم نہیں جنگ کا کیا نتیجہ نکلتا یہ تو ایک طرح سے اچھا ہی ہوا کہ میں ترک فوج میں شامل ہو گیا اور میری شمولیت کی وجہ سے ترک فوج امیر سے شکست کھا گئی!"

حاضرین ہنسنا چاہتے تھے لیکن تیمور کی پُر رعب شخصیت انھیں سنجیدہ رکھے ہوئے تھی، تیمور کو اس عجیب و غریب فتح و شکست کی تاویل پر واقعی ہنسی آگئی۔ اس نے خواجہ نصیرالدین سے کہا۔

"خواجہ! اگر ہمیں خدا نے یہ احمق نہ عطا کیا ہوتا تو ہم تمھیں اپنے ساتھ سمرقند ضرور لے جاتے!"

خواجہ نے افسوس سے کہا "کیا امیر نے اس خاکسار کو احمقوں میں شمار کیا ہے؟ حالانکہ میں اپنی پوری زندگی میں کسی حماقت کا مرتکب نہیں ہوا، ہاں سوائے ایک حماقت کے، وہ ایک حماقت یہ ہے کہ میں احمقوں کے درمیان پیدا ہو گیا!"

تیمور نے حسن تاباں کو حکم دیا "اگر ہماری فتح و شکست کا انحصار تیری موجودگی اور عدم موجودگی ہی پر ہے تو تو اسی وقت ہماری فوج سے نکل جا، اور دوبارہ اپنی منحوس صورت مت دکھانا!"

حسن تاباں دلوانہ وار خیمے سے باہر نکلا اور ایک جگہ کھڑے ہو کر فیضی کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد جب فیضی واپس آیا تو اس سے کچھ زادِ راہ اور ایک گھوڑا طلب کیا۔ فیضی اسے اپنے خیمے میں لے گیا خیمے کے دوسرے حصے میں الجاتی کی موجودگی کا احساس ہو رہا تھا۔ کچھ دیر رک کر اس بات کی کوشش کی کہ کسی طرح آخری بار الجاتی کی زمزمہ بار آواز سن لے لیکن اس کی کھانسی یا کھنکار تک سے محروم رہا، اسے یہ معلوم ہی ہو چکا تھا کہ تیمور نے فیضی کو عقل و دانش کے بیطر کا خطاب عطا کیا ہے اور یہ وہ خطاب تھا جس کا وہ خود ایک عرصے سے متمنی تھا۔ اسے اپنی محرومی کا سخت ملال تھا حالانکہ بیطر تو وہ خود بھی تھا لیکن بلا نوشی اور گستاخی کا اور شاید حماقت مآبی کا بھی۔

اس نے رخصت ہوتے ہوتے اتنی بلند آواز میں کہ وہ الجاتی کے کانوں تک بھی پہنچ جائے فیضی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "اے عقل و دانش کے بیطر! بلا نوشی اور بے باکی کا بیطر تمھیں الوداع کہہ رہا ہے خدا تمھیں خوش رکھے اور تمھارے ساتھ ہی اس کو بھی جس کی میں آخری بار آواز تک نہ سن سکا!"

کرشن چندر نے یہ تحریر لکھی تھی۔ جو قطبین کے درمیان بسنے والے تمام انسانوں سے تعلق رکھتی ہے۔ کرشن چندر نے کیا لکھا ہے ــ کرشن چندر کیا نہیں لکھتے۔ انھیں بات کہنے اور دل میں اتر جانے کا فن آتا ہے

واسنت مراٹھے کی شادی شاردا دلیسائی سے ہوئی تھی۔ شاردا گجراتن تھی اور واسنت مراٹھا تھا اور یہ شادی کبھی نہ ہوتی۔ اگر واسنت کے باپ رام مراٹھے کا چمبور میں لالٹین بنانے کا کارخانہ نہ ہوتا اور اس کے کارخانے کے قریب شاردا کا باپ مگن لال دیسائی اپنا کانچ کا کارخانہ کھڑا نہ کرتا۔ رام مراٹھے کے کارخانے میں لالٹین بنانے کا سارا سامان تیار ہوتا تھا سوائے کانچ کے ہنڈے کے، اور یہ ہنڈا دلیسائی گلاس ورکس سے آتا تھا، اس لیے واسنت اور شاردا کی شادی کیا ہوئی گویا گھر کی لالٹین مکمل ہو گئی۔

واسنت ناٹے قد کا گٹھے ہوئے جسم کا نوجوان تھا اور دور سے بالکل اپنے کارخانے کی لالٹین کی طرح مضبوط، چوڑا اور سانولا نظر آتا تھا۔ شاردا گورے رنگ کی، لانبے قد کی بڑی بڑی آنکھوں والی نازک بدن کانچ کی گڑیا سی دکھائی دیتی تھی۔ شادی کے بعد دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہو گئی کیونکہ ہندوستان میں شادی پہلے ہوتی ہے۔ محبت بعد میں ہوتی ہے۔ یورپ میں محبت پہلے ہوتی ہے شادی بعد میں ہوتی ہے، بچہ دونوں صورتوں میں پیدا ہوتا ہے۔

واسنت اور شاردا کے دو بچے تھے۔ لکشمن اور کملا۔ لکشمن چھ سال کا تھا۔ کملا چار سال کی تھی۔ دونوں میاں بیوی بڑے مزے میں اپنے بچوں کے ساتھ چار بیڈ روم کے ایک فلیٹ میں رہتے تھے جس کا نام لالٹین ہاؤس تھا۔ یہ فلیٹ مگن لال دلیسائی نے اپنی بیٹی کو جہیز میں دیا تھا۔ جس دن لکشمن پیدا ہوا، اس دن اس کے دادا رام مراٹھے نے اپنے پوتے کے پیدا ہونے کی خوشی میں لالٹینوں کے ساتھ ساتھ لوہے کے ڈرم بنانے کا کارخانہ بھی چالو کر دیا۔ پھر جس دن شاردا کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی اس دن لڑکی کے نانا نے تھرمامیٹر بنانے کا کارخانہ بھی شروع کر دیا اور مگن لال دلیسائی نے اپنے کارخانے کا سب سے پہلا بیرومیٹر واسنت اور شاردا کے گھر میں لگا دیا تاکہ دونوں میاں بیوی کو ایک دوسرے کے ٹمپریچر کا اندازہ ہوتا رہے۔

سب رنگ کی منتخب کہانیاں اردو ادب کا عطر ہیں

اس شمارے کے لیے بطورِ خاص تین شاہکار کہانیاں

شادی کی زندگی کے سات سال بڑے مزے میں کٹ گئے۔ پھر جس دن رنگا ریڈی نے صابن بنانے کا کارخانہ سائین میں چالو کیا اور سردار چانن سنگھ نے دادر میں دی گریٹ مون شائین فلم کمپنی کا مہورت کیا اسی دن بمبئی میں ایک طوفان اٹھا، ہنگامہ ہوا، گولی چلی، ٹراموں پر پتھراؤ ہوا، سینکڑوں لوگ زخمی ہوئے اور دوسرے دن اخبار دیکھ کر واسنت کی آنکھیں غصے سے لال ہوگئیں اور اس نے اخبار کو زور سے ناشتے کی میز پر پٹخ دیا اور بولا۔ "چھ ؟"

"سوں چھے ؟" شاردا بولی۔

واسنت نے کہا۔ "یہ اخبار بولتا ہے کہ بمبئی اکیلی مراٹھوں کی نہیں ہے لیکن سب جانتے ہیں کہ بمبئی ہماری ہے۔ ہمیشہ ہماری رہے گی، ہم مراٹھوں کی !"

شاردا نرمی سے بولی۔ "ہاں ہاں بمبئی تمہاری ہے، بے شک تمہاری ہے لیکن وہ ہماری بھی تو ہے، ہم گجراتیوں کی۔"

"واہ بمبئی تمہاری کیسے ہوگئی ؟ بمبئی تو مراٹھوں کی ہے۔"

"نہیں وہ گجراتیوں کی ہے۔" شاردا ذرا غصے سے بولی۔ "یہ سارا شہر ہم نے بنایا ہے۔ اس کا بزنس ہم نے چلایا ہے۔ اس کا کارخانہ ہم نے لگایا ہے...... تم کدھر سے حق جتانے لگے ہماری بمبئی پر ؟"

"شہر تم نے بنایا ہے ؟ لیکن اس شہر کو بسایا کس نے ہے ؟ بزنس ضرور تم نے چلایا ہے لیکن وہ بزنس پھیلایا کس نے ہے ؟ کارخانہ لگایا تم نے ہے لیکن کارخانے میں کام کون کرتا ہے ؟ ہمارے مہاراشٹر کا مزدور یہ سمجھیں ؟ بمبئی آپچی آہے۔" واسنت نے آملیٹ چھری سے کاٹتے ہوئے کہا۔

"نا بمبئی اماری چھے !" شاردا دیچی ٹیبل کٹلس پر نمک چھڑک کر بولی۔

"تمی گدری کھوٹا بولتا !"

"تمے جیسے کہو چھے، تے جھوٹو چھے۔ شدن جھولوٹ چھے !"

"بمبئی آپچی آہے۔"

"نا۔ماری چھے !"

واسنت نے چائے کا چمچہ زور سے میز پر پٹخ دیا۔ شاردا نے چھری کانٹے پلیٹ میں پھینک دیئے۔ دونوں ناشتے کی میز سے اٹھ کر اپنے اپنے کمروں میں جاکر بند ہوگئے۔ بچے سہم کر سسکنے لگے۔ جب اس جھگڑے کی خبر مگن لال دیسائی اور رام مراٹھے تک پہنچی تو دونوں بوڑھے نوجوان میاں بیوی کی حماقت پر بڑے ہنسے۔ رام مراٹھے نے مسکرا کر کہا۔

"مگن بھائی ! ہمارے بچے بھی کس قدر بھولے ہیں۔ نہیں جانتے کہ مہاراشٹر بن جائے چاہے گجرات الگ ہو جائے مگر گجراتیوں کو مراٹھوں کی ضرورت رہے گی اور مراٹھوں کو گجراتیوں کی۔"

"ہاں جیسے تمہاری لالٹین کو میرے کانچ کے ہنڈے کی ضرورت ہوتی ہے اور میرے کانچ کے ہنڈے کو تمہاری لالٹین کی۔" مگن لال دیسائی نے ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

"بالکل۔" رام مراٹھا سر ہلا کر بولا۔

"تو چلو اچل کر ان دونوں بے وقوفوں کو سمجھائیں۔" مگن لال دیسائی نے تجویز پیش کی اور دونوں بزرگ اسی وقت اپنی اپنی آرام کرسیوں سے اٹھے اور موٹر میں بیٹھ کر لالٹین نواس پہنچے اور وہاں جاکر واسنت اور شاردا کو سامنے بٹھا کر سمجھانے لگے۔ واسنت کے باپ نے اپنے بیٹے کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "شرم نہیں آتی۔ میری بہو کو تنگ کرتا ہے۔"

مگن بھائی نے شاردا سے کہا۔ "نالائق اپنے پتی سے جھگڑا کرتی ہے ؟"

"میں تو جھگڑا نہیں کرتی پتا جی !" شاردا سسکتے ہوئے بولی۔ "یہی جھگڑا کرتے ہیں۔ بولتے ہیں تم گجراتی لوگ بہت خراب لوگ ہوتے ہو، ہمیشہ ہم مراٹھوں کا حق مارتے رہتے ہو۔"

"ایسا ؟" مگن لال دیسائی چوکنا ہو کر واسنت کی طرف دیکھنے لگا۔ واسنت نے سر جھکا کر اپنے باپ سے کہا۔ "پتا جی ! شاردا کہتی ہے کہ اکھا بمبئی گجراتی لوگوں نے بنایا ہے اور اس شہر کا سارا بزنس اس کا سارا دھندا گجراتی لوگ چلاتے ہیں۔ شاردا بولتی ہے کہ ہم گجراتی لوگ نہ ہوں تو مراٹھے بھوکے مر جائیں۔"

"ایسا ؟" رام مراٹھے نے شاردا کی طرف گھور کر دیکھا اور گرج کر پوچھا۔ "کیا تم نے ایسا کہا تھا ؟" اور یہ کہتے کہتے رام مراٹھے غصے سے کھڑا ہو گیا۔ پیشتر اس کے کہ شاردا کوئی جواب دیتی، اس کے باپ نے اسے پیچھے دھکیل دیا اور خود رام مراٹھے کے سامنے کھڑا ہو کر کہنے لگا۔ "اگر میری بیٹی نے نہیں بھی کہا تو میں اب کہتا ہوں کہ اس نے جو کہا ہے، وہ بالکل ٹھیک کہا ہے"

رام مراٹھے دانت پیستے ہوئے آگے بڑھا اور بولا۔ "اگر تمہاری بیٹی نے ٹھیک کہا ہے تو میں کہتا ہوں کہ میرے بیٹے نے بھی جو کہا ہے سو فی صد ٹھیک کہا ہے۔ بمبئی آپچی آہے۔"

"بمبئی اماری چھے !" مگن لال دیسائی نے چلا کر کہا اور شاردا کا ہاتھ پکڑ کر غصے سے بولا۔ "چل بیٹی اپنے گھر چل، ہم کوئی ایسے گرے پڑے نہیں ہیں کہ تجھے پناہ نہ دے سکیں۔"

"جاتے ہو تو جاؤ۔" رام مراٹھے اپنی چھڑی ہوا میں گھما کر بولا۔ "مگر کہے دیتا ہوں دوبارہ اس گھر میں گھسے تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔"

"بڑے آئے ٹانگیں توڑنے والے۔ جیسے بمبئی تمہارے باپ کی ہے"

واسنت کا باپ گرج کر بولا۔ "جے مہاراشٹر۔"

"جے مہا گجرات !" مگن لال دیسائی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا اور

اپنی بیٹی اور بچوں کو لے کر فلیٹ سے باہر نکل گیا۔

آج واسنت کے فلیٹ میں اندھیرا تھا۔ شاردا کو گھر چھوڑے ہوئے ایک سال ہو گیا تھا۔ ایک سال سے واسنت نے نہ شاردا کی صورت دیکھی تھی نہ اپنے بچوں کی۔ اس ایک سال میں بہت کچھ ہو گیا تھا۔ بڑے بڑے آندولن چلے، آپس کے لڑائی جھگڑے ہوئے مگر آخر میں سمجھوتا ہو گیا۔ بمبئی کا صوبہ تقسیم ہو گیا۔ گجرات کا صوبہ الگ بن گیا۔ مہاراشٹر کا صوبہ الگ وجود میں آیا۔ پارلیمنٹ نے بھی بل پاس کر دیا۔ ہر چیز طے ہو گئی، ختم ہو گئی۔ ساری نفرتیں اور کدورتیں دھو ڈالی گئیں اور آج ۲۹ اپریل کو تو روشنیوں کا دن تھا۔ گانے، ناچ، جلسے جلوس، ہنگامے، قل غپاڑے، تماشے، مشاعرے، کوی سمیلن، نعرے، ڈھول تاشے، باجے گاجے۔ لوگوں نے آج ساری بمبئی میں روشنی کی تھی اور اسے دلھن کی طرح سجا دیا تھا مگر واسنت کے اپنے فلیٹ میں اندھیرا تھا، شام ہو چکی تھی۔ سڑکوں کے دو رویہ درختوں پر بجلی کے ہزاروں قمقمے جگمگا رہے تھے۔ ہواؤں میں خوشبو تھی، فضاؤں میں قہقہے تھے، عورتیں آنکھوں میں کاجل لگائے، جوڑے میں شیونتی کی ڈیپی سجائے ہوئے بچوں کو انگلی سے لگائے اس کے فلیٹ کے نیچے سے گزر رہی تھیں۔

واسنت کا دل اپنی بیوی بچوں کی یاد سے بے چین ہو اٹھا۔ کئی بار اس سے پہلے بھی اس نے سوچا تھا کہ وہ احمد آباد جائے اور اپنی بیوی سے صلح کر کے اسے بچوں سمیت واپس بلا لائے مگر ہر بار ایک جھوٹی عزت اس کا دامن پکڑ کر روک لیتی تھی۔ آج اسے نہ صرف شاردا بلکہ اپنے پیارے بچے بھی کتنے یاد آ رہے تھے۔ ننھا لکشمن اور بھولی کملا۔ ان دونوں معصوم بچوں کی صورتیں گویا اس کے دل کا دامن پکڑنے لگیں اور وہ سوچنے لگا بھلا اس نے کیوں اپنی بیوی سے جھگڑا کیا۔ بلا وجہ ہی اپنا گھر برباد کیا۔ بھلا کیوں؟ بمبئی کے مہاراشٹر میں آ جانے سے کیا اس کی صورت بدل گئی ہے؟ کیا اس کا میرین ڈرائیو اٹھ کر پونا چلا گیا ہے؟ کیا ٹرام کا ایکٹر ناگپور بھیج دیا گیا؟ کیا فورٹ کا علاقہ ناگپاڑے میں آباد کر دیا گیا ہے؟ کیا آج بھی لوگ سڑکوں پر نہیں سوتے؟ غلیظ کھولیوں میں نہیں رہتے؟ دکھ اور درد کا درماں نہیں ڈھونڈتے؟ مفلسی اور موت کا سامنا نہیں کرتے؟ پھر کس لیے اس نے اس قدر جذباتی ہو کر اپنی پیاری بیوی سے جھگڑا کر لیا اور اپنے بچوں کو اپنے آپ سے دور کر دیا؟

آج ہر گھر میں روشنی ہے صرف اس کے گھر میں اندھیرا ہے اور اس کے دل میں ہمت باقی نہیں ہے کہ اپنے اندھیرے کونے سے اٹھ کر ایک بتی بھی روشن کر دے۔ وہ دیر تک اسی طرح جلتا کڑھتا، سوچتا رہا اور اندھیرے کونے میں آرام کرسی پر آنکھیں بند کیے، ٹانگیں سکیڑے لیٹا رہا اور اس کے چاروں طرف خوشیوں کا جلوس گزرتا رہا۔ دو تین بار اس کے کانوں میں آواز سی آئی جیسے کوئی اس کے فلیٹ کا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہو مگر آج وہ کسی سے ملنا نہ چاہتا تھا، اس لیے وہ اٹھ کر دروازے تک بھی نہ گیا۔ جو بھی ہوگا خود ہی دروازہ پیٹ کر چلا جائے گا یا بہت ہی ڈھیٹ ہوگا تو خود ہی اندر آ جائے گا۔ پھر یکایک اس کے کانوں میں ایک آواز آئی: ”ارے آج خوشیوں کے روز یہاں اس قدر اندھیرا کیوں ہے؟“ اور اس آواز کے ساتھ ساتھ ایک بتی جلی اور اس بتی کی روشنی میں واسنت نے دیکھا کہ دروازے میں شاردا بچوں کو انگلی سے لگائے کھڑی ہے اور مسکرا رہی ہے۔

ایک لمحے کے لیے چونک کر اس نے شاردا کی طرف دیکھا جیسے اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آ رہا ہو۔ پھر وہ یک لخت اپنی کرسی سے اٹھا اور دوڑ کر دروازے کی طرف گیا اور جھپٹ کر اس نے جلدی سے اپنے دونوں بچوں کو گود میں اٹھا لیا اور انھیں پیار کرنے لگا۔

شاردا نے یکایک منہ پھیر لیا اور بالکونی کے جنگلے کے قریب جا کر بولی: ”شرم نہیں آتی ہے لوگوں کو مہاراشٹر کے جنم دن پر میرے گھر میں اندھیرا کرتے ہیں۔“

واسنت کچھ نہ بولا مگر اس کی نگاہوں میں خوشی کے دیے قطار اندر قطار مسکرانے لگے پھر وہ دھیرے سے اپنی بیوی کے قریب گیا اور سر جھکا کے بولا: ”شاردا! مجھے یقین نہیں آتا کہ تم آ گئی ہو؟“

شاردا نے بالکونی پر مٹی کے دیوں میں تیل ڈالتے ہوئے کہا: ”کیوں نہ آتی! کیا یہ میرا گھر نہیں ہے؟ کیا یہ بمبئی شہر میرا نہیں ہے؟“ شاردا نے بے خوف نگاہوں سے واسنت کی طرف دیکھ کر کہا: ”بمبئی آج بھی آپ ہے۔“

واسنت نے مسکرا کر کہا: ”تمھاری سچے! تدن تمھاری سچے!! نہ صرف بمبئی تمھاری ہے، یہ گھر بھی تیرا ہے اور میں خود بھی تیرا ہوں۔ اگر یقین نہ آئے تو اسٹامپ پیپر پر لکھوا لو۔“

شاردا کا چہرہ خوشی سے گلنار ہو گیا۔ اس نے اپنا سر واسنت کے کندھے پر رکھ دیا اور جذبات سے کانپتی ہوئی بولی: ”میں نے غلطی کی جو یہاں سے چلی گئی۔ میں بھول گئی کہ اس دیس میں نہ کچھ تیرا ہے نہ میرا۔ یہ سارا دیس ہمارا ہے اور یہاں جتنے بھی مراٹھے اور گجراتی، پنجابی اور سندھی، بنگالی، نیپالی، ہندو اور مسلمان، سکھ اور عیسائی، یہودی اور پارسی رہتے ہیں، ایک ہی ماں کے بیٹے ہیں۔ گو صوبے الگ الگ ہیں مگر گھر ایک ہے، میں گجراتی ہوں، تم مراٹھے ہو مگر ہم دونوں کا مستقبل ایک ہے۔“

واسنت نے مسکرا کر شاردا کو اپنے گلے سے لگا لیا اور پھر بچوں کو لے کر باہر بالکونی میں آ گیا جہاں ان کے چاروں طرف روشنی ہی روشنی تھی۔

”جاڑے کی چاندنی“ — ”آنندی“
— ”گوندنی والا تکیہ“ — اور
— ”جزیرۂ سخنوران“ —
کے مصنف، اردو کے مایۂ ناز ادیب
غلام عباس کی ایک مختصر کہانی
— دو تماشے — روپ سروپ۔

مرزا برجیس قدر کو میں ایک عرصے سے جانتا تھا۔ ہر چند ہماری طبیعتوں اور ہماری سماجی حیثیتوں میں بڑا فرق تھا۔ پھر بھی ہم دونوں دوست تھے۔ مرزا کا تعلق ایک ایسے گھرانے سے تھا جو کسی زمانے میں بہت معزز اور متمول سمجھا جاتا تھا مگر اب اس کی حالت اس پرانے تناور درخت کی سی ہو گئی تھی جو اندر ہی اندر کھوکھلا ہوتا چلا جاتا ہے اور آخر ایک دن اچانک زمین پر آ رہتا ہے۔

مرزا کو اپنے خاندان کے اس زوال کا پورا احساس تھا مگر اسے روکنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ البتہ جہاں تک ظاہری رکھ رکھاؤ کا تعلق تھا۔ مرزا اس میں ذرا سی کوتاہی بھی نہ ہونے دیتا تھا۔ اس کے دل میں نہ جانے کیوں یہ خیال بیٹھ گیا تھا کہ خاندان کا وقار قائم رکھنے کے لیے درشت مزاجی اور تحکم لازمی ہیں۔ اس خیال نے اسے سخت دل بنا دیا تھا مگر یہ درشتی اور سختی اوپر ہی اوپر تھی، اندر سے مرزا بڑا نرم تھا اور یہی ہماری دوستی کی بنا تھی۔

ایک دن سہ پہر کو میں اور برجیس قدر انار کلی میں اس کی شان دار موٹر میں بیٹھے ایک مشہور جوتے والے کی دکان سے سلیم شاہی جوتا خرید رہے تھے۔ مرزا نے اپنا ٹھاٹھ دکھانے کے لیے یہ ضروری سمجھا تھا کہ موٹر میں بیٹھے بیٹھے دکان کے مالک کو پکارے اور جوتے اپنی موٹر ہی میں ملاحظہ کرے۔ شہر میں ابھی مرزا کی ساکھ قائم تھی اور دکان دار عام طور پر اس کی بد دماغیاں سہنے کے عادی تھے چنانچہ جوتے والے نے اپنے دو کارندے مرزا کی خدمت پر مامور کر دیے مگر مرزا کو کوئی جوتا پسند نہیں آ رہا تھا اور وہ بار بار ناک بھوں چڑھا کر ان کارندوں کو سخت و سست کہہ رہا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے مرزا کو دراصل جوتے کی ضرورت ہی نہیں اور یہ جھوٹ موٹ کی خریداری محض بھرم رکھنے کے لیے ہے۔

عین اس وقت ایک بڈھا بھکاری ایک پانچ سالہ لڑکی کے کندھے پر ہاتھ رکھے مرزا کی موٹر کے پاس آ کھڑا ہوا۔ یہ بڈھا اندھا تھا۔ لڑکی کے بالوں میں تنکے الجھے ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا مدت سے کنگھی نہیں کی گئی۔ دونوں کے تن پر چیتھڑے لگے تھے۔ ”اندھے پر ترس کھاؤ رے بابا۔“ بڈھے نے ہانک لگائی۔

”بابو جی میں بھوکی ہوں۔ پیسہ دو۔“ لڑکی نے لجاجت سے کہا۔

مرزا نے ان لوگوں کی طرف توجہ نہ کی۔ وہ بدستور جوتوں پر تنقید کرتا رہا۔ اندھے فقیر اور لڑکی نے اپنا سوال دہرایا۔ اس پر مرزا نے ایک نگاہ غلط انداز ان پر ڈالی اور کہا: ”معاف کرو۔ معاف کرو۔“

بھکاری اب بھی نہ ٹلے۔ ”بابو جی رات سے کچھ نہیں کھایا ہے۔“ اندھے نے کہا۔

”بابو جی بڑی بھوک لگ رہی ہے، پیٹ میں کچھ نہیں ہے لو دیکھو۔“ بچی نے کہا اور جھٹ میلا کچیلا کرتا اٹھا کر اپنا پیٹ دکھانے لگی۔ لاغری سے بچی کی پسلیاں باہر نکلی ہوئی تھیں اور گنی جا سکتی تھیں۔ ”بس ایک پیسے کے چنے بابو جی۔“

مرزا کو اس لڑکی کا میلا میلا پیٹ دیکھ کر گھن سی آئی۔ ”توبہ توبہ۔“

اُویس قرنی

اپنی آخری عمر میں کوفہ آگئے تھے اور دریائے فرات کے کنارے عبادت کیا کرتے تھے۔ ایک دن اُس عہد کے مشہور بزرگ ہرم بن حبانؒ، اویسؒ سے مُلاقات کو گئے اور "السلام علیکم" کہہ کر بیٹھ گئے۔ اویس قرنیؒ سے یہ اُن کی پہلی مُلاقات تھی۔ اُن کے سلام پر اویس قرنیؒ نے اُن کا نام لے کر جواب دیا "وعلیکم السّلام یا ہرم بن حبّانؒ!"

ہرم بن حبّانؒ نے حیرت سے کہا "حیرت ہے۔ آپ کو میرا اور میرے باپ کا نام کس طرح معلوم ہوا؟"

اویس قرنیؒ نے بے نیازی سے جواب دیا "اہل ایمان کی رُوحیں ایک دُوسرے کو پہچانتی ہیں۔ فرمایئے کیسے آنا ہُوا؟"

ہرمؒ نے کہا "میں آپ کے پاس سکُون کی خاطر حاضر ہُوا تھا۔"

اویس قرنیؒ نے جواب دیا "اللہ کے سوا کہیں اور سکون مت تلاش کیجیے، سکون کی تلاش میں آپ غلط جگہ چلے آتے ہیں!"

ہرمؒ نے شرمندگی سے کہا "بجا ارشاد، کچھ نصیحت فرمایئے!"

اویس قرنیؒ نے فرمایا "سوتے وقت موت کو سرھانے اور بیداری میں آنکھوں کے سامنے رکھو، گناہ کو حقیر نہ سمجھو، کیونکہ یہ اللہ کی توہین ہے!"

ہرمؒ اور زیادہ شرمندہ ہوتے، کہا "دُعا فرمایئے کہ اللہ رزق میں کسی کا محتاج نہ کرے!"

اویسؒ نے جواب دیا "جس شخص کو اللہ کی رزاقی پر اتنا شک ہو، اس کے لیے کیا دُعا کروں؟"

اس نے بیزاری کے لہجے میں کہا "بھیک مانگنے کے لیے کیا کیا ڈھونگ رچاتے جلتے ہیں۔ جاؤ جاؤ بابا خدا کے لیے معاف کرو۔"

مگر فقیر اب بھی نہ گئے۔ قریب تھا کہ مرزا غصّے سے پھٹا جاتا مگر یہ تماشا اس طرح ختم ہو گیا کہ مرزا کو اس دکان دار کا کوئی جوتا پسند نہ آیا اور وہ اپنی موٹر وہاں سے بڑھا لے گیا۔

اس واقعے کے چند روز بعد میں اور مرزا برجیس قدر شہر کے ایک بڑے سینما میں ایک دیسی فلم دیکھ رہے تھے۔ فلم بہت گھٹیا تھی، اس میں بڑے نقص تھے مگر ہیروئن میں بڑی چمک دمک تھی اور وہ گاتی بھی خوب تھی۔ اس نے فلم کے بہت سے عیوب پر پردہ ڈال دیا تھا۔ کہانی بڑی دقیانوسی تھی۔ اس میں ایک واقعہ یہ بھی تھا کہ بنک کے ایک چپراسی کو اس الزام میں کہ اس نے بنک لوٹنے میں چوروں کی مدد کی، پانچ سال قید کی سزا ہو جاتی ہے۔ اس چپراسی کی بیوی مر چکی ہے مگر اس کا ایک چار سالہ بیٹا ہے جو اپنی بوڑھی دادی کے پاس رہتا ہے۔ چپراسی کے قید ہو جانے پر یہ دادی پوتا بھوکوں مرنے لگتے ہیں۔ ادھر کوٹھری کا کرایہ نہ ملنے پر مالک مکان انھیں گھر سے نکال دیتا ہے۔ بڑھیا پوتے کا ہاتھ پکڑ کر بازار میں بھیک مانگنے لگتی ہے۔ وہ ہر راہ گیر سے کہتی ہے۔ "بابوجی ہم بھوکے ہیں۔"

"ایک پیسے کے چنے لے دو بابوجی۔" لڑکا کہتا ہے۔

جب فلم اس مقام پر پہنچی تو مرزا برجیس قدر نے اندھیرے میں مجھ سے کہا "بھیا ذرا اپنا رومال تو دینا، نہ جانے میرا کہاں گر گیا۔"

میں نے اپنا رومال دے دیا۔ جب تک تماشا ہوتا رہا، میں نے مرزا کو سخت بے چین دیکھا۔ وہ بار بار کرسی پر پہلو بدلتا اور ہاتھ چہرے تک لے جاتا۔ خدا خدا کر کے فلم ختم ہوئی تو میں نے دیکھا کہ وہ جلدی جلدی آنکھیں پونچھ رہا ہے۔ "ایں، مرزا صاحب!" میرے منہ سے بے اختیار نکلا "آپ رو رہے تھے؟"

"نہیں تو" مرزا نے بھرّائی ہوئی آواز میں جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ "آنکھوں کو ذرا سگریٹ کا دھواں لگ گیا تھا..... اور بھئی میں یہ سوچ رہا ہوں کہ سرکار ایسے دردناک فلم دکھانے کی اجازت کیوں دیتی ہے؟" ▲

جاڑوں کی رات تھی۔ سرِشام ہی سناٹا پڑ گیا تھا۔ میری ہمیشہ کی عادت ہے کہ دیر سے سوتا ہوں۔ اوّل شب کبھی نیند نہیں آتی۔ اس روز بھی ایسا ہی ہوا۔ گھر کے اور لوگ تو کبھی کے اپنے اپنے بستروں پر جا چکے تھے۔ میں کچھ دیر تک تو ایک جاسوسی ناول پڑھتا رہا، اس کے بعد یوں ہی بیٹھے بیٹھے گنگنانے لگا ؎

چھُٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا!! نہ پھول تھے، نہ چمن تھا، نہ آشیانہ تھا
اے باغباں تجھے کیا کیا نشاں بتلاؤں ......

دوسرے شعر کا مصرع ثانی اب یاد نہیں، غالباً محمد علی جوہر کی غزل
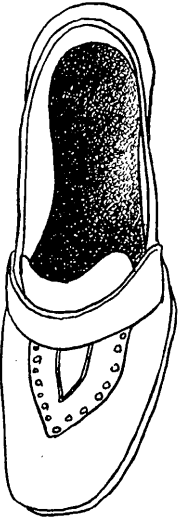
تیسری کہانی

"خدا کی بستی" کے خالق شوکت صدیقی کے قلم سے

ایک زہریلی کہانی

کا شعر ہے۔ اُن دنوں فلم "ذیوداس" نئی نئی ریلیز ہوئی تھی۔ سہگل کے گانوں سے گلی کوچے گونج رہے تھے۔ جسے دیکھیے الاپ رہا ہے۔ "بالم آئے بسو مورے من میں۔" لیکن یہ غزل پہاڑی سانیال نے گائی تھی۔ فلم میں تو مجھے یہ گانا زیادہ پسند نہیں آیا مگر نہ جانے کیوں اس وقت میں اسے گنگنانے لگا۔ ہوسکتا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ میں کئی سال بعد لکھنؤ واپس آیا تھا۔ پُرانا مکان چھُوٹ چکا تھا اور نئے مکان میں یہ میری پہلی شب تھی۔ پچھلے گھر سے بہت سی ایسی یادیں وابستہ تھیں جن کے اظہار کا یہاں موقع نہیں۔

گنگناتے گنگناتے مزے میں جو آیا تو اُونچے سُروں میں گانے لگا میرا کمرہ سب سے الگ تھلگ سڑک کے رُخ پر تھا۔ اس لیے یہ بھی خدشہ نہیں تھا کہ گھر میں کسی کی نیند خراب ہوگی۔ پوری غزل ابھی ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ ایکا ایکی کسی نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ میں لحاف میں دبکا دبکایا بیٹھا تھا۔ باہر نکلنے کو جی نہ چاہا۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے پوچھا "کون ہے؟"

باہر سے آواز آئی "ذرا دروازہ تو کھولیے۔"

لہجہ میرے لیے بالکل اجنبی تھا۔ خدا معلوم کون اس جاڑے پالے میں نازل ہوا تھا۔ بادلِ نخواستہ لحاف چھوڑا اور سردی سے کپکپاتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔ دروازہ کھولا تو سامنے ایک ادھیڑ عمر کا آدمی کھڑا تھا۔ جنگلی کبوتر کی سی سُرخ سُرخ آنکھیں، موٹی سی ناک گھنی مونچھیں، سر پر لکھنوی بانکوں کے سے پٹھے، چہرے پر عجیب سی کرختگی۔ بڑا ہی بدشکل آدمی تھا۔ ایک بار اس نے نظر بھر کر دیکھا اور بڑی بے تکلفی کے ساتھ کمرے میں آگیا۔ اس نے اپنی پرانی اُونی شال اچھی طرح جسم کے گرد لپیٹی اور اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں ابھی تک خاموش کھڑا تھا۔ مجھے اس طرح حیرت زدہ دیکھ کر کہنے لگا۔ "کھڑے کیوں ہیں بیٹھ جائیے۔"

میں نے قریب پڑی ہوئی کرسی کھسکائی اور چپ چاپ اس پر بیٹھ گیا۔ میرے بیٹھتے ہی اس نے پَیر سے جوتا نکالا اور میرے سامنے ڈال دیا۔ بڑی عاجزی سے بولا۔ "دس جوتے مار دیجیے۔"

میں سٹ پٹا کے رہ گیا، یا اللہ یہ کیا مصیبت آئی؟ مجھے خاموش دیکھ کر اس نے اور بھی رقت آمیز لہجے میں کہا۔ "اجی دیکھ کیا رہے ہیں؟ اٹھائیے نا جوتا۔" پھر اس نے سر سے ٹوپی اتاری اور گردن جھکا کر بولا "لیجیے یہ سر حاضر ہے۔"

جی تو چاہا کہ دس کے بجائے تڑا تڑ بیس جوتے لگاؤں سخت طیش آیا لیکن جس قدر مجھے طیش آرہا تھا، وہ اسی قدر بھیگی بلّی کی طرح مسکین بنا بیٹھا تھا۔ میری سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ کیا کہوں؟ عجیب افتاد پڑی تھی۔ ذرا غور تو کیجیے کہ ایک اچھا خاصا معمّر آدمی آپ کے سر ہو جائے کہ دس جوتے مار دیجیے اور وہ بھی خواہ مخواہ۔ ایسے موقع پر سوائے بدحواس ہو جانے کے اور ہو ہی کیا سکتا ہے؟ مجھے بھونچکا دیکھ کر وہ کہنے لگا۔ "نہیں مار سکتے؟" اس دفعہ اس کے لہجے میں تیکھا پن تھا۔ لمحے بھر وہ خاموش رہا۔ پھر اس نے اپنی سُرخ سُرخ وحشت زدہ آنکھوں سے گھُور کر مجھے دیکھا اور گردن اُونچی کر کے بولا۔ "تو پھر آیندہ یہ راگ نہ الاپیے گا۔"

اس نے میرے آگے عاجزی سے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ اس حرکت پر غصّہ بھی آیا، کچھ ہنسی بھی آئی۔ مجھے اپنے بے سُرے پن کا احساس کسی نے اتنی شدت سے نہیں دلایا تھا مگر بات کہنے کا اس نے جو انداز اختیار کیا تھا، وہ بڑا انوکھا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں توبہ کی کہ اب بھولے سے بھی کبھی نہیں گنگناؤں گا۔ اب سوال یہ تھا کہ وہ ہے کون؟ یہ معمّا ذرا دیر بعد اس نے خود ہی حل کر دیا۔ کہنے لگا۔ "معاف کیجیے گا یہ گستاخی۔ میں بہت دیر سے لیٹا ہوا آپ کی آواز سن رہا تھا۔ بہت ضبط کیا مگر مجبور ہوگیا تو آپ کے پاس چلا آیا۔ بات یہ ہے کہ مجھ کو بھی گانے بجانے سے کچھ لگاؤ ہے۔ جس دھن میں آپ گا رہے تھے وہ اساوری راگ ہے۔ اس کو یوں الاپتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے مدھم سُروں میں گنگنانا شروع کیا۔ کئی منٹ تک وہ ایک ہی مصرع الاپتا رہا۔ پھر اس نے اساوری پر ایک لمبا سا لیکچر دیا اور اپنی پرانی شال سنبھالتا ہوا اُٹھ کر کمرے سے چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں دیر تک سکتے کے سے عالم میں خاموش بیٹھا رہا۔ بار بار یہ خیال ستاتا رہا کہ یہ غزل تو بڑی مہنگی پڑی۔ بہر حال استاد شیدی سے یہ میری پہلی ملاقات تھی اور اس پہلی ہی ملاقات میں ان سے اس قدر متاثر ہوا کہ آج تک کبھی غسل خانے میں بھی گنگنانے کی ہمت نہیں ہوئی۔

دوسرے ہی دن مجھے پتہ چل گیا کہ نیا مکان جس قدر اچھا تھا، محلہ اسی قدر واہیات تھا۔ پاس پڑوس کے گھروں میں زیادہ تر کشمیری بھانڈ آباد تھے۔ عورتوں کی طرح ان کی لمبی لمبی چوٹیاں، مردانے لباس پر بڑی عجیب غریب معلوم ہوتیں لیکن جب وہ مجرا کرتے تو نوعمر لڑکوں کو تو پہچاننا مشکل ہو جاتا ہلکے گوٹے سے مزین لہنگا اور چولی پہن کر جب وہ زرتار دوپٹے کا گھونگھٹ نکال کر بھاؤ بتاتے تو طوائفوں تک کا رنگ پھیکا پڑ جاتا لیکن ان میں سب ناچنے والے نہیں تھے۔ بعض صرف نقل کرتے تھے اور ٹھٹول بازی کر کے اہلِ محفل کو ہنساتے تھے۔ جن کی عمریں ڈھل گئی تھیں، وہ محض گانا گاتے تھے یا کبھی کبھار کسی پرانے قدردان کی فرمائش پر مجرا بھی کر لیتے تھے ورنہ عام طور پر یہ نوجوان لڑکوں کا حصّہ تھا۔

اُن دنوں کرامت جان کا بڑا شہرہ تھا اور اسے یہ شہرت "چندراولی" کے کھیل کی بدولت ملی تھی جسے اس کی پارٹی بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کرتی تھی۔ کرامت جان خود چندراولی کا پارٹ ادا کرتا تھا۔ چھریرا جسم، تیکھے نقش، سبک، آواز میں سوز۔ چندراولی کے رُوپ میں جب وہ گاتا تو محفل میں سماں بندھ جاتا۔

سُنا ہے کہ اُستاد شیدی شروع شروع میں کرامت جان کے چچا فرحت جان کی ٹولی میں شامل تھے اور "چندراولی" کے کھیل میں ڈاکو دُبے سنگھ کا پارٹ ادا کرتے تھے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ جب وہ چہرے پر سیاہی مل کر اپنی سُرخ سُرخ انگارا سی آنکھیں نکال کر سپاہیوں کو ڈانٹتے اور طبلے کی تھاپ پر تان لگاتے۔ "رسّی کرو دراز، باندھو کمر میں چست،" تو ان کی پاٹ دار آواز سے محفل میں جان پڑ جاتی۔

تھے تو وہ ذات کے بھانڈ مگر ان کا تعلق کشمیری بھانڈوں کے نچلے طبقے سے تھا جنھیں عرفِ عام میں ڈھپالی کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ گانے بجانے کے بجائے عام طور پر طبلہ منڈھنے کا کام کرتے ہیں۔ استاد شیدی نے بھی لڑکپن میں طبلوں پر کھالیں منڈھی تھیں۔ مزاج میں تنک چڑھاپن ہمیشہ سے تھا۔ ایک روز کسی سے لاگ ڈانٹ پڑ گئی، بس اُسی روز پید سوار، پیے کی روزی پر لات مار کر کلن اُستاد کے ہاں جا پہنچے۔ وہ اپنے وقت کے مانے ہوئے سارنگی نواز تھے۔ جن لوگوں نے کلن استاد کے پاس انھیں دیکھا ہے، ان کا کہنا ہے کہ استاد شیدی نے استاد کی خدمت کا حق ادا کر دیا۔ چلمیں بھرنا اور ٹانگیں دبانا تو خیر معمولی بات تھی۔ بیماری کے زمانے میں انھوں نے استاد کو ہاتھوں پر تھکوایا تھا۔ تین چار میل روزانہ استاد کو پیٹھ پر پشتارے کی طرح اٹھا کر اسپتال لے جاتے تھے۔ مہینوں یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر کلن استاد کا مزاج، خدا کی پناہ، بگولا تھے بگولا غصّہ آگیا، پھر جو چیز سامنے آئی، وہ اٹھا کر کھینچ ماری۔ اس سے غرض نہیں کہ سر پھٹ گیا یا ٹانگ ٹوٹ گئی لیکن جب وہ پانچ سال کی ریاضت کے بعد کلن استاد کے ہاں سے نکلے تو اپنے فن میں کامل ہو کر نکلے۔

میں نے استاد شیدی کو جس وقت دیکھا، وہ کشمیری بھانڈوں کی سنگت چھوڑ چکے تھے اور طوائفوں کو تعلیم دیتے تھے۔ روزانہ سہ پہر کو وہ اپنے ٹیوشن پر جاتے، اس وقت ان کی وضع قطع یہ ہوتی۔ سر پر دو پلی ٹوپی، ڈھیلی ڈھالی اچکن، چوڑی دار پاجامہ اور براؤن پمپ شو اور بغل میں غلاف کے اندر لپٹی ہوئی سارنگی دبی ہوتی۔

چوک کی طوائفوں کو تعلیم دینے کے علاوہ استاد شیدی کے گھر پر بھی کچھ نوجوان گانا سیکھنے آتے تھے۔ گالیاں بکنے میں استاد شیدی کا جواب نہیں تھا۔ یہ خصوصیت انھیں اُستاد کلن سے ترکے میں ملی تھی۔ مزاج بھی کچھ ایسا ہی پایا تھا کہ ذرا سی بات پر برہم ہو جاتے۔ پھر یہ نہیں دیکھتے تھے کہ منہ سے کیا لفظ نکل رہا ہے۔ جو جی میں آتا اول فول بکتے چلے جاتے۔

گھر پر جو لوگ اُن سے تعلیم لینے آتے تھے۔ وہ زیادہ تر اعلا تعلیم یافتہ اور اچھے گھرانوں کے نوجوان تھے۔ ان میں نیپال کے شاہی خاندان کا ایک لڑکا تھا۔ رانا جوگندر بہادر نام تھا۔ بڑا ہنس مکھ اور مہذب نوجوان تھا۔ موسیقی سے بے حد لگاؤ تھا۔ یہی شوق کشاں کشاں لکھنؤ کھینچ لایا۔ مجھ سے بھی اس کی تھوڑی سی یاد اللہ ہوگئی تھی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بسنت پنچمی کے دوسرے دن کا ذکر ہے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا کسی کو خط لکھ رہا تھا۔ اُستاد کا مکان عین میرے کمرے کے مقابل تھا۔ درمیان میں دس فٹ کی سڑک تھی۔ ان کی بیٹھک کی ایک ایک بات مجھے سنائی پڑتی تھی۔ اس وقت وہ رانا جوگندر بہادر کو سبق دے رہے تھے۔ راگوں کے نام تو اب تک مجھے یاد نہ ہو سکے البتہ اتنا ضرور احساس ہے کہ اس روز وہ کوئی نیا راگ بتا رہے تھے۔ رانا بول ٹھیک سے ادا نہیں کر رہا تھا۔ اُستاد شیدی دو بار اسے ٹوک چکے تھے۔ ایکا ایکی وہ زور سے چیخے "ہوش میں ہے یا بھنگ چڑھا کر آیا ہے؟"

اس کے بعد انھوں نے رانا کو ایک بار پھر سمجھایا۔ دو تین بار خود اُونچے سُروں میں راگ کے بول نکالے مگر رانا سے پھر چوک ہوگئی۔ استاد نے بڑی ثقیل سی گالی دی اور ڈانٹ کر بولے۔ "پھر وہی پنچم میں۔ اب کی جو بہکا تو سالے کے حلق میں پورا گز (سارنگی کا گز) اتار دوں گا۔"

اس دفعہ استاد دیر تک الاپتے رہے۔ رُک رُک کر ہر بول پر سمجھاتے رہے۔ رانا جوگندر بہادر نے ایک بار پھر سارے گا ما پا دھا نی، الاپنا شروع کیا مگر بات بن نہ سکی۔ اُستاد جل کر بولے۔ "دھت تیری کی۔ تجھ کو سکھانے والے کی......!" انھوں نے جوش میں اپنی مری ہوئی ماں کو بھی نہ بخشا اور مرحومہ کے ساتھ ایک گندا سا رشتہ جوڑ کر کہنے لگے "اچھا اب تم بڑھاؤ اپنا ٹٹو......!"

اس کے بعد گہری خاموشی چھا گئی۔ ذرا دیر بعد میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ رانا جوگندر بہادر ان کی خوشامد کر رہا تھا اور وہ تھے کہ کسی طرح پُٹھے پر ہاتھ ہی نہیں رکھنے دے رہے تھے۔ آخر دروازہ بند کر کے وہ اندر چلے گئے۔ رانا بے چارہ بڑی دیر تک منہ لٹکائے دروازے پر کھڑا رہا۔ استاد نے پلٹ کر خبر بھی نہ لی۔ اس کے بعد میں نے رانا کو ان کے ہاں پھر کبھی نہیں دیکھا۔

اس سے بھی زیادہ عبرت ناک منظر ایک اور دیکھنے میں آیا۔ اس روز بھی استاد شیدی کسی شاگرد کو ڈانٹ رہے تھے اور شاگرد بار بار غلطی کر رہا تھا۔ ایکا ایکی اُونچی آواز سے گالیاں بکنے کی آواز سنائی

دی۔ میں نے گھبرا کر باہر دیکھا تو ایک نوجوان دروازہ کھول کر استاد کی بیٹھک سے باہر نکل رہا تھا۔ یہ میرے ایک ملنے والے تھے۔ گوکل چند رستوگی۔ لکھنؤ یونیورسٹی میں ایم۔اے کے طالب علم تھے۔ مزاج میں رکھ رکھاؤ اور سلیقہ تھا۔ شعروشاعری سے خاصا شغف تھا۔ موسیقی کا نیا نیا شوق ہوا تھا۔ میں نے غور کیا کہ وہ اس وقت بے حد بدحواس نظر آ رہے تھے۔ جیسے ہی وہ دروازے سے نکلے، ان کے پیچھے پیچھے استاد بھی نکلے۔ ان کے ہاتھ میں سارنگی بجانے کا گز تھا۔ گوکل نے جو انھیں دیکھا تو اپنی چپل چھوڑ کر سڑک پر ننگے پاؤں بھد بھد کر کے بھاگنا شروع کر دیا اور استاد گالیاں دیتے ہوئے پیچھے پیچھے دوڑے۔

کوئی سو، سوا سو گز تک دونوں دوڑتے رہے۔ سارے راہ گیر ٹھٹک کر رہ گئے۔ دکان دار دکانیں چھوڑ کر باہر آ گئے اور حیرت سے دیکھنے لگے کہ یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ استاد واپس لوٹے تو سانس پھولی ہوئی تھی، منہ سے کف جاری تھا اور برابر بڑبڑاتے جا رہے تھے۔

ان کی انھی حرکتوں کا نتیجہ تھا کہ اکثر شاگرد چند ہی روز میں بھاگ کھڑے ہوتے۔ اپنی اس بدمزاجی کے باعث وہ کسی طوائف کے ہاں زیادہ دن نہ ٹکے۔ آخری بار ان کا جو ٹیوشن چھٹا، اس کی وجہ بھی یہی بدمزاجی تھی۔ اُن دنوں وہ چوک کی مشہور طوائف دلربا کے ہاں کسی لڑکی کو تعلیم دیا کرتے تھے۔ ایک تو رنڈی کی لڑکی اور پھر وہ بھی بلا کی شوخ۔ بات بات پر اٹکھیلیاں کرنا اس کی گھٹی میں پڑا تھا۔ ایک روز بار بار منع کرنے پر بھی وہ برابر غلط بول نکالتی رہی۔ استاد نے ایک دفعہ جل کر کہا "اب کی یہاں انترا لگایا تو سالی کا منہ توڑ کے رکھ دوں گا۔"

مگر اس نے پھر وہیں انترا لگایا اور غضب یہ کیا کہ کھی کھی کر کے ہنس پڑی۔ استاد شیدی کچھ اس قدر بھنّائے کہ پاس رکھا ہوا شیشے کا گلاس کھینچ مارا۔ بھوں پھٹ گئی۔ وہ گلا پھاڑ کر چیخی "ہائے امّاں میں مر گئی۔"

چاروں طرف سے رنڈیاں اور بھڑوے دوڑ پڑے۔ لڑکی کی پیشانی سے خون کا فوارہ اُبل رہا تھا۔ دل ربا نے اس کی یہ حالت دیکھی تو سر پیٹ لیا لیکن ڈیرے دار طوائف تھی۔ ہر وقت کا رئیسوں کے ساتھ سابقہ تھا۔ مزاج میں بڑا رکھ رکھاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ ہاتھ جوڑ کر اُستاد سے صرف اس قدر کہا "اُستاد ہم تو باز آئے اس تعلیم سے۔ خدانخواستہ بچّی کی آنکھ جاتی رہتی تو سمجھ لو اس کی تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قسمت پھوٹ گئی تھی۔"

استاد شیدی پھر بھی نہ پسیجے۔ تیوری پر بل ڈال کر بولے "مجھ سے تعلیم دلوانا ہے تو یہی ہو گا ورنہ کسی اور کو ڈھونڈ لو۔ شہر میں بہت سے گویّے پڑے ہیں۔" اتنا کہہ کر انھوں نے سارنگی پر غلاف چڑھایا اور اسے بغل میں دبا کر بالاخانے سے اُتر کر نیچے آ گئے۔ دوبارہ بھول کر بھی اس طرف کا رُخ نہ کیا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ دل رُبا خود منانے آئی تھی مگر استاد کچھ اس قدر برہم تھے کہ اس روز یہ عہد کر لیا کہ اب کسی رنڈی کو تعلیم نہیں دیں گے۔ ہوا بھی یہی کہ وہ پھر کبھی بغل میں سارنگی دبا کر شام کے وقت چوک کی جانب جاتے نظر نہیں آئے۔

استاد شیدی کی بدمزاجی صرف شاگردوں ہی کے لیے نہیں تھی۔ گھر والے اور بھی زیادہ موردِ عتاب تھے۔ ان کی تین لڑکیاں اور ایک لڑکا تھا۔ لڑکے کا نام منصور علی تھا۔ اولادوں میں سب سے بڑا وہی تھا۔ اچھا خاصا چل نکلا تھا۔ استاد کا حال یہ تھا کہ جہاں فرصت ملی، سارنگی اٹھائی اور لڑکے کو تعلیم دینا شروع کر دی۔ ذرا چُوکا اور استاد نے گالی دی۔ زیادہ جھنجلائے تو ہاتھ چھوڑ بیٹھے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ مارپیٹ سے کام نہیں چلا تو دالان کے کھمبے سے باندھ کر چابکوں سے مارتے تھے۔ اس وقت گھر پر دہشت طاری ہو جاتی تھی۔ کسی کی کیا مجال کہ انھیں ٹوکے؟ مگر کوئی نہ کوئی لڑکی بھائی کی محبّت میں بول ہی پڑتی اور گڑگڑا کر استاد سے کہتی "اللہ ابّا! بھیّا کو اب نہ ماریے۔" اُستاد خوں خوار نظروں سے گھور کر اسے دیکھتے اور موٹی سی گالی دے کر اسے بھی گھسیٹ کر کسی دوسرے کھمبے سے باندھ دیتے۔ اب دونوں پر مار پڑتی۔ اسی دوران میں کسی اور لڑکی کی شامت آ جاتی تو وہ بول پڑتی۔ اس کا بھی وہی حشر ہوتا۔

استاد کے گھر کا دالان بہت وسیع تھا۔ اس کے سات آٹھ ستون تھے اور کبھی کبھی یہ بھی ہوا کہ تمام لڑکے اور لڑکیاں دالان کے کھمبوں سے بندھے ہوئے ہیں اور باری باری ہر ایک پر چابکیں پڑ رہی ہیں۔ بیوی ان کی فطرتاً کچھ بے حس واقع ہوئی تھیں۔ خاموش بیٹھی تماشا دیکھا کرتیں۔ جب دیکھا نہ جاتا تو اُٹھ کر پڑوس میں کسی کے گھر چلی جاتیں اور جو شامتِ اعمال کہیں بول پڑیں تو وہ بھی کھمبے سے باندھ دی جاتیں۔

یہ عجیب ڈرامائی منظر ہوتا۔ استاد شیدی ہاتھ میں لمبی سی چابک لیے سرکس کے ٹرینر کی طرح اِس سرے سے اُس سرے تک ٹہل رہے ہیں۔ جس نے فریاد کے لیے زبان کھولی۔ سڑاک سے اس کے ایک چابک دی اور کبھی خاموش رہنے پر بھی اِس سرے سے اُس سرے تک سڑاسڑ چابکیں برساتے

سے چلے جاتے۔

ایسے موقعوں پر ان کی سب سے چھوٹی بچی مشکل کشائی کرتی تھی۔ وہ استاد کی نظر بچا کر باہر چلی جاتی اور استاد کے ماموں کو بلا کر لے آتی۔ وہ بوڑھے آدمی تھے۔ بڑی مشکل سے لاٹھی کا سہارا لے کر کپکپاتے ہوئے آتے اور اپنے پوپلے منہ سے استاد کو وہ وہ گالیاں دیتے کہ استاد کے ذخیرے میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ گالیوں کا اضافہ ہی ہو جاتا۔

استاد شیدی کی ماں کا انتقال ان کی کم سنی میں ہو گیا تھا اور ماموں نے انھیں پالا پوسا تھا۔ اس لیے وہ ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ بڑے میاں آتے تو سب کی رہائی ہوتی۔ جب کبھی ایسا معرکہ پڑتا تو استاد ماموں کی آواز سنتے ہی رفو چکر ہو جاتے۔ اُس روز رات کو وہ دیر سے گھر لوٹتے۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ واپسی پر مٹھائی کا دونا ان کے ہاتھ میں نہ دبا ہو۔ آتے ہی ایک ایک بچے کو جگاتے اور خود اپنے ہاتھ سے ہر ایک کو مٹھائی کھلاتے۔ اُن کے کردار میں ایسے ہی اور نہ جانے کتنے تضاد تھے۔

گالیاں بکنے کے معاملے میں وہ بڑے پھوہڑ تھے۔ جہاں غصہ آیا بھڑ سے گالی دے بیٹھے۔ ایک روز سہ پہر کے وقت استاد، منصور علی کو تعلیم دے رہے تھے۔ اس نے کوئی غلط سُر نکالا۔ اُستاد نے فوراً گالی دی۔ قریب ہی ان کی بیوی بیٹھی ہوئی تھی۔ انھوں نے بھڑک کر کہا: ”ذرا تو کسی کا خیال کیا کرو، سیانی سیانی لڑکیاں بیٹھی ہیں اور تم ہو کہ جو منہ میں آیا، بک جاتے ہو۔ تمھاری گالیوں نے تو ناک میں دم کر دیا ہے۔“

اُستاد بجائے اس کے کہ کچھ نادم ہوتے، بگڑ کر کہنے لگے: ”اچھا تو اب ہم گالی بکتے ہیں؟“ پھر انھوں نے بیوی کے بارے میں ایک انتہائی گندی سی بات کہی اور چیخ کر بولے: ”اور یہ اولادیں تو تم جہیز میں لائی تھیں؟“ بیوی بے چاری کو سانپ سونگھ گیا، پھر اُن کی آواز نہ سنائی پڑی۔

اُستاد نے طوائفوں کو تعلیم دینا بند کیا تو گھر پر تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ اب انھوں نے اپنا نام اُستاد شیدی کے بجائے مرزا شید املی بیگ رکھ لیا تھا۔ پہلے اُن کے شاگرد انھیں استاد کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ اب وہ انھیں مرزا صاحب کہنے لگے۔ اگر بھولے سے کوئی اُستاد کہہ کر بلاتا تو وہ بھڑک اٹھتے اور گالیاں بکنا شروع کر دیتے۔

اُن دنوں ان کا بیشتر وقت گھر ہی پر گزرتا تھا۔ سویرے تڑکے ہی سارنگی لے کر بیٹھ جاتے اور شام تک راگنیوں کا سلسلہ جاری رہتا۔ اب اُن میں ایک نیا مرض یہ پیدا ہو گیا تھا کہ موسیقی پر لیکچر دیتے دیتے وہ ہر ہر بات پر لیکچر بازی کرنے لگے تھے۔ اُن کی اس نئی عادت کا سب سے بڑا شکار بیوی تھی جو بے چاری سیدھی سادی گھریلو عورت تھی اور اُستاد تھے کہ اُس سے موسیقی کے بارہ ٹھاٹھوں پر بات کرتے کرتے سیاست پر بحث شروع کر دیتے۔ اکثر رات کے سناٹے میں استاد شیدی کی پاٹ دار آواز سنائی دیتی۔ وہ اس وقت کسی نہ کسی موضوع پر لیکچر دیتے ہوتے۔ یہ لیکچر ذرا ذرا سی گھریلو باتوں سے شروع ہوتے تھے۔

یہ محض اتفاق تھا کہ یہ لیکچر بازی انھیں راس آگئی اور وہ میوزک کالج میں باقاعدہ لیکچرار ہو گئے۔ اس تبدیلی سے استاد کی وضع داری میں تو کوئی فرق پیدا نہیں ہوا البتہ یہ انقلاب ضرور رونما ہوا کہ ان کے دروازے پر ایک بڑی سی تختی لٹکنے لگی جس پر انگریزی کے موٹے موٹے حروف میں لکھا تھا۔ پروفیسر شید املی بیگ۔ حالانکہ اُستاد انگریزی سے قطعی ناآشنا تھے مگر اب وہ پروفیسر کہلانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ دو چار دفعہ کی ڈانٹ ڈپٹ کے بعد گھر پر آنے والے شاگردوں نے انھیں پروفیسر صاحب کہنا شروع کر دیا۔

*

اس کے بعد انھوں نے اپنی برادری کے کشمیری بھانڈوں سے بھی تقریباً ملنا جلنا ترک کر دیا اور قرابت داریوں کو ناجائز اولاد کی طرح چھپاتے پھرتے لیکن انھوں نے محلّہ نہ چھوڑا۔ اس کا سب سے بڑا سبب ان کا گھر تھا۔ جو بقول ان کے، بزرگوں کی یادگار تھا۔ البتہ اس کھنڈر نما مکان کو انھوں نے آئے دن مرمت کرا کے اچھا خاصا شان دار بنا لیا تھا۔

آمدنی معقول تھی۔ مزے سے گزر بسر ہو رہی تھی۔ اب وہ اور بھی وزنی گالیاں بکنے لگے تھے۔ شاگردوں کو بات بات پر کتوں کی طرح دھتکارتے تھے۔ شاگرد بھی خوب تھے، دم سادھے بیٹھے رہتے، چوں تک نہ کرتے۔ ان میں بعض ایسے بھی تھے جن سے میرے مراسم تھے۔ پوچھا: ”بھائی! یہ استاد شیدی میں کیا سرخاب کا پر لگا ہے کہ دھڑا دھڑ گالیاں کھایا کرتے ہو؟ کسی اور سے کیوں نہیں سیکھتے؟“ مگر سب کی متفقہ رائے تھی کہ جس طرح سارنگی بجانے میں دُور دُور تک استاد شیدی کا جواب نہیں تھا۔ اسی طرح وہ راگ داری کے رگ و ریشے سے واقف ہیں۔ اس قدر مہارت تھی کہ بتانے پر آتے تو یہ تک بتا جاتے کہ فلاں راگ کا موجد کون تھا؟ کس زمانے میں نکلا؟ اور اب تک اس میں کیا کیا تبدیلیاں پیدا ہوئیں؟

انھی دنوں کا ذکر ہے کہ راجہ بانکی پور کے ہاں ایک تقریب تھی۔ رقص و موسیقی کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ استاد شیدی کو بھی بلایا گیا۔ وہ اب مجروں میں بہت کم جاتے تھے مگر منصور علی کے اصرار پر چلے گئے۔ راجہ صاحب نے بڑی دھوم دھام سے جشن کا بندوبست کیا تھا۔ شہر کے سارے کلاکاروں کو انھوں نے اکٹھا کر لیا تھا۔ رات بھر راگ رنگ کی محفل گرم رہی۔ سنگیت کے وہ رُوپ دیکھنے میں آئے کہ مزا آگیا۔ البتہ استاد کے ساتھ ایک حادثہ ہو گیا۔ ہوا یہ کہ رات کے کوئی گیارہ بجے برق بانو نے ایک ٹھمری گائی۔ یہ برق بانو کے عرُوج کا زمانہ تھا۔ قبول صوُرت طوائف تھی۔ کھلتا ہوا چمپئی رنگ تیکھے نقش و نگار، نکلتا ہوا چھریرا جسم۔ اس نے ٹھمری چھیڑی تو محفل میں آگ لگ گئی۔ بول تھے: ”اندھیریا ہے رات سجن رہیو کہ جیّو۔“ آدھی رات کا وقت۔ اودھ کے تعلقے داروں کی محفل، بے نظیر نے نرت کے ساتھ ٹھمری کے بول ادا کیے تو وہ معجونِ شباب آور کا کام کر گئی۔ ہر طرف سے واہ واہ ہونے لگی۔ روپوں کی بارش شروع ہو گئی۔ محفل میں راجہ صاحب آگرہ بھی موجود تھے۔ ان دنوں برق بانو انھی کے پاس تھی۔ انھوں نے دونوں ہاتھوں سے روپیہ نچھاور کیا۔ داد دیتے دیتے ان کا گلا خشک ہو گیا۔

*

ٹھمری کی جان نرت ہے اور برق بانو نے نرت بنانے میں بانکی چتونوں کی ایک ایک گھات اور بدن کی ہر چھب داؤ پر لگا دی۔ اہلِ محفل بار بار پہلو بدلتے۔ تعلقے دار بار بار راجہ اجے گڑھ کو چھیڑتے اور وہ بڑے فخر کے ساتھ مسکرا مسکرا کر ہر ایک کو دیکھتے۔ غرضیکہ ایک ہنگامۂ ہاؤ ہُو برپا ہو گیا۔

برق بانو کا مجرا ختم ہوا تو محفل کا رنگ بدل چکا تھا۔ اس کے فوراً بعد استاد شیدی کا پروگرام تھا۔ وہ حسبِ معمول ڈھیلی ڈھالی اچکن پر دوپلی ٹوپی لگائے ہوئے تھے۔ ان کی یہ وضع قطع دیکھ کر کچھ منچلے بھڑکے مگر صرف مسکرا کر رہ گئے۔ انھوں نے ایمن راگ چھیڑا اور دھیرے دھیرے استھائی میں چلے مگر محفل کا مطالبہ کچھ اور تھا اور اُستاد کو اس کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ وہ طبلے کی سنگت کے ساتھ مدھم سروں میں سارنگی بجاتے رہے۔ ذرا دیر تک خاموشی رہی۔ اس کے بعد سننے والوں کی دلچسپی بھٹکنے لگی اور محفل پر ایک اکتاہٹ سی طاری ہو گئی۔ اس محفل میں سرجوالا پرشاد سری واستوا بھی شریک تھے، غالباً مہمانِ خصوصی تھے۔ ان سے ضبط نہ ہو سکا۔ مسکرا کر بولے: ”استاد جی، یہ آپ نے کیا روں روں لگا رکھی ہے؟ ذرا کچھ اچھے ہاتھ دکھایئے۔“

اُستاد شیدی محفل سے کچھ یوں ہی بیزار تھے۔ سرجے پی سری واستوا کا یہ جملہ سنتے ہی ان کے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ فوراً ہاتھ روک لیا۔ پلٹ کر طبلچی کی طرف دیکھا اور ڈانٹ کر کہنے لگے: ”روک بے ہاتھ!“ طبلیے نے گھبرا کر ہاتھ کھینچ لیا۔ اُستاد نے خاموشی کے ساتھ قریب رکھا ہوا سارنگی کا غلاف اٹھایا اور سارنگی اس میں لپیٹنے لگے۔ سرجوالا پرشاد کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا، مسکرا کر بولے: ”استاد جی! معلوم ہوتا ہے کہ آپ میری بات کا بُرا مان گئے۔ میں نے تو آپ سے ایک درخواست کی تھی۔ آپ کو کچھ سُنا کر جانا پڑے گا۔“

راجہ بانکی پور نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اُستاد نے جل کر کہا: ”اجی سنانے والے کی تو......“ انھوں نے ایک گندی سی گالی دی اور بدستور سارنگی غلاف میں لپیٹتے رہے۔ ”آپ نے مجھ کو کوئی میراثی سمجھا ہے؟ برسوں خون پانی کر کے ریاض کیا ہے، رنڈیوں کی چلمیں نہیں بھریں۔ واہ صاحب واہ، کیا قدر دانی کی ہے؟ مجھے کیا معلوم تھا کہ سالے ایسے بدذوقوں سے پالا پڑے گا۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

محفل پر سناٹا طاری ہو گیا۔ سرجوالا پرشاد اُن دنوں وائسرائے کی کونسل کے ہوم ممبر تھے۔ لوگوں نے سوچا کہ اگر استاد اس وقت جوتے مار کر نہ نکالے گئے تو انھیں کم از کم جیل کی ہوا تو ضرور کھانا پڑے گی۔ سرِ محفل انھوں نے ہوم ممبر کی بے عزتی کی تھی لیکن استاد بڑی بے نیازی اور ایک شانِ استغنا کے ساتھ محفل سے اُٹھ کر چلے گئے۔

سُنا ہے کہ سرجوالا پرشاد خود استاد کو منا کر پھر محفل میں لائے۔ اس کے بعد استاد شیدی نے بہار کا خیال چھیڑا اور کئی گھنٹے تک سارنگی پر اپنے فن کا مظاہرہ کرتے رہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ استاد کا عالم یہ تھا کہ آنکھیں بند تھیں۔ جسم پتھر کی طرح ایک جگہ جم کر رہ گیا تھا۔ صرف ہاتھ چل رہا تھا اور سارنگی سے سنگیت کی بارش ہو رہی تھی۔

یہ پھاگن کی رات تھی۔ ہوا میں پھولوں کی مہک تھی اور ہر طرف چاندنی بکھری ہوئی تھی۔ بہار کی آمد آمد تھی۔ کچھ تو موسم کا اثر اور کچھ استاد چوٹ کھا کے اپنا کمال دکھا رہے تھے۔ سماں بندھ گیا۔ استاد شیدی نے ٹھمری کی تندی، ٹھرّے کے نشے کی طرح اتار کر رکھ دی۔ وہ رنگ باندھا کہ بہار کی کیفیت طاری ہو گئی۔ رات ڈھلتی گئی اور اُستاد کا ہاتھ سارنگی پر چلتا رہا۔ کلیاں چٹکنے لگیں۔ پھولوں کے تختے مہکنے لگے

قاضی

کا رنگ کوّے جیسا سیاہ تھا۔ اس نے کسی شخص کے خلاف سزا کا حکم دیتے ہوئے کہا۔ ”اس کا منہ کالا کر کے گدھے پر گشت کرائی جائے!“

ملزم ذرا مسخرا تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔ ”حضور میرا آدھا منہ کالا کرائیں!“

قاضی نے دریافت کیا: ”یہ کیوں؟“

ملزم نے جواب دیا: ”اس لیے کہ کہیں لوگ اس غلط فہمی میں نہ مبتلا ہو جائیں کہ لوگ حضور کو گدھے پر بٹھا کر گشت کرا رہے ہیں۔“

چاندنی کی رنگت نکھر گئی۔ ہوا میں جھرنوں کی پائل بجنے لگی۔ محفل پر سناٹا چھا گیا۔ ہر شخص مبہوت تھا۔

جب انھوں نے ہاتھ روکا تو وہ اکڑ کر رہ گیا۔ واللہ اعلم، یہ واقعہ کہاں تک درست ہے۔ میں تو اس محفل میں شریک نہیں تھا البتہ اتنا ضرور میں نے دیکھا کہ استاد شیدی نے شاگردوں کو کچھ عرصے کے لیے تعلیم دینا بند کردی تھی اور ان کا ہاتھ سفید پٹی میں جھولتا رہتا تھا جس پر روزانہ سویرے سویرے ایک مالشیا آکر گھنٹوں مالش کیا کرتا تھا۔

اس بات کو زمانہ ہوگیا۔ زندگی میں بہت سے تغیرات رونما ہوئے استاد شیدی میں بھی بہت بڑا تغیر ہوا۔ اس کا انکشاف مجھ پر بالکل اچانک ہوا۔ ایک روز ایسا ہوا کہ وہ اپنا ایک ٹیلی گرام پڑھوانے میرے پاس آئے جب ان کے شاگرد موجود نہیں ہوتے تھے تو وہ اس قسم کی خدمات اکثر مجھ سے لیا کرتے تھے۔ اس وقت میرے ایک دوست بھی کمرے میں موجود تھے۔ میں نے استاد کا ان سے تعارف کرایا "آپ سے ملیے، آپ استاد شیدی ہیں، میوزک کالج میں پروفیسر ہیں۔ سارنگی بجانے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔" میں نے تعارف کرانے میں حتی الوسع یہ کوشش کی تھی کہ کہیں منہ سے ایسی بات نہ نکل جائے کہ استاد کی طبعِ نازک پر بار گزرے مگر غلطی سرزد ہوگئی۔ اس کا اندازہ مجھے استاد کی آنکھوں کے جلال سے ہوا۔ انھوں نے تیوری پر بل ڈال کر مجھے قہر آلود نگاہوں سے کچھ اس طرح دیکھا کہ اگر کوئی شاگرد ہوتا تو منہ پر وہ جھانپڑ پڑتا کہ دن میں تارے نظر آجاتے۔ میں چونکہ اس سعادت سے محروم تھا لہٰذا انھوں نے صرف نگاہِ عتاب پر اکتفا کیا اور میرے دوست سے کہنے لگے۔ "جناب مجھ کو پرنس مرزا شیدا علی گورگانی کہتے ہیں۔ میوزک کالج میں پروفیسر ضرور ہوں مگر میرا یہ خاندانی پیشہ نہیں ہے۔" اس کے بعد استاد نے جو اپنا شجرۂ نسب بتانا شروع کیا تو سلاطینِ مغلیہ سے اپنا رشتہ ملا دیا۔ وہ دیر تک اس بات پر زور دیتے رہے کہ وہ آلِ تیمور میں سے ہیں۔ موسیقی جو عام طور پر ان کی گفتگو کا موضوع ہوا کرتی تھی، اس وقت انھوں نے اس کے متعلق ایک لفظ نہیں کہا۔ میں حیرت زدہ رہ گیا۔ ان کے جانے کے بعد بھی میں سوچتا رہا کہ استاد شیدی نے بڑے زناٹے کی زقند لگائی ہے۔ آج تک تو انھوں نے اشارتاً بھی اس بات کا اظہار نہیں کیا تھا۔ یہ اچانک ان پر اپنے مغل شہزادہ ہونے کا انکشاف کیسے ہوا؟

تحقیقات کرنے پر پتہ چلا کہ یہ دُور کی کوڑی ان کے صاحبزادے منصور علی لائے تھے جو خیر سے اب ٹیوشن پڑھانے لگے تھے اور ان دنوں کسی کی عوضی پر میوزک کالج میں گانے کی تعلیم بھی دے رہے تھے۔ قصہ کچھ اس طرح سننے میں آیا کہ کالج میں ایک روز کسی گویّے نے منصور علی کو بھانڈ کہا اور خود کو واجد علی شاہ کا پڑپوتا بتایا۔ اس وقت تو بات تُو تکار تک پہنچ کر ختم ہوگئی مگر منصور علی نے سنجیدگی کے ساتھ سوچنا شروع کردیا اور ایک دن وہ اس گویّے سے ایک ڈگری زیادہ بڑے شہزادے بن گئے۔ استاد نے نہ صرف یہ تجویز قبول کرلی بلکہ باقاعدہ اس کی تبلیغ بھی شروع کردی۔ ان کے مکان کی تختی بھی بدل گئی۔ البتہ کشمیری بھانڈوں میں اس تبدیلی پر چہ می گوئیاں ہونے لگیں۔ اُستاد کے خلاف ایک محاذ قائم ہوگیا۔ جس میں محلے کے کچھ ایسے رہنے والے بھی شامل ہوگئے جو بھانڈوں کی برادری میں نہیں تھے۔

جن دنوں یہ کشمکش زوروں پر تھی، میں لکھنؤ چھوڑ کر کراچی آگیا اور یہاں آکر ایسا پھنسا کہ لکھنؤ جانا نصیب نہ ہوا۔ موسیقی سے مجھے کبھی لگاؤ نہیں تھا اور نہ ہے۔ اسی لیے کبھی استاد شیدی کی یاد بھی نہ آئی۔

✥

چند سال قبل کا ذکر ہے، میں ایک عزیز سے ملنے ملیر گیا تھا۔ واپسی پر بس کے انتظار میں بس اسٹینڈ پر کھڑا تھا کہ کسی نے قریب آکر بڑے لکھنوی انداز میں جھک کر سلام کیا۔ جھٹپٹے کا وقت تھا۔ میں اس شخص کا چہرہ نہ دیکھ سکا البتہ اتنا ضرور خیال آیا کہ اسے کہیں دیکھا ہے۔ کہاں دیکھا ہے؟ اور کس جگہ دیکھا ہے؟ یہ بات یاد نہ آئی تو اس نے خود ہی کہا "نہیں پہچانا؟ ہاں بھئی غریبوں کو کون پہچانتا ہے؟ یہ تو اس سالی سرزمین کی خاصیت ہے"

میں نے فوراً پہچان لیا، استاد شیدی ہے۔ ابھی خیر و عافیت پوچھنے کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ اس اثنا میں میری بس آگئی اور میں اس میں سوار ہو کر چلا گیا۔ اس وقت بڑی عجلت میں تھا۔ یہ بھی پوچھنے کا موقع نہ ملا کہ ان کا قیام کہاں ہے؟ اور کب تک یہاں ٹھیریں گے؟ عارضی طور پر آئے ہیں یا مستقل ہجرت کرکے پاکستان چلے آئے ہیں لیکن یہ میں نے ضرور اندازہ لگایا کہ ان کی حالت کچھ پتلی تھی۔ اُس روز وہ شیروانی بھی میلی کچیلی پہنے ہوتے تھے اور آواز میں وہ کرارا پن بھی نہیں تھا جسے سُن کر سینکڑوں کے ہجوم میں انھیں پہچانا جاسکتا تھا۔

کوئی ہفتے بھر بعد استاد شیدی سے پھر مڈبھیڑ ہوگئی۔ اس روز خاصی تفصیلی ملاقات رہی۔ باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ انھیں کراچی آئے ہوئے سات آٹھ ماہ کا عرصہ ہوچکا ہے۔ دونوں بڑی لڑکیوں کی شادی انھوں نے لکھنؤ ہی میں کردی تھی۔ میوزک کالج کی ملازمت پرنسپل کی مہاسبھائی ذہنیت کے باعث جاتی رہی۔ بات صرف اتنی تھی کہ ہولی کے تہوار پر پرنسپل نے کالج کے تمام اساتذہ کو اپنے گھر پر مدعو کیا تھا۔ ہولی منانے کا پروگرام تھا۔ استاد شیدی صوم و صلوٰۃ کے پابند مسلمان تھے۔

پرنسپل کے منہ پر صاف صاف کہہ دیا کہ "میں رنگ کھیل کر خود کو جہنمی بنانا نہیں چاہتا لہٰذا مجھ کو تو اس شیطانی چرخے سے باز ہی رکھا جائے۔"

پرنسپل نے ان کے مذہبی جذبات کا احترام کرنے کے بجائے کاٹ پیچ شروع کر دی۔ پھر ایک دن ایسا بھی آیا کہ استاد رشیدی کو کالج ہمیشہ کے لیے چھوڑنا پڑا۔ ملازمت سے علیحدہ ہونے کے بعد بھی وہ مزے میں تھے، گھر پر اچھے خاصے شاگرد آجاتے تھے۔ انھی دنوں منصور علی پاکستان چلا آیا اسی کی تحریک پر وہ بھی چلے آئے۔ میں نے پوچھا: "منصور علی کہاں ہے؟" کہنے لگے "اس نے قوالوں کی ایک چوکی بنائی ہے اور آج کل خیرپور میں ہے۔"

میں نے حیرت زدہ ہو کر کہا "قوالوں کی چوکی؟"

وہ مسکرا کر بولے "آخر کچھ نہ کچھ تو پیٹ کا دھندا کرتا۔ یہاں گانے بجانے کی کون قدر کرتا ہے؟"

"اور آپ؟" غیرارادی طور پر میں پوچھ بیٹھا۔ یکبارگی پرانے استاد رشیدی جاگ اٹھے۔ انھوں نے ایک سڑی ہوئی سی گالی دی اور غصے سے بولے "اجی قوالی بھی کوئی راگ ہے؟ لاحول ولا قوۃ۔ منصور میرے سر بہت ہوا۔ میں نے کہا ابے بیدھا ہوا ہے، اب میں قوالی گاؤں گا؟ ذرا غور تو کیجیے۔ زندگی بھر کا ریاض چند ٹکوں کی خاطر قربان کر دوں؟ واہ صاحب واہ۔ یہ بھی ایک ہی رہی۔"

وہ دیر تک اسی قسم کی باتیں کرتے رہے مگر ان کی حالت بڑی ابتر تھی۔ اچکن بے حد بوسیدہ ہو گئی تھی۔ پائجامے پر گھٹنے کے پاس بڑا سا پیوند لگا تھا۔ چہرہ اور بھی بدشکل ہو گیا تھا۔

آخر دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے استاد رشیدی رخصت ہو گئے۔ چند ہی روز بعد وہ میرے دفتر آئے۔ تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد بولے "ریڈیو کے صاحب سے آپ کی کچھ ملاقات ہے؟"

میں نے انکار کیا تو ان کا چہرہ اُتر گیا۔ نہ جانے وہ میرے پاس کیا کیا توقعات لے کر آئے تھے۔ بڑے پژمردہ لہجے میں بولے "میں نے سوچا تھا کہ شاید آپ کے توسط سے ان تک رسائی ہو جائے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ بغیر سفارش کے یہاں کوئی کام نہیں بنتا۔"

میں نے غور کیا کہ استاد رشیدی کو زندگی برتنے کا گُر اب تک نہیں آیا۔ وہ اپنے فن میں اس قدر مگن تھے کہ کبھی جھانک کر بھی زندگی دیکھنے کا موقع نہ ملا۔ میری سفید پوشی سے مرعوب ہو گئے اور یہ سمجھ بیٹھے کہ یہاں آکر میں بڑی توپ بن گیا ہوں۔

مجھے خاموش دیکھ کر اُستاد نے بات کا رُخ پلٹ دیا۔ کہنے لگے "منصور کا خط آیا ہے۔ وہ بھی آج کل بہت پریشان ہے۔ لکھا ہے کہ اس کا گلا خراب ہو گیا ہے۔ کسی نے سیندور کھلا دیا۔" لمحے بھر توقف سے بولے "اجی! سیندور ویندور کسی نے کیا کھلایا ہوگا؟ سالے نے قوالیاں گاگا کر اپنی آواز کا ستیاناس کر دیا۔"

اس روز بھی اپنی پریشانیوں کا ذکر کرتے رہے۔ چلتے وقت بہت جھجکتے ہوئے انھوں نے کہا "کچھ رُپے ہوں گے آپ کے پاس؟ بخدا دو روز سے گھر میں فاقہ پڑا ہے۔" یہ کہہ کر وہ اس طرح سہم کر کھڑے ہو گئے جیسے چوری کرتے ہوئے پکڑے گئے ہوں۔

میرے پاس اس وقت ایک روپیہ تھا۔ دو رُپے دفتر میں ایک صاحب سے لے کر انھیں تین رُپے دیے اور گھر کا پتہ بتا دیا کہ وہاں آجائیں تو کچھ اور بندوبست کر دیا جائے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کا حال سن کر کلیجا دھک سے ہو گیا تھا۔

دوسرے ہی دن وہ گھر آئے۔ میں نے دس رُپے اور دیے۔ انھوں نے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے نوٹ پکڑا۔ لمحے بھر تک بت بنے کھڑے رہے اور پھر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر اس طرح دھاڑیں مار مار کر رونے لگے جیسے کوئی اپنے رشتے دار کی میت کے سرہانے کھڑے ہو کر روتا ہے۔

اس کے بعد وہ ایک عرصے تک نہیں ملے۔ میں نے سوچا کہیں کام کاج مل گیا ہوگا مگر جب وہ ملے تو ان کی حالت اور بھی سوختہ ساماں تھی۔ اچکن جگہ جگہ سے مسک گئی تھی۔ ان کی موٹی سی ناک پچک کر رہ گئی تھی اور جنگلی کبوتر کی سی سُرخ آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں۔ اُس روز وہ صرف اس غرض سے آئے تھے کہ میں انھیں کہیں چپراسی ہی کی ملازمت دلوا دوں۔ اس دفعہ بھی میں نے انھیں کچھ رقم دی اور وعدہ کیا کہ کہیں نوکری دلوا دوں گا۔

اس کے بعد وہ برابر آتے رہے۔ ہر بار میں وعدہ کرتا اور وہ ہر بار اس پر یقین کر کے چلے جاتے۔ اپنی عبرت ناک حالت کی ایک الم ناک داستان سُنا ڈالتے۔ آخر وہ وقت بھی آگیا کہ میں اُن سے اُکتا گیا۔ اِس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ میں ہر بار اُن کی مالی امداد کرنے سے معذور تھا۔

ایک دن وہ آئے تو میں نے کہلوا دیا کہ "کہہ دو گھر پر نہیں ہیں۔" نہ جانے کیا بات تھی کہ واپس جانے کے بجائے وہ دروازے پر رُک گئے اور ٹہل ٹہل کر میرا انتظار کرتے رہے۔ عجیب مصیبت تھی کہ میں گھر کے اندر قید تھا اور وہ دروازے پر گویا پہرا دیے رہے تھے۔ شاید ۹ بجے دن کو وہ آئے تھے، سہ پہر تک اسی طرح ٹہلتے رہے۔ مجھے ان کی حالت پر ترس بھی آیا۔ خدا معلوم وہ کس عالم میں میرے پاس آئے تھے اور صبح کے بھوکے پیاسے اس طرح بے چینی کے ساتھ میرا انتظار کر رہے تھے۔ مشکل یہ تھی کہ گھر کا ایک ہی دروازہ تھا جس پر وہ موجود تھے۔ ورنہ میں کسی نہ کسی طرح ان کے پاس چلا آتا۔ جب تک وہ موجود رہے، بڑا ذہنی کرب رہا۔ جھٹپٹا ہونے سے کچھ دیر قبل وہ چلے گئے۔ اس وقت وہ بیماروں کی طرح لاغر نظر آرہے تھے۔

اس کے بعد وہ دوبارہ میرے گھر نہیں آئے۔ ایک مدت گزر گئی خدا جانے کس عالم میں تھے۔

چند ماہ بعد کا واقعہ ہے، مجھے اپنے ایک رشتے دار کے لیے رائیڈنگ شو تیار کرانے کی غرض سے جوتے بنانے والے ایک کارخانے میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں مجھے ایک شخص میں اُستاد رشیدی کی شباہت معلوم ہوئی۔ وہ فرش پر بیٹھا رانپی سے بڑی محویت کے عالم میں چمڑا کاٹ رہا تھا۔ گرمی کا موسم تھا۔ اس کے بدن پر صرف ایک گندا سا نیکر تھا۔ ایک ایک ہڈی نظر آرہی تھی۔

اس نے گردن اُٹھا کر دیکھا تو میں ششدر رہ گیا۔ استاد رشیدی تھے۔ میں نے دل ہی دل میں کہا کہ اُستاد نے مجھے یہاں دیکھ لیا تو بڑے ہی خفیف ہوں گے لہٰذا مجھے فوراً یہاں سے اُٹھ جانا چاہیے مگر انھوں نے مجھے دیکھ لیا تھا اور خلافِ توقع بڑی گرم جوشی سے بولے "ارے آپ ہیں! کہیے خیریت تو ہے؟"

اس کے بعد انھوں نے فوراً 'باہر والے' کو آواز دے کر بلایا اور دو پونیا چائے کا آرڈر دے دیا۔ میں نے اظہارِ ہمدردی کے طور پر کہا۔ "مرزا صاحب، یہ آپ نے کیا حالت بنا رکھی ہے؟"

ہنس کر بولے "بھائی دونوں وقت پیٹ بھر کر روٹی مل جاتی ہے، اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔"

میں نے کہا "تو گویا موسیقی آپ نے بالکل ترک کر دی؟"

بڑی شانِ استغنا کے ساتھ بولے "اجی لعنت بھیجیے!"

اس کے بعد انھوں نے موسیقی کے فن کو بڑی گندی گندی گالیاں دیں اور پھر خاموش ہو کر بڑے اطمینان سے گردن نیچی کر کے رانپی سے چمڑا کاٹنے لگے۔ پہلی بار مجھے اس حقیقت کا اندازہ ہوا کہ اُستاد رشیدی کو میں جس قدر سادہ لوح سمجھتا تھا، وہ ایسے نہ تھے۔ کم از کم اس دفعہ انھوں نے دانش مندی کا ثبوت دیا تھا۔ ایسا فن سیکھا جس کی ضرورت امرِ مسلّمہ تھی۔ آدمی جوتے بغیر تو رہ نہیں سکتا، البتہ اتنا ضرور ہے کہ جن انگلیوں سے وہ نغموں کا جادو جگاتے تھے، آج ان سے جوتیاں گانٹھ رہے تھے۔

افلاطون

سچائی کی فضیلت بیان کر رہا تھا۔ اس نے کہا "سچائی اور سچ کی عظمت سے کون انکار کر سکتا ہے لیکن ایک ایسی سچی بات بھی ہے جس سے انسان کو بچنا چاہیے!"

ایک شاگرد نے سوال کیا۔ "سچی بات سے پرہیز، کیا معنی؟"

افلاطون نے کہا "ہاں وہ سچی بات ہی ہے لیکن لائق پرہیز، اور وہ ہے اپنی تعریف اور ستائش، گو تم میں وہ ساری خوبیاں اور اوصاف موجود ہی کیوں نہ ہوں جن کا تم اظہار کر رہے ہو۔"

مغرب سے تازہ ترد و منتخب کہانیاں؟

پہلی تخلیق

ایک دلچسپ، رسیلی اور شوخ کہانی

عادت

بزرگوں نے کہا ہے انسان عادات کا غلام ہوتا ہے۔

ایک کتّے نے جسے پیار سے بنگو کہا جاتا تھا یہ کہاوت نہ جانے کہاں سُن لی تھی۔ اُس نے بھی انسان کے نقشِ قدم پہ چلنے کا فیصلہ کیا اور اس کا نتیجہ کچھ یُوں برآمد ہوا۔

بنگو کے مالک مسٹر براؤن شادی شدہ تھے۔ جوانی ڈھل چکی تھی مگر اُن کا دل جوان تھا مسٹر براؤن کی خوبصورت بیوی کا نام مارتھا تھا اُس کا بدن نہایت متناسب تھا۔ اُسے کسرت اور ورزش کا بہت شوق تھا اس لیے وہ اکثر اپنے شوہر کو بھی ورزش پہ مجبور کرنے کی ناکام کوششیں کیا کرتی تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ ورزش اور صبح کے وقت سمندر میں پیراکی کرنے سے پیٹ پہ چڑھی ہوئی چربی کی تہوں میں کمی واقع ہونے لگتی ہے۔ مسٹر براؤن ایک فیکٹری کے مالک تھے۔ بہت اچھی آمدنی تھی۔ وہ روزانہ ریڈیو سے ورزش کا پروگرام سُنتے تھے اور بہت خوش ہوتے تھے۔ انھیں سمندر میں پیراکی کرنے سے نفرت تھی۔ انھیں مٹاپا دور کرنے والی غذاؤں سے بھی نفرت تھی۔ پرہیزی کھانا تو انھوں نے اپنی پوری زندگی میں کبھی نہیں کھایا تھا۔ انھیں اپنی صحت کا بہت خیال رہتا تھا۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ اچھی صحت کے لیے عمدہ قسم کی مُرغی کھاتے رہنا بے حد ضروری ہے۔

ہم مسٹر براؤن کی محبوبہ مارگریٹ کو چُوزے سے تشبیہ نہیں دے سکتے لیکن وہ کڑک مُرغی بھی نہیں تھی۔ مارگریٹ کو ایک ایسی مُرغی کہا جا سکتا ہے جسے دیکھتے ہی دیکھنے والے کے منہ میں پانی آجائے۔ اس کی عمر تقریباً پچیس سال تھی۔ بھرا بھرا گداز بدن، چہرے کے نقوش تیکھے اور بال انگاروں کی طرح دہکتے ہوئے۔ مارگریٹ بیوہ تھی اور اُسے مصوّری سے دلی لگاؤ تھا۔ صحت برقرار رکھنے کے لیے مسٹر براؤن جس قسم کی مُرغی پسند کرتے تھے مارگریٹ ویسی ہی تھی۔

مسٹر براؤن اپنی بیوی اور کتّے کے ساتھ اپنے فلیٹ میں رہتے تھے اور مارگریٹ اپنی تصویروں کے ساتھ اپنے فلیٹ میں لیکن اُس نے مسٹر براؤن کی صحت کی خاطر اور چند دیگر وجوہ سے ایک عمارت کی چھت پہ بنا ہوا ایک کمرہ کرائے پہ لے لیا تھا اور اس کام کے لیے اُس نے مسٹر براؤن کی دی ہوئی رقم خرچ کی تھی۔ مسٹر براؤن اور مارگریٹ مقرّرہ وقفوں کے بعد اس کمرے میں ایک دوسرے سے ملاقات کرتے تھے۔ مسٹر براؤن اپنے فلیٹ سے چہل قدمی کرتے ہوئے چھت پہ بنے ہوئے اس کمرے میں پہنچتے تھے۔ دوسری طرف سے مارگریٹ اپنے فلیٹ سے اُڑتی ہوئی محبت کے اس آشیانے میں قدم رکھتی تھی۔ یہ انتظام سب کے لیے اطمینان و سکون کا باعث تھا۔ جنھیں اس انتظام کا علم تھا یعنی مسٹر براؤن اور مس مارگریٹ وہ بہت خوش تھے اور جو لاعلم تھے یعنی مسٹر براؤن کی بیوی مارتھا وغیرہ وہ خود کو خوش محسوس کرتے تھے۔

"میں کہتی ہوں!" ایک روز مارتھا نے اپنے شوہر سے کہا۔ "تم ورزش نہیں کرتے، پیراکی نہیں کرتے، مُرغن غذاؤں سے پرہیز نہیں کرتے، پھر آخر تمھاری توند کم کیوں ہوتی جا رہی ہے؟ یہ کیا راز ہے؟"

اگر مسٹر براؤن اپنی بیوی کو اس راز سے آگاہ کر دیتے تو اُن کے گھر کا نظام منٹوں میں تباہ ہو جاتا۔ اِس کے علاوہ اُن کا یہ راز اب ایک تجارتی راز بھی بن چُکا تھا کیونکہ جب سے اُن کا جسم ہلکا ہوا تھا وہ اپنی فیکٹری میں

پہلے کی نسبت زیادہ دیر کام کرتے تھے اور ذہنی یک سوئی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور اُن کے کاروبار میں ترقی ہو رہی تھی۔ دوسری طرف اُن کے تجارتی معاصر مزید موٹے ہوتے جا رہے تھے اور اُن سے زیادہ کام نہیں کیا جاتا تھا۔ اگر وہ اپنی بیوی کو مٹاپا کم کرنے کی ترکیب سے آگاہ کر دیتے تو یہ راز، راز نہ رہتا اور اُن کے معاصر بھی اسی ترکیب سے اپنا مٹاپا کم کرنا شروع کر دیتے۔ اس لیے مسٹر براؤن نے اس تجارتی راز پر پردہ پڑا رہنے دیا اور دھیرے سے مُسکرائے۔ "یہ کوئی راز نہیں ہے نہ اس کی کوئی ترکیب ہے۔ ساری بات والدین کی ہوتی ہے۔" مسٹر براؤن نے کہا۔

"والدین کی؟"

"تم نے وہ محاورہ نہیں سنا، گنجوں کی اولاد بھی گنجی ہوتی ہے۔"

"سنا ہے، لیکن گنجے پن کا دبلے پن یا مٹاپے سے کیا تعلق؟"

"میرے والدِ مرحوم، خدا اُن کی رُوح پر رحمت فرمائے، ایک دبلے پتلے آدمی تھے۔"

"لیکن تمھارے والدِ مرحوم، خدا اُن کی روح پر رحمت فرمائے، عمارتیں بنانے کے ٹھیکے لیا کرتے تھے اور روزانہ سینکڑوں سیڑھیاں چڑھتے اور اترتے تھے اس لیے وہ کبھی موٹے نہیں ہوئے۔ ـــــ تم تو کبھی ایک سیڑھی بھی نہیں چڑھتے۔"

اُن کی بیوی نے نادانستگی میں ان کے راز پر انگلی رکھ دی تھی۔ وہ کس طرح کہتے کہ نیک بخت! تو ٹھیک کہتی ہے۔ میں بھی سیڑھیاں چڑھتا ہوں اور مٹاپا دُور کرنے کا یہی راز ہے۔ "میں روزانہ بنگو کے ساتھ چہل قدمی کے لیے جاتا ہوں۔" مسٹر براؤن نے مدافعت کرتے ہوئے جواب دیا۔

"ایک آدمی آخر کتنی دیر چہل قدمی کر سکتا ہے؟"

"یہی ـــ ایک یا دو گھنٹے۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے۔" مارتھا نے تُرش لہجے میں کہا۔ "میں نے آج تک کسی کو اپنے کتّے کے ساتھ ایک یا دو گھنٹے چہل قدمی کرنے کی وجہ سے دُبلا ہوتے نہیں دیکھا۔"

مسٹر براؤن ایک مرتبہ پھر دھیرے سے مُسکرائے۔ "خود تھوں نے بھی کسی کو چہل قدمی کی وجہ سے دُبلا ہوتے نہیں دیکھا تھا۔" تو پھر میرے دُبلے ہونے اور مزید موٹا نہ ہونے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟" مسٹر براؤن نے حیرت سے پوچھا۔

"یہی تو میں بھی معلوم کرنا چاہتی ہوں؟"

"یہ چہل قدمی ہی کا اثر ہے۔"

شام کے وقت مسٹر براؤن حسبِ معمول اپنے کتّے بنگو کے ہمراہ چہل قدمی کے لیے نکلے۔ مسٹر براؤن فٹ پاتھ پر چل رہے تھے اور بنگو ایک خاص وجہ سے کبھی کوئی دیوار سونگھتا اور کبھی کوئی درخت۔ اُس کی نظر میں چہل قدمی کا یہی ایک مقصد ہوتا تھا۔ پھر وہ دونوں ایک عمارت میں داخل ہوئے۔ مسٹر براؤن چھ سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے بُری طرح تھک گئے مگر ہر سیڑھی انھیں مسرّتوں سے قریب کر رہی تھی اس لیے وہ ہر نئی سیڑھی پر ایک نئے عزم جوش اور ولولے کے ساتھ قدم رکھتے تھے۔ آخر وہ اس عمارت کی چھت پہ پہنچ گئے جہاں کرائے کا کمرہ جنّت کے کسی پُرسکون گوشے کی طرح ان کا منتظر تھا۔ بنگو حسبِ عادت کمرے کے ایک کونے میں بیٹھ کر اُونگھنے لگا۔ کبھی کبھی وہ ایک آنکھ کھول کر اپنے مالک اور اُس کی محبوبہ کے عجیب و غریب کرتب دیکھنے لگتا جو اس کے لیے سرکس کے تماشے کی طرح دلچسپ تھے۔ مسٹر براؤن تنوع پسند تھے اور مارگریٹ آرٹسٹ ہونے کے باعث اُن سے بھی زیادہ تنوع پسند تھی۔ اگر بنگو کُتّا نہ ہوتا تو اسے ان تماشوں میں زیادہ مزہ آتا جیسا کہ گھریلو ملازم اکثر بند دروازوں کے باہر سے تالے کے سوراخ میں آنکھ لگا کر دلچسپ اور حیرت انگیز تماشے دیکھتے ہیں اور پھر اپنے دوستوں کو چٹخارے لے لے کر آنکھوں دیکھا حال سناتے ہیں۔ گھنٹے دو گھنٹے بعد مسٹر براؤن کی واپسی ہوتی اور وہ اپنی قانونی بیوی کے پاس واپس آجاتے۔

لیکن حالات ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہتے۔ موسمِ گرما میں مسٹر براؤن کو چند ہفتوں کے لیے کاروباری سلسلے میں شہر سے باہر جانا پڑا۔ شام کے وقت بنگو بے چین ہو کر دروازہ کھُرچنے لگتا کیونکہ اُسے چہل قدمی کی عادت پڑ گئی تھی۔ مسز براؤن دروازہ کھول کر اُسے گھر سے باہر نکال دیتیں اور بنگو گھوم پھر کر تھوڑی دیر میں واپس آجاتا۔ ایک شام مسز براؤن کا دل گھبرا رہا تھا۔ انھوں نے بنگو کے ساتھ ہوا خوری کا فیصلہ کیا۔ انسانوں کی طرح بنگو بھی عادت کا غلام بن چکا تھا۔ وہ اپنی مالکہ کے آگے آگے دوڑتا رہا اور پھر بنگو کو ایک عمارت میں داخل ہوتے دیکھ کر مسز براؤن حیرت زدہ رہ گئیں۔ جب بنگو تیزی سے عمارت کی سیڑھیاں چڑھنے لگا تو انھیں اور زیادہ حیرت ہوئی۔ انھوں نے بنگو کو آوازیں دیں۔ "بنگو واپس آؤ۔ کہاں جا رہے ہو۔ واپس آؤ ورنہ میں تمھاری ہڈیاں توڑ دوں گی۔"

بنگو نے مالکہ کی دھمکیوں کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ وہ ہر سیڑھی

آسکر وائلڈ

نے دو آدمیوں کو اس بحث میں مُبتلا دیکھا کہ کارخانۂ قدرت کے ضروری، لوگ کون ہوسکتے ہیں۔ ایک کہتا تھا "اگر بڑے بڑے حکمران، عقل مند وزرا، کارگزار نواب اور مخیّر سرمایہ دار اس دُنیا سے اُٹھ جائیں تو نظامِ عالم میں زبردست خلا پیدا ہوجائے!"

دُوسرا اس خیال کی تکذیب کرتا تھا اور کہتا تھا کہ ان کی عدم موجُودگی سے نظامِ عالم میں کوئی فتور نہ پیدا ہوگا!

آسکر وائلڈ نے کہا "تم دونوں خواہ مخواہ وقت ضائع کر رہے ہو۔ اس بحث کا میرے پاس ایسا جواب ہے کہ تم دونوں مطمئن ہوجاؤ گے!"

دونوں آسکر وائلڈ کی صُورت دیکھنے لگے۔

آسکر وائلڈ نے جواب دیا "اگر دُنیا میں ایک ایسی وبا چل جائے جس میں تمام حکمران، وزرا، نواب اور سرمایہ دار چل بسیں، تو مجھے یقین ہے کہ نظامِ عالم میں کوئی فتور نہ پیدا ہوگا۔ لیکن اگر اس وبا میں کاشت کار، ہُنرمند، دھوبی، دوسرے پیشہ ور اور سائنس داں چل بسیں تو نظامِ عالم میں واقعی زبردست انتشار اور خلا پیدا ہوجائے گا۔"

پر مڑ کر نیچے دیکھتا اور جب اپنی مالکہ کو بھی سیڑھیاں چڑھتے دیکھتا تو مطمئن انداز میں سر موڑ کر پھر اوپر جانے لگتا۔ مسز براؤن بنگو کو دھمکیاں دیتی ہوئی اُس کے پیچھے پیچھے عمارت کی چھت پر پہنچ گئیں۔

"بنگو! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" مسز براؤن کو چھت پر بنے ہوئے کمرے سے ایک نسوانی آواز سُنائی دی۔ اُن کے قدم دروازے پر رُک گئے۔ انھیں سُرخ بالوں والی ایک پُرکشش عورت کا چہرہ نظر آیا جو کمرے کے دروازے سے سر نکالے بنگو کو دیکھ رہی تھی۔

"براؤن! کیا تم واپس آگئے؟" سُرخ بالوں والی عورت نے زور سے کہا۔

مسز براؤن دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہوگئیں اور کان لگا کر سُرخ بالوں والی عورت کی یک طرفہ گفتگو سننے لگیں۔ وہ بنگو سے باتیں کر رہی تھی اور بنگو اُس کے سامنے کھڑا ہوا محبت سے دُم ہلا رہا تھا۔

اُس روز مسز براؤن پر پہلی بار یہ انکشاف ہوا کہ مسٹر براؤن کے موٹاپا نہ ہونے کا گنجے والدین یا شام کی چہل قدمی سے کوئی تعلق نہیں ہے اور جب مسٹر براؤن سفر سے واپس آئے تو مسز براؤن اُن کے استقبال کے لیے تیار بیٹھی تھی۔ "میں تمھیں ایک دلچسپ اور حیرت انگیز بات بتاؤں؟" مسز براؤن نے کہا "ہمارا بنگو بہت بدمعاش ہوگیا ہے۔ میں ایک روز اس کے ساتھ ہواخوری کے لیے چلی گئی۔ وہ مجھے ایک عمارت کی چھت پر لے گیا۔ چھت پر ایک کمرہ تھا۔ معلوم ہے، میں نے اس کمرے میں کیا دیکھا؟ شاید تمھیں یقین نہ آئے۔"

"کیا دیکھا؟" مسٹر براؤن کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا اور اُن کا دل ڈوبنے لگا۔

"کمرے کے فرش پر ایک قالین بچھا تھا اور قالین پر سُرخ بالوں والی ایک خوبصورت عورت لیٹی تھی اور ایک مرد اُس کی باہوں میں تھا۔ وہ دونوں اپنے کھیل میں اس قدر ڈوبے ہوئے تھے کہ انھوں نے نہ تو ہماری آمد محسوس کی نہ ہمارے قدموں کی چاپ سُنی۔ میں تو وہ منظر دیکھ کر حیران رہ گئی پھر جب مجھے ہوش آیا تو فوراً وہاں سے بھاگ آئی۔ بنگو بھی میرے پیچھے واپس آگیا۔ چھپ کر اس قسم کے مناظر دیکھنا میری نظر میں بے حد معیوب بات ہے۔ بنگو بہت شیطان ہوگیا ہے۔"

مسٹر براؤن کچھ دیر خاموش رہے "کتّوں کو ہمیشہ باندھ کر رکھنا چاہیے۔ انھیں گھومنے پھرنے کی آزادی دے دی جائے تو آوارہ ہوجاتے ہیں۔" مسٹر براؤن نے کہا۔ اس حقیقت کا احساس انھیں بہت دیر میں ہوا۔

اسی مہینے سے مسٹر براؤن نے اُس کمرے کا کرایہ دینا بند کردیا جہاں وہ شام کو چہل قدمی کرنے جاتے تھے۔ جہاں تک مارگریٹ کا تعلق ہے، اُسے مسٹر براؤن کا بہت دنوں تک انتظار رہا مگر مسٹر براؤن پھر نہیں پلٹے کیونکہ اب وہ یوں ہی دُبلے ہو رہے تھے۔

ایک نوجوان لڑکی کی کہانی

جس کے پاس جوانی کے احساس کے سوا کچھ اور نہیں تھا

خاموش آتش

مغرب سے تازہ تر

دوسری تخلیق سے

نسیم سحر

مِلّی اتنی تیزی سے باورچی خانے میں داخل ہوئی کہ اُس کے ماں باپ چونک پڑے۔ وہ سخت گھبراہٹ میں مبتلا تھی۔ اُس کے ہاتھوں سے دُودھ کی بالٹی گرتے گرتے بچی۔ وہ میز کے ایک کونے سے ٹیک لگا کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ اُس کا سینہ پھولنے اور پچکنے لگا۔ ابھی اُس کے ماں باپ حیران ہی تھے کہ وہ خوف زدہ انداز میں بولی "وہ۔ وہ میرا پیچھا کر رہا تھا۔"

باورچی خانے کی ایک بھدّی سی میز پر مٹّی کے تیل سے جلنے والا مدّھم لیمپ رکھا ہوا تھا اور روشنی پھیلانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اُس کی ناکافی روشنی میں مِلّی کی پتلی پتلی بدہیئت ٹانگیں لرزتی نظر آرہی تھیں۔ اگر روشنی تیز ہوتی تو مِلّی کے چہرے کے مایوسانہ تاثرات بھی صاف دکھائی دیتے۔ اُس کی ماں نے وہ پتلون میز پر پٹخ دی جس کی وہ مرمّت کر رہی تھی۔ اُس نے مِلّی کو غور سے دیکھ کر کہا "کون ہے وہ؟ کس نے تمھارا پیچھا کیا ہے؟"

"ہانسے نے۔" مِلّی نے آبدیدہ ہو کر اپنے خشک بال ایک جھٹکے کے ساتھ پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا "آج تو میں بڑی مشکل سے بچی ہوں ماں! اُس نے..... اُس نے مجھے پکڑ لیا تھا اور....." مِلّی کے رخساروں پر سُرخی سی چھا گئی۔ اُس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں مدّھم مدّھم روشنی میں چمک رہی تھیں۔

"کیا اُس نے..... ؟" ماں اِس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ وہ شدید بے چینی کے عالم میں کرسی سے اُٹھ گئی تھی۔

"نہیں ماں!" مِلّی نے تسلّی دینے کے انداز میں کہا "اگر میں زور لگا کر خود کو چھڑا نہ لیتی تو....."

مِلّی کا باپ دیر سے ایک ہتھوڑے کا معائنہ کر رہا تھا۔ اُس نے اُسے نیچے رکھ دیا اور مِلّی کو گھورنے لگا۔ اُس کی داڑھی ایک ہفتے سے بڑھی ہوئی تھی۔ وہ مضمحل اور بیمار بیمار نظر آرہا تھا۔ اُس نے نحیف آواز میں کرختگی سے پوچھا "اس گڑبڑ میں تم نے سارا دُودھ بھی گرا دیا ہوگا؟ کیوں؟"

"نہیں ابّا!" مِلّی نے جلدی سے بالٹی اُٹھا کر اُس کے نزدیک لے جاتے ہوئے کہا "سارا دُودھ نہیں گرا البتّہ تھوڑا سا ضرور گر گیا ہے۔"

"یہ تھوڑا سا گرا ہے؟" اُس کے باپ نے بالٹی میں جھانکتے ہوئے اُسی لہجے میں کہا "یوں کہو کہ تھوڑا سا باقی بچا ہے۔ دُودھ دوہنے میں بھی تم نے گھنٹوں لگا دیے۔"

"میں کیا کرتی ابّا؟" مِلّی نے منہ بسورتے ہوئے کہا "زنجیر گم ہوجانے کی وجہ سے گائے قابو میں آتی ہی نہیں تھی۔ بار بار اپنی جگہ سے ہٹ جاتی تھی۔"

"اچھا اچھا۔" مِلّی کی ماں نے بیزاری کے ساتھ اپنے شوہر سے

کہا "تم دودھ کے متعلق بعد میں فکر کرتے رہنا۔ اس وقت یہ سوچو کہ اُس ذلیل نے کتنی مذموم حرکت کی ہے؟ جاؤ بندوق اُٹھاکر ابھی اُس کمینے کو تلاش کرو۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ وہ ملّی کا بھی وہی حشر کرے جو اُس نے ششی کا کیا تھا؟"

"یہ سب فضولیات ہیں۔ ہر بات بے سوچے سمجھے آنکھ بند کرکے مت مان لیا کرو۔" ملّی کے باپ نے بے پروائی سے کہا "یہ لڑکیاں جب بالغ ہونے لگتی ہیں تو دیوانی ہو جاتی ہیں۔ عجیب عجیب خیالات ان کے ذہن میں آنے لگتے ہیں۔ ہمیشہ یہی سمجھتی ہیں کہ مرد ان کا پیچھا کر رہے ہیں۔" اُس نے دوبارہ اپنا ہتھوڑا اُٹھا لیا اور ملّی کی طرف اشارہ کرکے کہا "ذرا اس کم بخت کی شکل تو دیکھو۔ چوہیا جیسی لگتی ہے۔ نہ رنگ نہ رُوپ، دِق زدہ سی مریل لڑکی۔ بھلا کون پاگل اس کا پیچھا کرے گا؟ میں کہتا ہوں ہانسے جذباتی ہو کر بھی کم از کم اتنا ذہین ضرور ہے کہ اس جیسی بدصورت لڑکی کی طرف توجہ نہیں دے گا۔ میں یقین ہی نہیں کر سکتا کہ اُس نے اس کا پیچھا کیا ہوگا!"

ملّی نے بڑی بے باکی سے اپنے باپ کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ دیں۔ اُس کی زرد زرد آنکھیں بلّی کی آنکھوں کی طرح چمکنے لگیں۔ اُس نے کہا "یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص اچھّی صورت ہی تلاش کرے۔ دُنیا میں بدصورت لڑکیاں بھی تو ہوتی ہیں آخر۔"

"بکواس بند کرو۔" اُس کا باپ دہاڑا "تمھاری زبان قینچی کی طرح چلنے لگی ہے۔ شرم نہیں آتی اس طرح کہتے ہوئے؟" اُس نے ہتھوڑے کو ایک جھٹکا دیا۔ صرف دستہ اُس کے ہاتھ میں رہ گیا "تمھاری ماں نے تمھیں یہی سکھایا ہے؟"

ملّی کی ماں نے کڑوے لہجے میں کہا "یہ باتیں چھوڑو۔ باہر جاؤ اور اُس حرام زادے کو تلاش کرو۔ ایسا نہ ہو کہ ششی کی طرح ملّی بھی کسی روز باڑے کے پیچھے مُردہ حالت میں پائی جائے اور اُس کے کپڑے بھی ششی کے کپڑوں کی طرح پھٹے ہوئے ہوں؟"

ملّی کے باپ نے ہتھوڑا ٹھیک کرتے ہوئے کہا "چھوڑو بھی ضروری نہیں ہے کہ ششی کو ہانسے ہی نے ہلاک کیا ہو۔ یہ کام کسی اور کا بھی تو ہو سکتا ہے۔"

"ہرگز نہیں۔ یقیناً یہ ہانسے ہی کا کام ہے۔ تم خواہ مخواہ اُس کی وکالت کر رہے ہو حالانکہ تم بھی اچھّی طرح جانتے ہو کہ اُس کی ٹوپی ششی کی لاش کے قریب پائی گئی تھی۔ اُس کا چاقو بھی وہیں پڑا تھا اور پھر اس علاقے میں اُس کے سوا کوئی اور شخص ایسا نہیں ہے جس پر قتل کا شبہ کیا جا سکے۔ تم اُٹھ کر اُسے تلاش کرتے ہو یا نہیں؟" ملّی کی ماں نے پیر پٹخ کر کہا۔

ملّی کے باپ نے بڑی مشکل کے ساتھ زمین سے پیر بلند کرکے لیمپ کی روشنی میں اسٹول پر رکھا۔ پاؤں پر میلے اور پُرانے کپڑے کی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں "تم اچھّی طرح جانتی ہو کہ میرے لیے زیادہ چلنا مشکل ہے۔ میں اس زخمی پاؤں کے ساتھ کہاں تک گھسٹتا پھروں گا؟"

"ہائے تمھارا پاؤں!" ملّی کی ماں نے طنزیہ انداز میں کہا "کیوں باتیں بنا رہے ہو۔ ہلکی سی سوجن ہی تو ہے، ٹوٹ تو نہیں گیا۔"

"مگر میرے لیے تو اسے ہلانا بھی ایک عذاب ہے۔ معلوم نہیں کیوں اتنی زیادہ تکلیف ہونے لگی ہے!"

"شاید وہ ابھی زیادہ دُور نہ گیا ہو۔" ملّی نے کہا۔ وہ اتنی دیر سے بڑے تحمّل کے ساتھ بھولی بھالی لڑکیوں کی طرح اپنے ماں باپ کی نوک جھونک سُن رہی تھی "ہو سکتا ہے وہ اب بھی موقع کی تاک میں کہیں آس پاس ہی موجود ہو۔"

"جائے گا کہاں؟ ایک دو دن میں پکڑ لیا جائے گا۔" ملّی کے باپ نے ٹالتے ہوئے کہا۔ وہ اس وقت باہر جانے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا "سُنا ہے ششی کے معاملے میں پولیس ابھی تک سرگرمی سے اُسے تلاش کر رہی ہے۔ پرسوں اُسے بوڑھے جاسج نے کھلیانوں میں پکڑ لیا تھا مگر وہ کمینہ اُسے دھکّا دے کر بھاگ نکلا۔"

"میں کچھ نہیں جانتی۔ اس وقت پولیس والوں کی بیٹیاں نہیں بلکہ ہماری بیٹی خطرے میں ہے۔ ملّی! تم لالٹین جلا کر لاؤ۔" اُس نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا "اور تم ــــ تم بندوق اُٹھاؤ اور باہر جا کر ایک نظر ڈالو۔ ممکن ہے وہ کہیں دکھائی دے جائے۔"

ملّی نے جلدی سے لالٹین جلائی۔ پُرانی لالٹین کی بتّی سے دھواں نکل کر شیشے کا ایک حصّہ سیاہ کرنے لگا۔ ملّی کے باپ نے بیوی کی حکم عدولی مناسب نہ سمجھی۔ اُس نے بادلِ ناخواستہ اُٹھ کر لنگڑاتے ہوئے اپنی بندوق تلاش کی اور اُس میں ایک کارتوس ڈالا۔ ملّی کی ماں نے اُس کی پتلون کی مرمّت ختم کرتے ہوئے کہا "لو اسے پہن کر باہر جانا۔"

ملّی کے باپ نے اپنی نیکر دیکھی۔ نیکر بے حد بوسیدہ تھی۔ پھر اُس نے پاؤں کی پٹّیاں دیکھیں اور منہ بناتے ہوئے بیوی سے مخاطب ہوا "پتلون پہننے کے لیے مجھے یہ پٹّیاں اُتارنی ہوں گی۔ جیسا کہ تمھیں پیوند لگانے کے لیے پتلون دیتے وقت ہوا تھا حالانکہ ابھی اس کی مرمّت کی ضرورت ہی کیا تھی؟ پھر باہر سے واپسی پر مجھے دوبارہ اس عذاب سے گزرنا پڑے گا۔ نہیں میں اسی طرح باہر جاؤں گا۔ ہانسے کو میری پتلون کی نہیں، بندوق کی فکر ہوگی۔"

ملّی لالٹین اُٹھائے اپنے باپ کے ساتھ ساتھ تھی۔ باپ نے

مشکل سے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ہاں، اب بتاؤ۔ اُس نے کس جگہ تمہیں پکڑنے کی کوشش کی تھی؟"

"باڑے کے بالکل پاس۔ میں جیسے ہی باہر نکلی اُس نے مجھے پکڑلیا..... پھر وہ مجھے اندر لے جانے کی کوشش کرنے لگا۔" ملّی نے لکنت کے ساتھ بتایا۔

"بہت بدذات ہے وہ۔" باپ نے ناک چڑھا کر کہا۔ وہ بار بار اپنی بندوق اِس طرح سنبھال لیتا تھا جیسے اُسے اُس کی ضرورت پڑنے ہی والی ہو۔

باڑا مکان کے سامنے ہی تھا۔ ملّی کی ماں مکان کے دروازے پر کھڑی تھی اور اُن دونوں کو باڑے کی طرف جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی اُسے صرف لالٹین کی حرکت سے پتہ چل رہا ہوگا کہ وہ دونوں آگے بڑھ رہے ہیں۔ پھر جب وہ باڑے کے اندر چلے گئے تو اُسے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔

باڑے کے اندر اُن کی گائے بڑی بے نیازی سے بیٹھی ہوئی جگالی کر رہی تھی۔ گائے نے بے تعلّقی سے لالٹین سمیت دو متحرّک سائے اندر آتے دیکھے اور بدستور جگالی کرتی رہی۔ قریب ہی وہ بیل بھی بندھا ہوا تھا جس نے زور سے پاؤں مار کر ملّی کے باپ کو زخمی کردیا تھا۔ اُس نے بھی اُن پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالی۔ شاید وہ اپنے مالک کے پاؤں پہ پٹّیاں بندھی دیکھ کر لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ملّی نے لالٹین ذرا اونچی کرکے چاروں طرف دیکھا۔ "ابّا! یہاں تو کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں کوئی چھُپ سکے۔ کیا خبر وہ کہاں چھُپا ہوگا؟"

"ہُوں۔ واقعی یہاں تو کوئی چڑیا کا بچّہ بھی نہیں چھُپ سکتا۔" ملّی کے باپ نے تائید کی۔ پھر اُس کی نظر لکڑی کی سیڑھی سے ہوتی ہوئی اُوپر اُس نیم چھتی پر پڑی جہاں چارہ سنبھال کر رکھا جاتا تھا۔ "ہوسکتا ہے وہ مردُود وہاں جا چھُپا ہو۔ اُف میرا پاؤں بہت دُکھ رہا ہے۔"

"ابّا! آپ اُوپر چڑھ کر کم از کم دیکھ تو لیں۔" ملّی نے اُس کے پاؤں کی طرف ہمدردی سے دیکھتے ہوئے تجویز پیش کی۔

"نہیں۔ میرے لیے یہ بڑا مشکل ہے۔ تم ایسا کرو کہ خود لالٹین لے کر سیڑھی پہ چڑھو اور اچھّی طرح اُسے تلاش کرو۔ اگر وہ اُوپر موجود ہے تو یقیناً آج میرے ہاتھ سے بچ کر نہیں جا سکتا۔" ملّی کے باپ نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"اگر..... اگر وہ وہیں ہوا تو مجھے پھر نہ پکڑ لے۔" ملّی نے خوف زدہ آواز میں کہا۔

"اس وقت وہ تمہیں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں یہاں موجود ہوں!"

ملّی سیڑھی پر چڑھ رہی تھی۔ اُس کا باپ بندوق تھامے بالکل تیار کھڑا تھا۔ ملّی نے لالٹین بلند کرکے اچھّی طرح اِدھر اُدھر دیکھا۔

"یہاں تو کوئی نہیں ہے ابّا۔"

پھر وہ سیڑھیوں سے اُترنے لگی۔ جب وہ نیچے اُتر آئی تو اُس کا باپ اپنا پٹّیوں والا پاؤں زمین پر رگڑ کر صاف کر رہا تھا۔ "یہ کم بخت گائے باڑے میں چاروں طرف مٹر گشت کرتی رہی ہے۔ اس کی زنجیر چھوری نہ ہوئی ہوتی تو ہر طرف گوبر تو نہ ہوتا۔"

پھر وہ واپس گھر کی طرف چلنے لگے۔ تھوڑی دُور جا کر ملّی کے باپ نے کہا۔ "بیٹی! کل تم چارہ کاٹ کر نیم چھتی میں سنبھال کر رکھ دینا۔ برف باری کا موسم سر پہ آچکا ہے۔ میں زخمی پاؤں کی وجہ سے فی الحال کسی کام کے قابل نہیں ہوں۔"

◎

باڑے میں چارہ کاٹتے وقت ملّی کو کچھ گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ دھُوپ بہت تیز ہوگئی تھی اور وہ سخت محنت کرنے کی وجہ سے سارے بدن پہ ایک خوش گوار سی نمی محسوس کر رہی تھی۔ اُس کے دبلے پتلے بازوؤں میں خاصی طاقت تھی اس لیے دیر تک کام کرنے کے باوجود وہ تھکی نہیں تھی۔ سہ پہر کے وقت اُس نے دیکھا کہ اُس کی ماں انڈوں کی ٹوکری اُٹھا کر بازار کی طرف جا رہی ہے۔ بازار کا راستہ باڑے ہی کی طرف سے گزرتا تھا۔ جب ماں قریب پہنچی تو ملّی باہر نکل آئی۔ ماں نے کہا۔ "آج تمھاری جگہ میں بازار جا رہی ہوں ملّی! کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ وہ کم بخت تمھیں آج پھر نہ ڈھونڈ رہا ہو۔ تمھارا باپ بندوق لیے کھڑکی سے دیکھ رہا ہے اگر آج ہا نسے باڑے کی طرف آگیا تو زندہ واپس نہیں جائے گا۔"

"لیکن ماں! کہیں وہ راستے میں تمھیں پریشان نہ کرے۔"

"اُس کی کیا مجال ہے؟" ملّی کی ماں نے آنکھیں نکال کر کہا اور ٹوکری سے ایک لمبا چھُرا نکال کر ملّی کو دکھایا۔ "میں اُس کا قیمہ بنادوں گی۔"

جب ملّی نے ماں کو دُور سڑک کے آخر میں غائب ہوتے دیکھا تو اُس نے اپنے ہاتھ کا ٹوکرا زور سے زمین پر پھینک دیا۔ اُسے یقین تھا کہ ماں بازار پہنچتے ہی دوسری عورتوں سے باتیں کرنے میں ایسی منہمک ہوگی کہ اندھیرا ہونے سے پہلے اُسے واپس آنے کا خیال تک نہیں آئے گا۔ ملّی نے سوچا میرا باپ اب تک کھڑکی کے پاس کرسی پر بیٹھا اُونگھ رہا ہوگا۔ اس عالم میں بھلا وہ مستعدی سے باڑے کی طرف کیا توجہ دے سکتا ہے؟ اور اگر وہاں بیٹھ کر لگاتار دیکھتا بھی رہے تو اُسے باڑے کے دروازے کے سوا اور کیا نظر آسکتا ہے؟

ملّی نے چارے کا ایک گٹھا بنایا اور اُسے ایک لمبی رسّی کے

سرے پر باندھ دیا۔ پھر کسی خیال سے اُس کی مٹھیاں بھنچ گئیں اور بدن میں تناؤ پیدا ہونے لگا۔ اُس کی بلّی کی سی آنکھوں میں ایک عجیب چمک پیدا ہو گئی۔ وہ چلرے کا گٹھا گھسیٹ کر سیڑھی کی طرف لے گئی اور پھر نیم چھتی پر جا پہنچی۔ نیم چھتی کا فرش گھاس کے ایک ڈھیر کے سوا بالکل خالی تھا۔ یہاں بہت کم روشنی تھی۔ بلّی چارے کے گٹھے پر بیٹھ گئی۔ اُس نے پسینہ خشک ہونے کا انتظار کیا۔ گھاس کی سوندھی سوندھی خوشبو اُسے بہت اچھی لگ رہی تھی۔

اسی وقت گھاس کے ڈھیر میں حرکت پیدا ہوئی اور سرسراہٹ کی آواز کے ساتھ ایک چہرہ وہاں سے اُبھرا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں والا معصوم چہرہ۔ پھر اُس کی گردن نمودار ہوئی پھر سینہ باہر نکلا۔ بلّی کی نظریں اُس کے چوڑے شانوں اور فراخ سینے پر جم گئیں۔ نوجوان نے خوف زدہ آواز میں پوچھا "کیا ابھی تک وہ لوگ مجھے تلاش کر رہے ہیں؟"

"ہاں ہانسے! وہ انتہائی جوش و خروش سے تمھیں ڈھونڈ رہے ہیں۔ انھوں نے تمھاری تلاش میں کوئی جگہ نہیں چھوڑی۔ چپّا چپّا چھان مارا۔ میرے ابا بہت مشتعل ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ وہ تمھیں دیکھتے ہی گولی مار دیں گے۔"

"ہاں میں نے خود انھیں کل رات یہ کہتے سُنا تھا لیکن.... لیکن بلّی! میں بے قصور ہوں۔ بالکل بے گناہ ہوں۔ میں قسم کھاتا ہوں میں نے ششتی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔" وہ پریشانی کے عالم میں کہہ رہا تھا "تم تو جانتی ہو کہ ششتی میری محبوبہ تھی۔ میں اُس سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ بھلا کوئی شخص اپنی محبوبہ کو مار سکتا ہے؟ اتنی پیاری اور وفادار محبوبہ کو؟ آہ ــ کتنی خوبصورت اور نیک تھی ششتی۔ ٹھنڈے دل سے سوچو۔ میں اُسے کیسے ہلاک کر سکتا ہوں؟ اُسے تو کوئی ایسا آدمی ہلاک کر سکتا تھا جو اُس سے شدید متنفر ہوتا۔"

"لیکن تمھاری بات پر کوئی یقین نہیں کرے گا۔ سب تمھی کو مجرم سمجھ رہے ہیں۔ پولیس کو بھی کامل یقین ہے کہ ششتی کو تمھی نے مارا ہے۔ اُس کی لاش کے پاس تمھاری ٹوپی بھی ملی تھی اور تمھارا چاقو بھی وہیں دستیاب ہوا تھا۔ یہ چیزیں تمھارے جُرم کا بہت بڑا ثبوت ہیں۔"

"لیکن ــ لیکن میں نے اُسے نہیں ہلاک کیا۔ وہ تو محض مذاق میں ششتی نے میرا چاقو چھین لیا تھا اور میں نے اپنی ٹوپی اُسے پہنا دی تھی۔ میری ٹوپی اُس پر کس قدر سج رہی تھی۔ آہ۔" ہانسے نے کلیجا تھام لیا۔

"لیکن اب وہ اِس دُنیا میں نہیں رہی ہانسے!" بلّی نے تلخ لہجے میں کہا اور اُٹھ کر ہانسے کے پاس گھاس پر جا بیٹھی۔ "اب وہ بہت دُور جا چکی ہے۔ تم کب تک اُسے یاد کرتے رہو گے؟ اب تو صرف میں تمھارے پاس رہ گئی ہوں۔ اب تمھیں مجھ سے محبت کرنی چاہیے۔

میری طرف دیکھو، میری آنکھوں میں جھانکو۔ چراغ لے کے ڈھونڈو گے تو مجھ جیسی محبت کرنے والی لڑکی تمھیں کہیں نہیں ملے گی۔" اُس نے چہرہ ہتھیلیوں سے ڈھانپ لیا اور سسکنے لگی۔ چند لمحوں بعد اُس نے حسرت سے ہانسے کی طرف دیکھ کر کہا "مجھے اپنے بازوؤں میں چھپا لو ہانسے! جس طرح تم ششتی کو....."

ہانسے نے جُھکا ہوا چہرہ اُٹھایا اور غور سے بلّی کی طرف دیکھا۔ وہ سوالیہ انداز میں اُسے دیکھ رہا تھا۔ پھر یکایک ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کی کوئی اُلجھن دُور ہو گئی ہو اور جیسے اُس نے کوئی اہم مسئلہ حل کر لیا ہو۔ "بلّی! ایک بات پوچھوں؟"

"ہاں ــ کہو۔"

"کیا تمھی نے ششتی کو ہلاک کیا ہے؟ میرا خیال ہے تمھی ایسا کر سکتی تھیں۔" ہانسے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "بالکل یہی بات ہے۔ تمھیں ششتی سے سخت نفرت تھی نا۔ اُس کی خوبصورتی کی وجہ سے تم اُس سے حسد کرتی تھیں۔ تم نے اُسے قتل کر کے قتل کا الزام مجھ پر لگا دیا ہے اور اب سب لوگ مجھے مجرم سمجھ رہے ہیں۔"

بلّی چند لمحوں تک تاثرات سے عاری چہرے کے ساتھ ہانسے کو گھورتی رہی۔ "فکر نہ کرو ہانسے! تم یہاں بالکل محفوظ ہو۔" بلّی نے اُس کے اور قریب ہوتے ہوئے کہا۔ "جب تک میں اپنی زبان نہ کھولوں، کوئی یہ نہیں جان سکتا کہ تم یہاں چھپے ہوئے ہو۔"

"اس طرح تم انھیں اور زیادہ یقین دلا رہی ہو کہ میں ہی مجرم ہوں۔" ہانسے نے کہا۔ "تم نے کل مجھے دُودھ پلایا اور اپنے باپ کو شاید کوئی اور ہی کہانی سُنائی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بندوق لے کر یہاں آ پہنچا تھا۔ آج تمھاری ماں بھی چھرا لیے میری تلاش میں گھوم رہی ہے۔ تم کتنی عیّار ہو۔"

"آج رات میں تمھارے لیے سیب کا مُربّا بھی لاؤں گی اور کھانے کو جو بھی اچھی چیزیں ملیں گی، لے آؤں گی۔ تمھیں کوئی نہیں پکڑ سکتا۔"

ہانسے بہت دیر تک خاموش رہا پھر ہاتھ ملتے ہوئے بولا "کاش میں کسی طرح یہاں سے فرار ہو کر اتنی دُور چلا جاؤں کہ مجھے جان کا خطرہ نہ رہے۔ بلّی! تم کب مجھے یہاں سے جانے کی اجازت دو گی؟"

بلّی نے ہانسے کی ٹانگ میں بندھی ہوئی زنجیر کی طرف غور سے دیکھا۔ "جب حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔" اُس نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے اُسے دیکھ کر کہا۔ "لیکن ابھی کئی دن تک نہیں۔ بتاؤ تم مجھے چاہتے ہو نا؟"

ضیاء تسنیم بلگرامی

بغداد کے باہر مشرقی جانب حاجی حافظ سید عمر نامی طبیب کا اچھا خاصا کشادہ مکان اس اعتبار سے خاصی شہرت رکھتا تھا کہ یہ حکیم صاحب نہ صرف بلند پایہ طبیب تھے بلکہ حدیث، فقہ، اُصول معقول و منقول اور فلسفے میں بھی اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ پورے عراق کے محدثین اور مشائخ وقت دقیق اور نازک ترین مسائل میں مشورے آپ ہی سے طلب کرتے تھے۔ حافظ عمر کا سلسلۂ نسب حضرت عمر فاروق رضؓ سے مل جاتا تھا۔ ۵۹۸ھ کو بروز جمعہ ان کے گھر میں ایک بچّہ پیدا ہوا، باپ نے بچّے کا نام کمال رکھا، کیونکہ باپ کا ارادہ تھا کہ اس بچّے کو وہ اعلا تربیت اور مروجہ علوم کے ذریعے درجۂ کمال کو پہنچا دیں گے۔

بچّے کی ولادت کے کچھ عرصے بعد اس عہد کے مشہور بزرگ حضرت شاہ فضیل قادری حافظ عمر سے ملنے آئے، انھیں نومولود کی خوشخبری سنائی گئی، شاہ فضیل قادری نے فرمایا "ذرا اس بچّے کو ہمارے پاس تو لاؤ۔ ہم بھی تو دیکھیں اس کمال کو!"

باپ اندر سے بچے کو اٹھا لایا اور شاہ صاحب کی گود میں ڈال دیا۔ شاہ صاحب نے بچّے کو دیکھا اور اس کے مشاہدے میں تا دیر کھوئے رہے، وہ معلوم نہیں اس بچّے میں کیا دیکھ رہے تھے۔ حافظ عمر نے ادب سے سوال کیا "حضرت! اس بچّے میں وہ کون سی ایسی بات ہے کہ آپ اس پر اس استغراق اور محویت سے غور فرما رہے ہیں؟"

شاہ صاحب نے ہوش میں آ کر جواب دیا "حافظ عمر! حضرت غوثِ اعظم کی ایک پیش گوئی سینہ بہ سینہ چلی آ رہی ہے کہ ان کے خاندان میں ایک ولیِ کامل اور ہادیِ افضل پیدا ہو گا، ہم اس بچے میں غوثِ اعظم کی پیش گوئی کی شبیہہ دیکھ رہے ہیں، پیش گوئی پوری ہو چکی ہے اور اب یہ تمھارا فرض ہے کہ اس کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ دو، تم نے اس کا نام کمال رکھا ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ یہ واقعی درجۂ کمال پر فائز کیا جا چکا ہے، اس کا علم وسیع، عمر دراز اور کشف و ریاضت کا مرتبہ سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے گا!"

جب بچے نے ذرا ہوش سنبھالا تو اس کی تعلیم و تربیت کا آغاز ہوا، قرآن پاک کی تلاوت کے دوران کمال اس میں کھو جاتے اور آس پاس کی کچھ خبر نہ ہوتی۔ شاہ فضیل قادری نے کمال کی بابت جو پیش گوئی سالہا سال پہلے کی تھی، ممکن ہے ماں باپ کے ذہن اور حافظے سے محو ہو گئی ہو لیکن کمال کی طبیعت اور مزاج کا حیرت انگیز انداز حافظ عمر کو فکرمند کر دیتا۔ کمال میں دنیا داری کے اطوار مفقود تھے وہ جو کچھ پڑھتے، اس کا عالمانہ اظہار نہ ہوتا اور اس کے مادّی مفاد کی طرف کمال کی طبیعت راغب ہی نہ ہوتی حالانکہ حافظ عمر کی سب سے بڑی خواہش ہی یہ تھی کہ کمال تعلیم کی تکمیل کے بعد طب، فلسفے اور حدیث و فقہ کے بحرالعلوم ہو جائیں اور اس سے مادّی مفاد حاصل کریں۔

کمال کے سامنے قرآنِ پاک کھُلا ہوا تھا اور آیۂ کریمہ پر نظریں جمی ہوئی تھیں "زمین کی سیر کرو اور قدرتِ الٰہیہ کے نشانات دیکھو!"

اس آیت نے دل کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ وہ قدم جو ابھی تک گھر کی حدود یا شہر کے اندر چل پھر کر پرکار کی صورت گردش میں تھے، اس مقررہ دائرے سے باہر نکل گئے اور کمال نے جنگلوں اور صحراؤں کی خاک چھاننی شروع کر دی۔ یہ نئی تبدیلی والدین کے لیے بڑی پریشان کن تھی لیکن معلوم نہیں وہ کون سی قوت تھی جو ان کی زبان پر تالے کی طرح مسلط تھی۔ وہ کمال سے کچھ کہنا چاہتے لیکن قوتِ گویائی جواب دے جاتی۔

یہ مضمون کے تیار کرنے میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے

اخبار الاخیار (شیخ عبدالحق محدث دہلوی) ○ خزینۃ الاصفیا (مفتی غلام سرور لاہوری) ○ الکمال (سید خورشید حسن بخاری) ○ تاریخ فرشتہ (محمد قاسم فرشتہ) ○ تحفۃ الکرام (میر علی شیر قانع)

بیٹے کو گھر سے غائب ہوئے کئی دن گزر چکے تھے، باپ کو تو زیادہ بے چینی نہیں تھی کیونکہ انھوں نے خود کو اس کا عادی سا بنا لیا تھا لیکن ماں کے لیے یہ اطوار ناقابلِ برداشت تھے، وہ کئی دن سے بیٹے کی جدائی کا غم دل میں دبائے بیٹھی تھیں آخر یہ صدمہ برداشت سے باہر ہو گیا وہ گھنٹوں دروازے سے باہر نظریں جمائے بیٹے کی منتظر رہتیں اور ہر دور سے آنے والا کمال کا تصور بن کے اُبھرتا لیکن جیسے جیسے قریب آتا فریبِ نظر ثابت ہوتا۔ آخر انتظار نے اضطراب کو ہوا دی اور انھوں نے شوہر کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ بیٹے کی تلاش میں نکل جائیں اور اس وقت تک واپس نہ آئیں جب تک کمال کو تلاش نہ کرلیں۔ حافظ عمر گھر سے چلے گئے۔ باہر نکل کر دشواری پیش آئی کہ وہ جائیں تو کدھر جائیں شمال جنوب، مغرب یا مشرق کدھر کا رُخ کریں معلوم نہیں وہ اتفاق تھا یا کچھ اور کہ وہ شمال مغرب میں چل پڑے، کتنی دن اور کتنی راتیں تلاش و جستجو میں برباد ہو گئیں۔ لوگوں سے کمال کا حلیہ بتا کے پتہ پوچھتے تو لوگ پوری باتیں سن کر غور سے پریشاں حال حافظ عمر کو دیکھتے اور نفی میں سر ہلا دیتے۔ یہ اور آگے بڑھ جاتے۔ آبادی سے گزر کر ویرانے میں قدم رکھا، انھیں کچھ پتہ نہ تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں کئی بار جی میں آئی کہ وہ واپس چلے جائیں لیکن پھر ایسا محسوس ہوا کہ وہ جہاں بھی جا رہے ہیں خود سے نہیں جا رہے کوئی غیر مرئی قوت انھیں اپنی طرف کھینچ رہی ہے اور وہ بے دست و پا کسی غیر مرئی دھاگے میں بندھے چلے جا رہے ہیں۔ پیر لہولہان ہو گئے اور پنڈلیاں تکان سے اینٹھنے لگیں اسی عالم میں یکایک ان کی نظریں پچاس ساٹھ قدم دور ایک گھنیرے درخت کے سایے میں پڑیں اور وہ اپنی آنکھیں ملنے لگے، وہ جو کچھ دیکھ رہے تھے، اس پر انھیں وہم و گمان کا شبہ ہوتا تھا۔ سامنے درخت کے سائے میں ان کا بیٹا کمال شانِ بے نیازی سے آرام کر رہا تھا، اس طرح کہ داہنے ہاتھ کو تکیہ بنا کے کنپٹی اور سر کو اس پر ٹکا رکھا تھا اور غالباً آنکھیں بند تھیں، بیٹے کی محبت نے جوش مارا اور شفقتِ پدری طوفان کی طرح اُبلنے لگی، یہ تیز تیز قدم اٹھاتے بیٹے کی طرف بڑھے لیکن ابھی چالیس پچاس قدم ہی طے کیے ہوں گے کہ ان سے بیس پچیس قدم دُور ایک مہیب جنگلی درندہ کسی طرف سے نمودار ہو کر راستہ روک کر کھڑا ہو گیا، اس نے اپنی شعلہ بار خوفناک آنکھیں حافظ عمر پر گاڑ دیں۔ یہ خوفزدہ ہو گئے اور بیٹے کی طرف جانے کے بجائے واپسی کے لیے مڑ گئے۔ درندہ کھڑا انھیں گھورتا رہا۔ یکایک انھیں خیال آیا کہ یہ کیا خود غرضی ہے کہ اپنی جان بچا کے بھاگ رہے ہو، آخر کمال بھی تو خطرے میں ہے، درندہ اسے بھی تو ہلاک کر سکتا ہے لیکن مشکل یہ تھی کہ آخر اس درندے کا مقابلہ کس طرح کیا جاتے اور کمال کو اس کی درندگی اور سفاکی سے کس طرح نجات دلائی جاتے۔ حافظ عمر ابھی یہ سب کچھ سوچ ہی رہے تھے کہ درندہ آہستہ آہستہ کمال کی طرف بڑھا۔

حافظ عمر بڑی مشکل میں پھنسے ہوتے تھے، بیٹے کی محبت ان کے پیر پکڑ رہی تھی اور درندے کی دہشت دُور دُور رہنے اور بھاگ جانے پر مجبور کر رہی تھی۔ اب درندہ سوتے ہوئے کمال کے قدموں میں پہنچ چکا تھا۔ وہ کئی بار کمال کے ارد گرد پھرا، اس کے بعد قدموں میں سر رکھ کر لیٹ گیا، حافظ عمر کے کان میں کوئی کہہ رہا تھا "واپس جاؤ، اس لڑکے کا پیچھا مت کرو، یہ درندہ جس سے تو خوفزدہ ہے، وہ سوئے ہوئے کمال کی چوکیداری اور نگہبانی کا فریضہ انجام دے رہا ہے۔"

حافظ عمر وہیں سے واپس ہو گئے اور گھر پہنچ کے مضطرب بیوی کو بتایا "بیوی! ہمارا کمال جس مرتبۂ بلند پر فائز ہو چکا ہے، وہاں دُنیا اور علائقِ دنیا بے معنی اور فضول شے ہیں، اُسے واپس لانا ہمارے اختیار میں نہیں رہا اور نہ یہ مناسب ہے کہ اُسے اس کے مقام سے نیچے لانے کی کوشش کی جائے۔ ہمیں حضرت فضیل قادری کی پیش گوئی یاد آ رہی ہے جو انھوں نے ہمارے جدِ اعلا حضرت غوثِ اعظم کے حوالے سے بیان فرمائی تھی۔ کمال یقیناً مشائخِ کبار میں شامل ہو گیا ہے۔"

بیوی کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ انھیں بیٹے کی مفارقت کا صدمہ بھی تھا اور مرتبۂ بلند پانے کی خوشی بھی، ان کی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو بیک وقت خوشی کے بھی تھے اور غم کے بھی۔ کچھ عرصے بعد کمال گھر واپس آ گئے۔ حافظ عمر نے انھیں سینے سے لگا لیا اور ماں نے پیشانی کے بوسے لیے۔ انھیں جس حال میں درخت کے نیچے دیکھا گیا تھا، اس کا کوئی ذکر نہ کیا گیا، کمال اپنے والدین کے روبرو ادب و احترام سے کھڑے تھے لیکن یہاں کا عالم ہی کچھ اور تھا، بظاہر تو وہ والدین کا احترام بجا لائے تھے لیکن اگر والدین کے دل ٹٹولے جاتے تو معلوم ہوتا کہ ان کے دل میں اپنے بیٹے کے لیے عزت و احترام موجود ہے۔

اتفاق کی بات کہ اسی دن حضرت شاہ فضیل قادری بھی کہیں سے تشریف لے آئے، حافظ عمر نے بیٹے کا ہاتھ اُن کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا "حضرت! اس کی تعلیم و تربیت ہم جیسے ناقصوں کے بس کی بات نہیں، اسے آپ اپنی شاگردی اور مُریدی میں قبول فرما لیں۔"

شاہ صاحب گویا اسی لیے تشریف لائے تھے۔ انھوں نے کمال کو خوشی خوشی اپنی شاگردی اور مُریدی میں لے لیا اور باقاعدہ سلوک و تصوّف کی تعلیم دینے لگے، اب وہ کمال سے شاہ کمال ہو چکے تھے۔ کہتے ہیں کہ شاہ کمال کو حضرتِ غوثِ اعظم سے اسی طرح براہِ راست فیض حاصل تھا، جس طرح حضرت اویسِ قرنی کو رسولِ مقبول ﷺ سے شرفِ دیدار اور شرفِ ملاقات نہ ہونے کے باوجود حاصل تھا۔ حضرت غوثِ اعظم نے اپنا خرقۂ خاص اپنے بیٹے عبدالرزاق کو اس لیے مرحمت فرمایا تھا کہ وہ اسے سلسلہ بسلسلہ اپنے کمالِ روحانی کے ذریعے حضرت شاہ کمال تک پہنچا دیں گے۔ چنانچہ یہ خرقۂ خاص انھیں حضرت فضیل قادری سے حاصل ہو گیا۔ بعد میں یہی خرقہ ایک وسیلے سے حضرت مجدد الف ثانی کو مرحمت فرمایا گیا۔

شاہ کمال سیر و سیاحت کے لیے ایک بار پھر نکل کھڑے ہوئے لیکن اس بار وہ تنہا نہیں تھے۔ ان کے ساتھ ان کے پیر و مرشد شاہ فضیل قادری بھی تھے، ان دونوں نے کئی بار ایک ساتھ حج کیا۔ ان دونوں حضرات نے مختلف ممالک کی سیر کی اور ان سے عجیب و غریب کرامات ظاہر ہوتی رہیں۔ جب شاہ فضیل قادری نے یہ سمجھ لیا کہ شاہ کمال سلوک و معرفت کی جملہ منازل طے کر چکے ہیں تو آپ کو اس مشن سے آگاہ کیا۔ جس کے لیے آپ پیدا کیے گئے تھے اور شاہ فضیل قادری جس مقصد سے ان کی تعلیم و تربیت فرما رہے تھے۔ سنہ ۹۲۰ھ بروز اتوار انہیں خرقۂ خلافت عطا ہوا اور انھیں ہندوستان کی روانگی کا حکم دیا گیا۔ آپ مشہد، نجف اشرف، تبریز اور اصفہان کی سیاحت کرتے ہوئے درۂ گومل سے برصغیر میں داخل ہوئے اور ٹھٹھہ میں قیام فرمایا، جب آپ ٹھٹھے میں تشریف لائے۔ یہاں ہر طرف فقہا اور محدثین کا بڑا زور تھا اور یہاں پابندِ شریعت سادات کے چند خاندان پہلے ہی سے قیام پذیر تھے۔ ان میں سید محمد مدرس کو خاص شہرت حاصل تھی۔

سید محمد مدرس کی یہ عادات بہت مشہور تھی کہ وہ احکامِ شریعت کے نفاذ میں مثالی سخت گیر رویہ رکھتے تھے۔ ان کے حلقۂ درس میں اس عہد کی نامی گرامی شخصیات موجود رہا کرتی تھیں، شاہ کمال بھی اس محفل میں شرکت فرمانے لگے۔ یہ تھے مجذوب سالک ان کے یہاں دنیاداری کے طور طریق مہمل اور فضول تھے۔ اکثر ایسا ہوا کہ ستر پوشی کی جو تعریف ہے شاہ کمال اس پر پورے نہ اترتے، فاضلِ اجل سید محمد مدرس کو یہ بات ناگوار گزرتی، لیکن کسی وجہ سے خاموش رہتے۔ برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ ایک بار جو اس قابلِ اعتراض حالت میں انھیں شریکِ درس دیکھا تو درشت لہجے میں کہا "شاہ کمال! کیا تم جانتے ہو کہ جب سے یہ دنیا وجود میں آئی ہے۔ ایک شخص بھی ایسا نہیں پیدا ہوا جس نے دنیا کی بہترین امّت، امتِ محمدی کو تمھاری طرح ذلیل اور رُسوا کیا ہو!"

آپ اس تلخ بات کو ہنس کر برداشت کر گئے اور سید محمد سے مختلف مباحثِ علمی اور دینی پر مناظرہ و مباحثہ کرنے لگے۔ اس مشغلے سے فارغ ہونے کے بعد شاہ کمال آبادی سے دور چلے جاتے اور ان کے جاتے ہی سید محمد پر ندامت کا دورہ پڑتا اور سوچنے لگتے کہ "میں بھی کتنا احمق ہوں جو اس دیوانے سے بحث و مباحثے میں الجھتا ہوں، میں ایک بااختیار اور بااثر انسان ہوں، مجھے بحث و مباحثے میں بیکار وقت ضائع کرنے کے بجائے اس دیوانے کو آبادی سے نکال باہر کرنا چاہیے۔ اگر میں ایسا کروں گا تو گویا اپنا شرعی فریضہ انجام دوں گا!"

لیکن دوسرے دن جب آپ سید محمد کے حلقۂ درس میں تشریف لاتے تو شاہ کمال کا کچھ ایسا رعب طاری ہوتا کہ ان کی شان کے خلاف ایک لفظ بھی نہ ادا کر سکتے۔ کئی بار سید محمد نے اپنے اس ارادے کا ذکر شریکِ درس طلبہ سے بھی کر دیا اور انھیں حکم دیا کہ جب دوسرے دن شاہ کمال قابلِ اعتراض حالت میں شریکِ درس ہوں تو سید محمد کو ان کے ارادے اور فیصلے کی یاد دلا دی جائے۔ چنانچہ اس ہدایت کے دوسرے دن جب شاہ کمال قابلِ اعتراض حالت میں حلقۂ درس میں شامل ہوتے اور سید محمد کی قوتِ گویائی جواب دے گئی تو ایک شاگرد ان کے پاس پہنچا اور ان کے کان میں چپکے سے عرض کیا۔

"حضورِ والا! کل آپ نے فرمایا تھا کہ شاہ کمال کو قابلِ اعتراض حالت میں دیکھ کر محفل سے نکلوا دیں گے اور یہ کہ آپ کو آپ کے اس ارادے اور فیصلے کی یاد دلا دی جائے۔ چنانچہ میں اس کی یاد دہانی کے لیے حاضر ہوں، جو قدم مناسب سمجھیں، اُٹھائیں"

سید محمد اپنے شاگرد کی باتیں نہایت غور سے سنتے رہے اور آخر میں اپنے زانو پر سر رکھ کر چپ چاپ بیٹھ گئے۔ یہاں تک کہ شاہ کمال نے حلقۂ درس سے اُٹھ کر ویرانے کی راہ لی۔ ان کے جاتے ہی سید محمد ندامت میں ڈوب گئے، وہ اپنے شاگردوں سے آنکھ ملانے کی بھی ہمت نہ رکھتے تھے۔ کیونکہ انھوں نے اپنے شاگردوں کے سامنے حد درجہ بزدلی کا ثبوت دیا تھا یہ کیا کہ شاگرد تو انھیں ان کے

فیصلے اور ارادے سے مطلع کریں اور وہ سید محمد کمال کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھا سکیں۔ وہ شرمسار اور نادم سر جھکا کر بیٹھ جائیں۔ آخر ایک گستاخ اور صاف گو شاگرد بھی سامنے آیا اور کہا "سید صاحب! جب وہ مجذوب آپ کے سامنے آتا ہے تو آپ کی قوتِ گویائی جاتی رہتی ہے اور آپ گم صم بیٹھے رہ جاتے ہیں۔ لیکن جب وہ چلا جاتا ہے تو اس پر شرمسار نظر آتے ہیں کہ آپ اسے اپنے حلقۂ درس سے دھتکار کیوں نہ سکے اور میرا خیال یہ ہے کہ جو کام آپ کسی وجہ سے انجام نہیں دے سکتے۔ اس پر نادم یا شرمسار ہونے سے حاصل؟"

سید محمد شاگرد کی بات بھی برداشت کر گئے۔ شاگردوں کے سامنے مزید نہ بیٹھا جا سکا، معذرت کر کے زنان خانے میں چلے گئے۔ وہاں ان کی بہن بھی نہایت فکرمند اور اُداس بیٹھی ہوئی تھی۔ بھائی بھی اداس تھا اور بہن بھی۔ سید محمد کی یہ بہن کوئی معمولی عورت نہ تھی۔ زہد و تقوے میں اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ بہن نے فکرمند اور شرمسار بھائی کو دیکھا تو دریافت کیا "بھائی خیریت تو ہے؟ آپ اداس کیوں ہیں؟"

بھائی نے جواب دیا "بہن! میں بڑی مشکل میں پھنس گیا ہوں، سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں؟"

بہن نے پوچھا "کچھ مجھے بھی بتائیے، شاید میں ہی کوئی ایسا مشورہ دے سکوں جس سے آپ کی فکرمندی دُور ہو جائے!"

بھائی نے کچھ کہنے سے پہلے ذرا سکُوت اختیار کیا۔ بہن کے سامنے اس نیم برہنہ مجذوب کا ذکر کرتے ہوئے انھیں شرم سی محسوس ہو رہی تھی۔ بہن نے خاموش بھائی سے مزید کہا۔ "آپ کی باتیں سننے کے بعد میں بھی ایک مسئلہ آپ کے سامنے رکھنے والی ہوں اور وہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ زبان شرم کی وجہ سے ساتھ دینے سے انکار کرے گی لیکن اس کے باوجود میں اسے زبان پر لانے اور آپ سے اس سلسلے میں مشورہ کرنے پر مجبور ہوں!"

سید محمد نے ذرا ہمت پیدا کی، بولے "بہن تم نے اس نیم برہنہ مجذوب کا ذکر تو سنا ہی ہوگا روزانہ ہماری مرضی کے خلاف قابلِ اعتراض حالت میں ہمارے حلقۂ درس میں شریک ہو جاتا ہے میں کئی دن سے اس کوشش میں ہوں کہ اسے حلقے سے نکال باہر کروں اور اگر خدا ذرا اور ہمت دے دے تو اسے آبادی سے نکال باہر کروں کیونکہ یہ صرف میری ہی منشا نہیں ہے شرع بھی یہی کہتی ہے اور اخلاقی ذمہ داریاں بھی یہی بتاتی ہیں!"

بہن نے پوچھا "پھر آپ ایسا کرتے کیوں نہیں؟"

بھائی نے جواب دیا "لیکن جب وہ مجذوب ہمارے حلقۂ درس میں پھر اسی قابلِ اعتراض حالت میں آ بیٹھتا ہے تو ہماری قوتِ گویائی ہی ہم سے چھین لی جاتی ہے آخر ایسا کیوں ہے؟"

بہن نے اس کے بعد نہ تو کوئی بات پوچھی۔ نہ کسی بات کی وضاحت چاہی اور نہ ہی کسی قسم کا مشورہ دیا۔ بھائی سکوت اختیار کیے بہن کی شکل دیکھتا رہا۔ پھر پوچھا "تم کیوں چُپ ہو گئیں کچھ اور کہو، میں تم سے مشورہ لینے آیا ہوں!"

بہن نے آہستہ سے کہا "میں نے اس مجذوب کو آج تک نہیں دیکھا۔ لیکن آپ حیرت کریں گے کہ میں جس موضوع پر آپ سے بات کرنے والی ہوں یا مشورہ طلب کرنے والی ہوں، اس میں اس نیم برہنہ مجذوب کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔"

سید محمد اور زیادہ فکرمند ہو گئے۔ کچھ عجیب سوالیہ انداز سے بہن کی صورت دیکھنے لگے۔

بہن نے کہا "آپ میری صورت کیا دیکھ رہے ہیں۔ یہ آپ کو ہو کیا گیا ہے؟"

سید محمد نے جواب دیا "بہن تم دُعا کرو کہ میں اپنے فیصلے پر قائم رہوں اور شاہ کمال کو آبادی کے باہر بھیج دوں!"

بہن نے اپنی بات چیت کی ابتدا نہایت پُراثر لہجے میں کی "ایک ایسی بات کہ اگر کہتی ہوں تو آپ اسے سن کر مشتعل بھی ہو سکتے ہیں اور نہیں کہتی تو اس بات کا ڈر رہتا ہے کہ آپ سے ایک ناقابلِ تلافی غلطی ہو جانے کا امکان ہے اور میں آپ کو اس سے بچانا چاہتی ہوں!"

سید محمد نے پُوری توجہ سے بہن کی بات سنی اور بے چینی سے پوچھا "کیا بات ہے؟ صاف صاف بتاؤ!"

بہن نے جواب دیا "اس مجذوب کو ستانے یا اُس کی دل آزاری کی غلطی سے خود کو بچائیے!"

سید محمد نے ناگواری سے کہا "تم اس کی کیوں سفارش کر رہی ہو؟ اس نیم برہنہ مجذوب کی، جو خلافِ شرع حرکات کا مرتکب ہوتا ہے۔"

بہن نے جواب دیا "بھائی! میں نے دو دن پہلے یہ خواب دیکھا کہ رسول مقبولؐ فرما رہے ہیں کہ اس نیم برہنہ کی بیعت کر لو۔ میں شک و شبہے میں پڑ گئی، لیکن کل رات میں نے پھر وہی خواب دیکھا کہ رسول اللہؐ فرما رہے ہیں کہ ہم نے تمہیں حکم دیا ہے کہ اس نیم برہنہ شخص کی بیعت کر لو۔ اس پر میں نے ڈرتے ڈرتے حضورؐ سے کہا "یا رسول اللہؐ! میرے بھائی تو احکامِ شریعت کے تحت اس شخص کو آبادی سے نکال دینے کا ارادہ کر چکے ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے کہ علما انبیاؑ کے وارث ہوتے ہیں۔ میرے بھائی بھی عالم ہیں اگر میں نیم برہنہ شخص کی بیعت کروں گی تو کیا انبیاؑ کے وارث میرے عالم بھائی کی مخالفت نہیں ہوگی" جواب میں رسول اللہؐ نے فرمایا۔ کمال بھی عالم ہے اور عالم ہونے کے ساتھ ساتھ مجذوب بھی ہے اور اسے یہاں تیری ہدایت کے لیے لایا گیا ہے۔ ہمیں تیرے بھائی کی فلاح و بہبُود منظور ہے۔ تیرا بھائی سیّد محمد اس مجذوب کی کیمیائی نظر سے عارف ربّانی بن جائے گا۔ اور عنقریب اسے بھی بشارت دی جائے گی۔" بہن یہ کہہ کر بھائی سے کہنے لگی "اب آپ فرمائیں کہ ہم ان حالات میں کیا کریں۔ میں تو آپ سے یہ درخواست کروں گی کہ اس نیم برہنہ شخص کی بابت جو قدم بھی اٹھائیں سوچ سمجھ کر اٹھائیں۔ ایسا نہ ہو کہ بعد میں شرمندگی اٹھانی پڑے۔"

سید محمد سب کچھ سن کر کسی سوچ میں پڑ گئے۔ کچھ دیر بعد سر اٹھا کر کہنے لگے "شیطان کی تو یہ مجال نہیں کہ وہ توبہ نعوذ باللہ رسول اللہؐ کی شکل میں آ کر اس قسم کی باتیں کرے تمہارا خواب میرے لیے پریشان کن ہے اور میں فکرمند ہوں کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔" پھر پوچھا "بہن کہیں ایسا تو نہیں کہ تم اس نیم برہنہ شخص کی بابت بہت کچھ سوچتی رہی ہو اور تمہارے یہی خیالات خواب میں متشکل ہو گئے ہوں!"

بہن نے جواب دیا "نہیں ایسی کوئی بات نہیں!"

سید محمد نے خاموشی اختیار کی، پورا دن خاموشی میں گزر گیا رات آئی، کھانے پینے کا ہوش ہی کسے تھا، انھیں بار بار یہ خیال آتا کہ رسول اللہؐ کا فرمان کس طرح غلط ہو سکتا ہے دیر تک جاگتے رہے انہیں دو باتیں پریشان کر رہی تھیں۔ ایک تو یہ کہ اگر وہ نیم برہنہ مجذوب کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھاتے تو اس سے وہ اس گناہ کے مرتکب ٹھہرتے ہیں کہ علم شریعت رکھنے کے باوجود وہ اس کے نفاذ میں ناکام رہے اور اگر شریعت کا حکم بجا لاتے ہیں تو اب اس بات کا احتمال پیدا ہو گیا ہے کہ رسول اللہؐ کے فرمان سے روگردانی کے گناہگار ٹھہریں گے۔ اس فکر نے انھیں بہت پریشان کر دیا۔ اسی پریشانی میں ان کی آنکھ لگ گئی۔ کچھ ہی دیر بعد انھوں نے بھی خواب میں دیکھا کہ رسول اللہؐ فرما رہے ہیں "سیّد محمد! ہم چاہتے ہیں کہ تو نے علم سے جو قیل و قال پائی ہے اور اس کے چنیں چناں میں مبتلا رہتا ہے، اس سے تجھے نجات بخشیں، تیرے سینے میں اس مجذوب سالک ہی کی خاطر امر شرعی مضبوط کیا گیا ہے۔ اس کی مخالفت سے باز آ اور اس سے دوستی اور ہدایت کا طالب ہو، یہ تیرے ہی لیے یہاں بھیجا گیا ہے!"
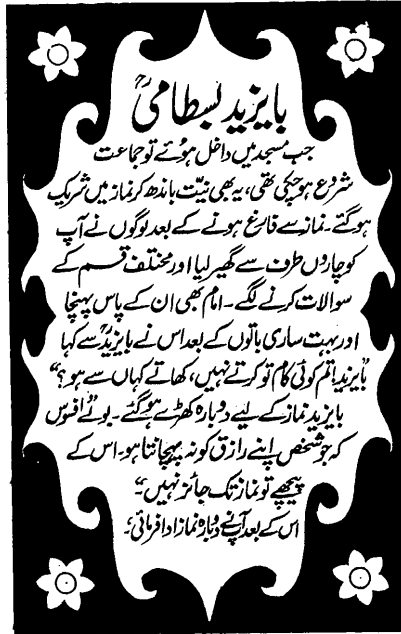
دوسرے دن صبح شاہ کمال سیّد محمد کے حلقۂ درس میں شامل نہیں تھے، سیّد محمد کی بے چین نظریں انھیں تلاش کرتی رہیں جب شاہ کمال کے دیدار سے محروم رہیں تو انھوں نے سلسلۂ درس موقوف کیا، شاگردوں کے سامنے اپنا خواب بیان کیا۔ پھر خاندان والوں کو جمع کیا اور انھیں بھی اس خواب سے مطلع کیا، اور ان سبھوں کو لے کر یہ خود شاہ کمال کی خدمت میں پہنچ گئے۔ اور عاجزی سے کہا "یا باکمال! ہم اپنی کم علمی اور کم نظری سے آپ کو دُکھ پہنچانے کے مرتکب ہوتے رہے ہیں۔ اب ہم معافی طلب کرنے آئے ہیں۔ آپ ہمیں معاف فرما کر اپنی بیعت سے مشرف فرمائیں!"

شاہ کمال نے کچھ دیر تک سیّد محمد کے چہرے پر نظریں گاڑے

بایزید بسطامیؒ

جب مسجد میں داخل ہوئے تو جماعت شروع ہو چکی تھی، یہ بھی نیّت باندھ کر نماز میں شریک ہو گئے۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد لوگوں نے آپ کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور مختلف قسم کے سوالات کرنے لگے۔ امام بھی ان کے پاس پہنچا اور بہت ساری باتوں کے بعد اس نے بایزیدؒ سے کہا "بایزید! تم کوئی کام تو کرتے نہیں، کھاتے کہاں سے ہو؟"
بایزید نماز کے لیے دوبارہ کھڑے ہو گئے۔ بولے "افسوس کہ جو شخص اپنے رازق کو نہ پہچانتا ہو۔ اس کے پیچھے تو نماز تک جائز نہیں۔"
اس کے بعد آپ نے دوبارہ نماز ادا فرمائی۔

رکھیں، ان کی نظرِ کیمیا اثر اپنا کام کر گئی اور سیّد محمد کا سینہ گداز ہو گیا علم کی خشک چوب، کیف و جذب سے تر ہو گئی۔ اب وہ عالم ہونے کے ساتھ ساتھ صاحبِ جذب و کیف بھی ہو گئے تھے۔

سیّد محمد اور ان کے تمام رشتے دار اور شاگرد شاہ کمال سے بیعت کرنے کی سعادت سے سرفراز ہوئے!

ٹھٹھے میں رہتے ہوئے شاہ کمال کو ڈھائی سال گزر چکے تھے اب ان کا مقصد پورا ہو چکا تھا، انھوں نے یہاں سے ملتان کی راہ لی۔ ملتان میں ان دنوں حمید خان کی حکومت تھی اور یہ شیر شاہ سوری کی طرف سے حکومت کر رہا تھا۔

حمید خان نے آپ کی بڑی آؤ بھگت کی لیکن آپ نے ان تکلفات سے خود کو بچایا۔ کچھ دن ایک کٹیا بنا کے قیام فرما رہے پھر لدھیانہ چلے گئے۔ لدھیانے سے پایل (سرہند) کا رُخ کیا۔ پایل سے کیتھل پہنچے اور یہیں مستقل قیام فرمایا۔ مشرقی پنجاب کا یہ شہر ضلع کرنال کی ایک تحصیل ہے اور دہلی سے ۱۲۴ میل دور واقع ہے۔ اس سے ذرا فاصلے پر ہندوؤں کا گڑھ تھانیسر (کورو کشیتر) واقع ہے جسے اب عرفِ عام میں پانی پت کہتے ہیں جہاں ہندستان کی فیصلہ کن جنگیں ہوتی رہی ہیں اور یہیں شمس الدین التمش کی بیٹی رضیہ سلطانہ کا مزار ہے۔ ہندو روایت کے مطابق کیتھل کو ہنومان نے آباد کیا تھا۔ چونکہ یہاں بندروں کی بہتات تھی۔ سنسکرت میں کپس بندر کو اور تھل رہنے کی جگہ کو کہتے ہیں پہلے یہ کپس تھل تھا لیکن امتدادِ زمانہ نے اسے کپس تھل سے کیتھل کر دیا۔ یہیں وہ جگہ ہے جسے استھان انجنی کہتے ہیں۔ انجنی ہنومان کی ماں کا نام تھا۔ استھان انجنی ایک مندر ہے جسے ہنومان کی ماں سے منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ ہندوؤں میں نہایت قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ جب شاہ کمال یہاں تشریف لائے، کفر و الحاد کا بڑا زور تھا۔ شاید اسی کفر و ضلالت کی تاریکی کو دور کرنے کے لیے ہی شاہ کمال کو یہاں بھیجا گیا تھا۔

کیتھل میں ایک تالاب کے کنارے ایک ہندو درویش باوا ستیل داس لوگوں کو ایک عجیب و غریب کرشمہ دکھایا کرتا تھا۔ وہ اپنی انتڑیاں باہر نکال لیتا اور اسے خوب اچھی طرح صاف کر کے دوبارہ پیٹ میں رکھ دیتا، ہندو درویش کا یہ کرشمہ لوگوں میں خوش فہمی اور خوش عقیدگی کا باعث بنا ہوا تھا۔ ہر طرف اس کا چرچا تھا اور لوگ باوا کی زیارت اور درشن کے لیے دُور دُور سے آتے اور اپنی آنکھوں سے یہ حیرت انگیز تماشا دیکھتے۔ ایک دن شاہ کمال کیتھل کے ویرانے سے تشریف لا رہے تھے کہ تالاب کے کنارے لوگوں کا ہجوم دیکھ کر رک گئے اور ہجوم کو چیر کر باوا ستیل داس کے روبرو پہنچ گئے۔ آپ نے ہندو درویش کو اپنی انتڑیاں صاف کرتے دیکھا تو باآوازِ بلند ارشاد فرمایا۔

”خوب۔ اس کھیل سے تیرا مقصد کیا ہے؟ اگر صفائیِ قلب مقصود ہے تو اس کا اس سے کوئی تعلق نہیں اور اگر اس سے شہرت کی حصولیابی مقصود ہے تو اور بات ہے!“

شاہ کمال نے جواب کا انتظار بھی نہ کیا اور اپنی راہ لی، لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ باوا ستیل داس اپنی آنتوں کو پیٹ میں رکھنے کی بار بار کوشش کرتا اور ہر بار ناکام رہتا، وہ عاجز آ گیا شاہ کمال کے کلمات اس کے کانوں میں پڑ چکے تھے اس نے لوگوں سے پوچھا ”لوگو! ابھی جو شخص یہاں آیا تھا اور میری ریاضت پر چند لفظوں پر مشتمل کلمات تنقید ادا فرمائے تھے وہ کون تھا؟“

کسی نے جواب دیا ”یہ ایک مسلمان بزرگ ہیں جو کہیں باہر سے تشریف لائے ہیں!“

ہندو درویش نے کہا ”یہ شخص مجھے اذیت میں مبتلا کر گیا ہے۔ آنتوں کے نکالنے اور دوبارہ ان کی جگہ واپس رکھنے کا جو کام میں روزانہ، معمول کے مطابق انجام دیا کرتا تھا۔ آج میں اس میں ناکام ہو رہا ہوں، ہو نہ ہو یہ اس مسلمان درویش کی نظر کا اثر ہے کہ میں بے اثر ہو گیا ہوں!“

ابھی وہ لوگ بھی جو ابھی تک شاہ کمال کی طرف متوجّہ نہ ہوئے تھے ہندو درویش کی بات نے انھیں بھی شاہ کمال کی طرف متوجہ کر دیا مجمع میں سے کسی نے دریافت کیا ”کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ شاہ کمال تم سے بڑا درجہ رکھتے ہیں؟“

ہندو درویش نے جواب دیا ”میں یہ کہنا ہی نہیں چاہتا بلکہ دل کی گہرائیوں سے اس کا اعتراف کر رہا ہوں کہ شاہ کمال سے میرا کوئی مقابلہ نہیں۔ وہ ایک پہنچے ہوئے ولیِ کامل ہیں اور میں ایک معمولی انسان!“

اس کے بعد اس نے لوگوں سے کہا ”تم میں سے جو لوگ شاہ کمال کی اقامت گاہ سے واقف ہیں مجھے وہاں تک لے چلیں اگر میں وہاں تک تا دیر نہ پہنچ سکا تو یہ طے ہے کہ میں زندہ نہ بچوں گا۔ ہلاک ہو جاؤں گا۔ میں آنتوں کو ان کی جگہ رکھنا چاہتا ہوں لیکن ناکام رہتا ہوں۔ اب آخری صورت یہی رہ گئی ہے کہ میں ان کے قدموں میں غلامانہ پہنچوں اور درخواست کروں کہ وہ میری آنتیں پھر سے ان کی جگہ پر پہنچا دیں!“

ہندو درویش لوگوں کے ہجوم میں اس شان سے چلا کہ اس کی آنتیں دونوں ہاتھوں میں تھیں اور وہ رک رک کر آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا اور ہر ہر قدم پر آہ آہ کرتا جا رہا تھا۔ جو لوگ ہمیشہ اس کے شعبدے سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ آج اس کی بے بسی پر ہنس رہے تھے اور ان کی نظر میں شاہ کمال کا مرتبہ بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔

شاہ کمال اپنے حجرے میں تشریف فرما تھے کہ انھیں ہندو درویش کی آواز سنائی دی ”بابا کمال! ابھی کچھ دیر پہلے جس گناہ گار سے آپ نے کچھ دریافت فرمایا تھا وہ جواب دہی کے لیے خود حاضر ہو گیا ہے یا تو سامنے آ کر اسے اپنے دیدار سے فیض یاب فرمائیں ورنہ حکم دیں کہ یہ عاجز خود حاضر ہو جائے اور اپنے دل کی تاریکی کا علاج کرائے!“

شاہ کمال حجرے سے نکلے اور ہندو درویش کو اپنے قریب بلایا، اسے نظر بھر کے دیکھا اور ارشاد فرمایا۔

”تماشا تو اچھا دکھا لیتے ہو لیکن مریض تم بھی ہو، اپنا علاج کراؤ!“

ہندو درویش کی آنتیں خود بخود پیٹ میں چلی گئیں، وہ آپ کے قدموں میں گر گیا اور روتا ہوا بولا۔

”حضرت! میں اپنا علاج کس سے کراؤں گا۔ اب تو آپ ہی نظرِ کرم فرمائیں گے تو کچھ بھلا ہوگا۔“ اس نے شاہ کمال کے پیر پکڑ لیے۔ شاہ کمال نے اُسے اٹھایا اور اپنا دستِ مبارک اس کے سینے پر پھیر دیا ہندو درویش کی دُنیا ہی بدل گئی۔ وہ مسلمان ہو گیا اور شب و روز آپ ہی کی خدمت میں رہنے لگا۔ بعد میں وہ خود اتنی ترقی کر گیا کہ شاہ کمال سے خرقۂ خلافت حاصل کیا۔

یہ عجیب ستم ظریفی تھی کہ باوا ستیل داس نے تو اسلام قبول کر لیا اور شاہ کمال کی عظمت اور بزرگی کا دل کی گہرائی اور سچائی سے اقرار کر لیا لیکن کیتھل کے بعض مسلمان انھیں خاطر ہی میں نہ لاتے تھے۔ ان منکرین میں کیتھل کے مفتیان پیش پیش تھے۔ یہاں مفتیوں کے کئی خاندان آباد تھے اور یہ لوگ خود کو بہت بڑا عالم اور علومِ دینی کا منتہی سمجھتے تھے۔ ان کی نظر میں شاہ کمال کی حیثیت مخبوط الحواس دیوانے جیسی تھی۔ شاہ کمال ان کی تکلیف دہ باتیں ایک عرصے تک برداشت کرتے رہے۔ کیتھل کے مفتی بدقسمتی سے یہ نہیں جانتے تھے کہ شاہ کمال حد درجہ جلالی واقع ہوتے ہیں وہ چشتیہ سلسلے کے علاء الدین صابر کلیری سے کم جلال نہ رکھتے تھے۔

کیتھل کے مفتیوں کا یہ حال تھا کہ ان کی تقریباً پانچ سو پالکیاں نکلا کرتی تھیں اور پوری مسلم آبادی ان کے علم و فضل کی معتقد و معترف تھی۔ شاہ کمال کی تشریف آوری نے ان کے عقیدتمندوں کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا۔ اب عقیدت مندوں کی تعداد شاہ کمال کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔ مفتیوں نے شاہ کمال کا لوگوں سے بڑا ذکر سن رکھا تھا اور روز بروز اس میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا مفتیوں نے طے کیا تھا کہ شاہ کمال کے اثر کو کسی بھی طرح کم ہی کرنا پڑے گا۔ اس مہم کا آغاز اس طرح ہوا کہ مفتیوں نے اپنے عقیدت مندوں اور پرستاروں سے یہ مشہور کرانا شروع کر دیا کہ شاہ کمال لوگوں کو گمراہ کر رہا ہے۔ اور اس سے لوگوں کو دور دور بھاگنا چاہیے۔

مفتیوں کی اس تلقین کا یہ اثر ہوا کہ ان کے پرستاروں اور معتقدوں نے شاہ کمال کو ستانا شروع کر دیا۔ شاہ کمال مفتیوں کی سختیاں اور اذیتیں برداشت کرتے رہے اور منہ سے بددعا کا ایک لفظ بھی نہ ادا کیا۔

صبح کا وقت تھا، فجر کی نماز کے لیے نمازی مسجد میں جمع ہو رہے تھے۔ کچھ لوگ وضو کر کے ہاتھ منہ پونچھ رہے تھے اور کچھ وضو کر رہے تھے۔ وضو کرنے والوں میں شاہ کمال بھی تھے ان کے پاس ہی ایک مفتی، انھیں تنقیدی نظروں سے دیکھ رہا

حضرت رابعہ بصری

نے نماز کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور رقّت سے گویا ہوئیں ”اے اللہ! اگر میں جہنّم کے خوف سے تیری عبادت کرتی ہُوں تو، تو مجھے جہنّم میں ڈال دے، اور اگر جنّت کی طمع میں عبادت کرتی ہُوں تو تو مجھے جنت سے محروم کر دے لیکن اگر میں تیری عبادت تیرے لیے کرتی ہوں تو پھر میں خواہش کروں گی کہ تو میرا بن جائے۔“

تھا۔ اس کی آنکھوں اور چہرے پر پائی جانے والی خشونت بتا رہی تھی کہ آج کی فضا اچھی نہیں اور دونوں فریق ایک دوسرے کے مقابل کچھ کر گزرنے کے لیے موجود ہوتے ہیں۔ شاہ کمال مسح فرما رہے تھے۔ مفتی نے مذاق اڑانے کے انداز میں طنزیہ مسکراہٹ سے کہا۔ "تو کیسا مسلمان ہے کہ تجھے مسح کرنے کی بھی تمیز نہیں!"

آپ نے دوبارہ مسح فرمایا اور نہایت نرمی سے کہا۔
"اب تو ٹھیک ہو گیا بھائی؟"

مفتی کی خشونت اور تکبر میں کچھ زیادہ ہی اضافہ ہو گیا رعونت سے جواب دیا۔ "عقل مند آدمی! اس طرح بھی نہیں"
آپ نے سہ بارہ مسح کرتے ہوئے فرمایا۔ "اس طرح؟"
مفتی نے جواب دیا۔ "اس طرح بھی نہیں۔"
آپ نے ناگوار انداز میں چوتھی بار مسح فرماتے ہوئے پوچھا۔ "اور اب؟"
مفتی نے اسی حاسدانہ انداز میں جواب دیا۔ "اب بھی نہیں!"

اب شاہ کمال پر جلالی کیفیت ہو گئی۔ آپ نے اپنے سر کو بالوں سے پکڑ کر کھینچ لیا، سر ہاتھ میں آ گیا، اسے پانی کے حوض میں پھینک دیا، سر سے آواز آ رہی تھی۔ "کیا اس طرح؟"

جو لوگ ادھر متوجہ تھے ان کے ہوش و حواس جاتے رہے حوض کے اندر سے دوسری آواز بھی سنائی دی۔ "لو اب تو مسح ٹھیک طرح سے ہو گیا!" اور اس دوسری آواز کے ساتھ ہی مفتی کا سر بھی حوض ہی میں پہنچ گیا۔ جو لوگ اس عبرت انگیز منظر کو دیکھ رہے تھے وہ خوفزدہ ہو کر ادھر ادھر منہ چھپانے لگے لیکن یہ بات اس سے بھی عجیب دیکھی کہ انھوں نے شاہ کمال کو صحیح سلامت مسجد سے نکلتے دیکھا اور مفتی کا بے جان اور بے سر جسم وہیں پڑا رہ گیا۔

مفتیوں کی بستی میں کہرام برپا ہو گیا اور کیتھل والے سراپا اعجاز شخص شاہ کمال کی خدمت میں جوق در جوق حاضری دینے لگے لیکن مفتیوں کی رعونت کا اب بھی وہی حال تھا وہ اسے شاہ کمال کا سحر قرار دے رہے تھے۔ انھوں نے یہ مشہور کرنا شروع کر دیا کہ شاہ کمال ایک شعبدہ باز ساحر ہے جو الٹے سیدھے شعبدے دکھا کر لوگوں کو گمراہ کر رہا ہے۔ شاہ کمال مفتیوں کی باتیں پھر برداشت کرنے لگے لیکن جب یہ باتیں حد سے بڑھ گئیں تو آپ نے نہایت جوش سے فرمایا۔

"مفتیوں کی جڑ اللہ اور شاہ کمال نے اکھاڑ پھینکی"۔

اس کے بعد مفتیوں پر وہ آفت نازل ہوئی کہ اللہ کی پناہ۔ مفتیوں پر نت نئی مصیبتوں کا نزول شروع ہوا، وہ تیزی سے موت کا شکار ہونے لگے، پورے پورے خاندان ہلاک ہو گئے، جو گھر کل تک آباد اور بھرے پرے تھے، آج وہاں خاک اڑ رہی تھی۔ ان کی حویلیاں سنسان ہو گئیں۔ بستی کے لوگ ان لاوارث حویلیوں اور مکانوں کی اینٹیں اکھاڑ اکھاڑ کر اپنے کام میں لینے لگے۔ لیکن یہ لوگ بھی بربادی اور پریشانی سے نہ بچ سکے ان کے مکانات نذر آتش ہونے لگے۔ آخر کار لوگ مفتیوں کی املاک کے سائے تک سے بچنے لگے۔ اس واقعے نے آس پاس، دور دور تک ایک تہلکہ مچا دیا۔ یہاں تک دنیائے مفتیان سراسیمہ اور خوفزدہ ہو گئی۔ کیتھل سے دور رہنے والے مفتی بھی پریشان ہو گئے۔ وہ باقاعدہ ایک وفد کی شکل میں کیتھل کے قریب ایک گاؤں میں آ کر ٹھہر گئے اور کیتھل والوں کو پیغام بھیجا۔

"براہِ کرم شاہ کمال سے بصد عجز و نیاز دریافت کیا جائے کہ ان کی بددعا صرف کیتھل کے مفتیوں کے لیے تھی یا تمام مفتیوں کے لیے ہے؟"

جواب ملا۔ "صرف کیتھل کے مفتیوں کے لیے۔"
اس جواب سے دنیائے مفتیاں کی جان میں جان آئی۔

♥

آپ نے تبلیغ کا کام نہایت جوش و خروش سے انجام دیا، بہ کثرت ہندو مسلمان ہو گئے۔ عقیدت مندوں کا ہجوم رہنے لگا۔ شاہ کمال کا لباس یا تو سرخ رنگ کا ہوتا یا پھر فوجی وردی میں نظر آتے۔ جب فوجی وردی پہنتے تو گھوڑے کی سواری بھی فرماتے اور ادھر ادھر نکل جاتے۔ تھانیسر کے شیخ جلال الدین کی بزرگی کا بڑا شہرہ تھا۔ ایک دن فوجی وردی زیب تن فرما کے گھوڑا طلب کیا اور اس پر بیٹھ کر شیخ جلال تھانیسری کی ملاقات کو چل پڑے۔ شیخ جلال تک پہنچنے کے لیے ایک سرائے سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا۔ سرائے کے دروازے پر پہنچ کر آپ گھوڑے سے اتر پڑے۔ سرائے دار کی بیوی دروازے پر کھڑی تھی۔ آپ نے اس سے فرمایا۔ "اے عورت! ہم اندر شیخ جلال کی ملاقات کو جاتے ہیں تم ہمارے گھوڑے کی نگرانی کرتی رہنا۔"
سرائے کے مالک کی بیوی نے تلخی سے جواب دیا۔ "جناب یہاں تو

شیخ جلال الدین کی زیارت کو ہر روز سینکڑوں ہی آدمی آتے ہیں، میں کس کس کے گھوڑے کی نگرانی کروں گی۔"

شاہ کمال نے عورت کے ایک کوڑا رسید کر دیا اور کوئی ہدایت کیے بغیر اندر چلے گئے۔ عورت کوڑے کی ضرب سے بے ہوش ہوگئی۔

شیخ جلال الدین نے اپنی مجلس میں ایک فوجی کو دیکھا تو ہاتھ ہلا کر دریافت کیا۔ "کہیے جناب، کہاں سے تشریف لا رہے ہیں؟ بادشاہ کا کیا حال ہے؟"

شاہ کمال نے غصے میں کہا۔ "شیخ! ایک مسکین اگر فوجی وردی میں تمھاری مجلس میں آ بیٹھے تو تم اس سے بادشاہ کا حال پوچھنے لگتے ہو، خوب، بادشاہ کی بابت سوالات کرنا تمھارے شایانِ شان نہیں۔ اگر تمھیں خبر دل کا شوق ہے تو گھر سے نکل کر راستے میں بیٹھ جاؤ اور جو راہ گیر بھی گزرے اس سے خبریں معلوم کرتے رہو!"

شیخ جلال الدین حلم و مروّت سے خاموش رہے۔ اسی مجلس میں شیخ عبدالاحد نامی ایک دوسرے بزرگ بھی تشریف رکھتے تھے۔ وہ شاہ کمال کے تیور سے خاصے متاثر نظر آتے تھے۔

شیخ جلال الدین اس پُر جوش اجنبی کے اندازِ تخاطب پر غور ہی کر رہے تھے کہ شاہ کمال نے ان کے سامنے تصوّف کا ایک دقیق مسئلہ رکھ دیا اور کہا۔ "میں تم سے اس کی وضاحت کا طلبگار ہوں۔"

شیخ جلال الدین نے جواب دیا۔ "اجنبی! تم ایک فوجی ہو، تمھارا اس مسئلے سے کیا تعلق، اس مباحثے میں پڑ کر خواہ مخواہ اپنا اور ہمارا وقت کیوں برباد کر رہے ہو؟"

شاہ کمال نے کہا۔ "علم کے دروازے فوجی پر بند تو نہیں کیے جاتے، میں فوجی ہی سہی لیکن علم کی پیاس تو رکھتا ہوں اور تمھارا فرض ہے کہ اسے بجھاؤ۔"

شیخ جلال نے زِچ ہو کر پیچھا چھڑانے کے لیے کہا۔ "مسئلہ خاصا دقیق اور تا دیر بیان کیے جانے کا متقاضی ہے، اس لیے بہتر ہے کہ تم اُس وقت آؤ جب یہاں کوئی اور نہ ہو۔"

شاہ کمال نے کہا۔ "اگر سب کے سامنے اس کی وضاحت کر دی جائے تو کیا ہرج ہے؟"

شیخ جلال نے تحمل سے جواب دیا۔ "یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ حاضرینِ مجلس کے پلّے ہی نہ پڑے گا۔ اس لیے میں یہ چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے خلوت میں آ کر ملو!"

شاہ کمال نے جوش میں کہا۔ "شیخ! جب تمھیں خود ہی اس بات کا اعتراف ہے کہ مسئلہ دقیق ہے اور حاضرین کی سمجھ ہی میں نہ آئے گا تو ان نادانوں کے سامنے بیان کر دینے میں کیا تامل ہے۔ جب یہ ان کی سمجھ ہی سے بالاتر ہے تو اس مجلس ہی کو خلوت تصور کر لیا جائے!" پھر آپ غصے میں کھڑے ہو گئے اور واپس جاتے ہوئے فرمایا۔ "شیخ! یہ بات نہیں ہے کہ تم اس مسئلے کی وضاحت کا علم یا سلیقہ نہیں رکھتے۔ تم بخل سے کام لے رہے ہو اور بخل اچھی عادت نہیں ہے"!

اس کے بعد آپ وہاں سے چلے آئے۔ اس وقت تک سرائے کے مالک کی بیوی ہوش میں آ چکی تھی اور آپ کے گھوڑے کی نگرانی کر رہی تھی۔ دیکھتے ہی آپ کی طرف والہانہ دوڑی اور آپ کے قدموں میں گر گئی اور آپ کے پیروں کو بوسے دینے لگی۔

یہاں وہ لوگ بھی موجود تھے جو عورت کو شاہ کمال کی مار کھاتے دیکھ چکے تھے۔ انھوں نے یہ سوچ رکھا تھا کہ تھوڑی دیر بعد جب شاہ کمال واپس آئیں گے اور عورت اپنے ہوش میں آ جائے گی تو یقیناً اپنے شوہر اور ملازمین کی مدد سے جھگڑا کرے گی لیکن جب اسے کوڑا رسید کرنے والے کے پیر پکڑ کر بوسے لیتے دیکھا تو دنگ رہ گئے۔ انھوں نے عورت سے کہا "او نیک بخت یہ کیا کرتی ہے کیا تیرا دماغ چل گیا ہے۔ یہ وہی شخص تو ہے جس نے تجھے کوڑے سے پیٹا تھا۔"

عورت نے والہانہ انداز میں جواب دیا۔ "تم لوگ ٹھیک ہی کہتے ہو کہ انھوں نے میرے کوڑے رسید کیے تھے لیکن کوڑے کی ایک ہی ضرب نے میرے دل کی دنیا ہی بدل کر رکھ دی ہے۔ میں اپنے آپ کو معلوم نہیں کیا محسوس کر رہی ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مجھ پر علوم و اسرار کی بارش ہو رہی ہے اور میں ان کی مدد سے محوِ پرواز ہوں۔"

لوگ سمجھے عورت کا دماغ چل گیا ہے، خاموش ہو گئے۔

شاہ کمال نے عورت سے پیر چھڑائے اور گھوڑے پر سوار ہو گئے

کافی راستہ طے کر لینے کے بعد شاہ کمال کو محسوس ہوا کہ ان کے پیچھے کوئی شخص بھاگا چلا آ رہا ہے۔ انھوں نے گھوم کر دیکھا۔ شیخ جلال الدین ننگے پیر بھاگے چلے آ رہے تھے۔ شاہ کمال نے گھوڑا روک دیا اور شیخ جلال کا انتظار کرنے لگے۔

شیخ جلال الدین نے قریب پہنچ کر رکاب تھام لی اور عرض کیا۔ "حضرت! پہچاننے میں مجھ سے سخت غلطی ہو گئی ہے، خدا کے لیے مجھے معاف فرما دیجیے۔"

شاہ کمال نے جواب دیا۔ "شیخ تو اور تیرے مرید ہمارے قبضے میں ہیں اب تو کیا چاہتا ہے؟"

حضرت علی رضؓ

نے فرمایا۔ "لوگو! کیا تم جانتے ہو کہ حیاتِ ابدی کا مستحق کون ہے؟"

سوال کیا گیا۔ "امیرالمومنین کا علم ہم سب سے زیادہ اور بے مثل ہے، خود ہی ارشاد فرمائیں۔"

آپؓ نے جواب دیا۔ "وہ شخص جس سے علم کو زندگی ملتی ہے، جو علم کو زندہ رکھے گا خود بھی زندہ رہے گا۔"

شیخ جلال الدین نے عاجزی سے عرض کیا۔ "مجھ سے پہچاننے میں غلطی ہوئی۔ اب میں اس کی معذرت کرنے حاضر ہوا ہوں۔"

شاہ کمال نے جواب دیا۔ "جا، واپس جا! ہم تجھے غم زدہ دیکھ کر اپنا فیصلہ واپس لیتے ہیں۔"

شیخ جلال تو واپس ہو گئے لیکن ان کی مجلس کی مشہور شخصیت شیخ عبدالاحد شاہ کمال کے پاس پہنچ گئے اور ان سے عاجزی سے دریافت کیا۔ "حضرت! آپ کے بلند مرتبے سے تو یہ خاکسار آگاہ ہو گیا۔ آپ ذرا اپنا اسمِ مبارک بھی بتا دیں تو بڑا کرم ہو گا!"

شاہ کمال نے جواب دیا۔ "بندے کو شاہ کمال کہتے ہیں۔ پائل میں قیام رہتا ہے اگر کبھی خواہش ملاقات ہو تو وہیں آ جانا، ملاقات ہو جائے گی۔"

اس کے بعد سے شیخ عبدالاحد کی شاہ کمال کی خدمت میں آمد و رفت جاری ہو گئی۔

ایک دن عبدالاحد نے مراقبے میں دیکھا کہ پوری دنیا تاریکی میں ڈوبی ہوئی ہے۔ مختلف قسم کے اور عجیب غریب شکل و صورت کے بھیانک درندے لوگوں کو ہلاک کرتے پھر رہے ہیں۔ اسی عالم میں ان کے سینے سے نور کی ایک شعاع پھوٹی اور اس شعاع سے بجلی سی چمکنے لگی۔ یہ بجلی چاروں طرف لپکی اور اس نے درندوں کو جلانا شروع کر دیا۔ اس کے بعد منظر بدل گیا اور انھوں نے دیکھا کہ ایک نہایت نورانی شکل کے بزرگ ایک تخت پر مسند نشیں ہیں۔ ان کے آس پاس مقدس شکل و صورت کے لوگ کھڑے ہیں۔ ظالموں، جابروں اور کافروں کو اس مسند نشیں بزرگ کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے اور وہاں سے ان کے قتل کا حکم صادر کر دیا جاتا ہے۔ مقدس شکل و صورت کے بزرگ حکم پاتے ہی انھیں ہلاک کر دیتے ہیں۔ کسی طرف سے آواز آ رہی ہے۔ "حق آیا، باطل رُخصت ہوا اور باطل رُخصت ہونے کے لیے ہی تھا۔"

عبدالاحد خواب کے اثر سے لرزاں و ترساں شاہ کمال کی خدمت میں پہنچے اور ان کے سامنے خواب بیان کر کے اس کی تعبیر دریافت کی۔ قدرے تامل اختیار کرنے کے بعد شاہ کمال نے ارشاد فرمایا:

"عبدالاحد! تو ایک خوش قسمت باپ ہے، تیرے گھر میں ایک ایسا فرزند پیدا ہو گا۔ جو مرتبے میں اولیائے کرام کے مقابل نمایاں حیثیت کا مالک ہو گا۔ اس کے نور سے شرک و بدعت کی تاریکی دور ہو جائے گی اور اسلام کو روشنی اور تابانی میسر آئے گی۔"

اس واقعے کو کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ آپ نے عبدالاحد سے پھر ارشاد فرمایا۔ "عبدالاحد! کیا تمھیں معلوم ہے کہ جس فرزند کی ہم نے تمھیں خوش خبری سنائی تھی وہ اب آنے والا ہے، تیرا فرزند اس پائے کا ہو گا کہ وہ شاہوں کی گردنیں جھکا دے گا اور بڑے بڑے سرکش اس کی تعظیم بجا لائیں گے!" پھر فرمایا۔ "شیخ عبدالاحد! جب یہ بچہ تمھارے رو برو آئے تو اس بات کا بطورِ خاص خیال رکھنا کہ جب تک میں نہ آؤں، اس فرزند کو کوئی چیز بھی نہ کھلانا۔"

اس ہدایت اور پیش گوئی کے بعد عبدالاحد نے تو شاہ کمال کا پیچھا

سالے لیا۔ کوئی بات ہوتی، شاہ کمال کی خدمت میں پہنچتے ہی عرض کرتے اور جو جواب ملتا اس کے عواقب اور نتائج پر غور کرنے لگتے۔

کچھ عرصے بعد عبدالاحد کے گھر میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ انھیں شاہ کمال کی ہدایت یاد آئی۔ بچے کو گود میں لیا اور شاہ کمال کی خدمت میں پہنچ گئے۔ بچے کو ان کی گود میں دیتے ہوئے کہا۔

"حضرت! آپ کے ارشاد کی تعمیل کر دی ہے اور بچے کو اب تک کھانے پینے کو کچھ بھی نہیں دیا۔ اب آپ جب حکم دیں گے بندہ اس کی تعمیل کرے گا۔"

شاہ کمال نے نظر بھر کے نومولود کو دیکھا اور اپنی انگشت شہادت بچے کے منہ میں دے دی اور فرمایا۔ "عبدالاحد! یہ بچہ تجدیدِ دین کے لیے ہے۔ یہ خلقِ خدا کو بے اندازہ روحانی فیض پہنچائے گا۔ یہ ہمارا فرزندِ معنوی ہے۔"

نومولود نہایت انہماک اور شوق سے شاہ کمال کی انگشتِ شہادت چوستا رہا۔ کچھ دیر بعد شاہ کمال نے انگلی باہر نکال لی اور فرمایا۔ "بس کرو بیٹے! ہم اپنی اولاد کو کیا دیں گے۔ کچھ ان کے لیے بھی رہنے دو۔"

یہ نومولود آگے چل کر شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کہلایا اور اس نے اپنے عہد کے جلیل القدر بادشاہوں کو اپنے زیرِ دھکا لیا۔

جیسا کہ پیچھے لکھا جا چکا ہے کہ شاہ کمال یا تو سرخ رنگ کا لباس زیبِ تن فرماتے تھے یا پھر فوجی وردی پہن لیتے تھے۔ لوگوں کو آپ کے سرخ لباس پر اعتراض تھا۔ لیکن زبان سے کچھ کہہ نہ سکتے تھے۔ ان معترضین میں علماتے وقت پیش پیش تھے۔

ان علما کو آپ کے باکمال ہونے میں کوئی شبہ نہ تھا لیکن دل سے یہ چاہتے تھے کہ شاہ کمال سرخ لباس نہ پہنا کریں۔ انھوں نے کئی بار ارادہ کیا کہ وہ شاہ کمال کو سرخ لباس میں دیکھ کر ٹوک دیں گے لیکن جب انھیں ایسا موقع ملتا تو ان کی زبان ساتھ نہ دیتی اور وہ لوگ خاموش رہ جاتے۔ انھوں نے لب کشائی کی کئی کوششوں کی ناکامی کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ اب وہ اپنی زبان سے کچھ بھی نہ کہیں گے بلکہ ایک سفید لباس تیار کرا کے شاہ کمال کے حوالے کر دیں گے اور ان سے درخواست کریں گے کہ "حضرت یہ لباس زیبِ تن فرمایا کریں۔"

شاہ کمال کو اپنے تصرفِ باطنی سے اس منصوبے کا علم ہو چکا تھا۔ انھوں نے علما سے سفید لباس لے لیا اور اسی وقت پہن لیا اور فرمایا۔ "تم نے ہمیں سفید لباس دیا، ہم نے پہن لیا لیکن اب تم اس سفید لباس کو غور سے دیکھتے رہو۔"

لوگوں کی نظریں شاہ کمال کے سفید لباس پر جم گئیں۔ انھوں نے محسوس کیا، سفید لباس آہستہ آہستہ سرخ ہوتا جا رہا ہے اور آخر کار ذرا سی دیر میں وہ بالکل سرخ ہو گیا۔ آپ نے اس سرخ لباس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ "لوگو! کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم سرخ رنگ بے حد پسند کرتے ہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں، یہ تو قدرت ہے جو ہمارے لباس کو سرخ کر دیتی ہے۔"

اس واقعے سے آپ کی دہشت لوگوں کے دلوں پر اتنی بیٹھ گئی کہ یہ حضرات خود ہی مجلس سے اٹھ جانے کا ارادہ کرنے لگے لیکن آپ نے انھیں روکے رکھا اور ارشاد فرمایا۔ "لوگو! ہمیں الزام نہ دو۔ ہم تو اس تاجر کی طرح ہیں جو وہی سامانِ تجارت اپنے ساتھ رکھتا ہو جس کی لوگوں کو کوئی ضرورت نہ ہو یا وہ اسے پسند نہ کرتے ہوں۔ ہم تم ہی میں سے ہیں لیکن اختلافِ حال اور اختلافِ طبائع کے شکار ہیں۔"

اس واقعے کے بعد لوگوں نے آپ کو لال دیال کا خطاب دیا۔

ایک بار آپ صحرا سے گزر رہے تھے۔ کئی دن سے کچھ کھانے کو نہ ملا تھا۔ انھیں ایک جگہ ایک چرواہا نظر آیا جو اپنے جانوروں کو بیری کے پتے کھلانے میں مشغول تھا۔ اس وقت اس کے رومال میں دو روٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ آپ نے چرواہے کو نام لے کر مخاطب فرمایا۔ کہا۔

"سجن! اگر تو اپنی دو روٹیوں میں سے ایک کسی مردِ خدا کو عنایت کر دے تو تجھے بے شمار دینی اور دنیوی فائدے حاصل ہوں گے۔"

چرواہے نے غور سے اس درویش کو دیکھا اور اپنے دل میں کہا۔ "جناب یہ عجیب درویش ہے جو مفت کی روٹی سے اپنا جسم پالنا چاہتا ہے، خوب!"

آپ نے ذرا بھی ناگواری کا اظہار نہ کیا اور خاموشی سے آگے بڑھ گئے۔ ابھی شاہ کمال دو میل مشکل گئے ہوں گے کہ سجن بھاگتا ہوا ان کے پاس پہنچا اور اپنی ساری چیزیں ان کے حوالے کر کے قدموں میں گر گیا اور اپنے ناقص خیال کی معافی مانگنے لگا۔ آپ نے اسے اپنے ساتھ ہی رکھ لیا اور اسے روحانی فیوض سے مالا مال فرما دیا۔

شاہ کمال کے جلالی واقعات بہت مشہور ہیں۔ آپ کے ایک مرید کو اشتیاقِ تجلی بے حد تھا۔ اس شوق میں اس نے سالہا سال ریاضت کی لیکن جو دیکھنا چاہتا تھا، اس سے محروم رہا۔ اس کا خیال تھا کہ اس معاملے میں شاہ کمال اس کی ضرور مدد کریں گے لیکن تجربے نے اسے مایوس ہی رکھا۔ ایک دن اس نے دل میں سوچا کہ اگر شیخ نجم الدین کبریٰ کی رفاقت میسر آتی تو وہ اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہو جاتا کیونکہ نجم الدین کبریٰ کے لیے یہ مشہور تھا کہ وہ جسے نظر بھر کے دیکھ لیتے تھے، اس کی دنیا ہی بدل جاتی تھی۔ مرید ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ شاہ کمال نے جھرجھری سی لی۔ غصے میں دریافت فرمایا۔ "تو شیخ نجم الدین کبریٰ کا تصور کرتا ہے کہ وہ ذاتِ تجلی کا تجھ پر انکشاف کرے۔"

مرید سمجھا مراد بر آئی، سراپا اشتیاق سے عرض کیا۔ "حضرت! سالہا سال کی ریاضت اور مجاہدے کے بعد بھی یہ عاجز دلی مراد پانے سے محروم ہے۔"

شاہ کمال نے جوش میں حکم دیا۔ "ادھر دیکھ ہماری طرف!"

مرید نے نظر بھر کے شاہ کمال کو دیکھا۔ معلوم نہیں اسے ان کے چہرے میں کیا نظر آیا کہ وہ غش کھا کے گر گیا۔ تھوڑی دیر تڑپا اور جاں بحق ہو گیا۔ دوسرے مرید گھبرا گئے۔ ان میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ اس بارے میں کوئی استفسار کرتے لیکن کسی جرأت مند مرید نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔ "حضرت! یہ کیا ہوا؟"

آپ نے پرجوش لہجے میں جواب دیا۔ "اس نااہل اور کم حوصلہ شخص میں ذاتِ تجلی کے دیدار کا حوصلہ ہی کب تھا جو اتنی بڑی تمنا کر بیٹھا اور جو شخص اپنی حیثیت اور مرتبے سے زیادہ کا مطالبہ کرتا ہے، اس کا یہی انجام ہوتا ہے۔"

آپ کے جلال کا کسی پر بھی اظہار ہو سکتا تھا۔ اس سے گھر والے بھی محفوظ نہ تھے۔ چنانچہ ایک روز آپ کے بڑے صاحبزادے شاہ عمادالدین گھر کے باہر تخت پر بیٹھے حجامت بنوا رہے تھے۔ یہ صاحبزادے بھی کشفِ باطنی رکھتے تھے۔ اسی عالم میں انھوں نے آواز سنی: "شاہ کمال شاہ کمال!!" یہ آواز کہیں بہت دور سے آ رہی تھی۔ سورت کی بندرگاہ سے ذرا آگے ایک بحری جہاز گرداب میں پھنس گیا تھا اور اس پر سوار شاہ کمال کے مرید انھیں پکار رہے تھے۔ شاہ عمادالدین نے حجام سے پیچھا چھڑایا اور تخت سے اتر کر ہوا میں زور لگانے لگے۔ بالکل اس طرح جیسے کسی بھاری چیز کو سہارا دے کر آگے کی طرف کھسکا رہے ہوں۔ اسی وقت شاہ کمال حجرے سے باہر نکلے اور غضب ناک ہو کر صاحبزادے سے سوال کیا۔ "تو یہ کیا کر رہا ہے؟"

صاحبزادے نے خوفزدہ ہو کر جواب دیا۔ "بابا جان! اہلِ جہاز آپ کو پکار رہے تھے۔ مجھے شرم محسوس ہوئی کہ وہ لوگ آپ کو یاد کرتے کرتے ڈوب جائیں۔ اس لیے ازراہِ ہمدردی میں نے جہاز کو سہارا دے دیا۔"

شاہ کمال نے غضب ناک ہو کر دریافت کیا۔ "کیا تو نے لوحِ مبارک کا مطالعہ کر لیا تھا؟ کیا تجھے مشیتِ ایزدی کا علم ہو چکا تھا؟"

صاحبزادے نے شرمندہ ہو کر گردن جھکا لی۔ شاہ کمال آگے بڑھے اور اپنے بیٹے کے سینے پر ہاتھ پھیرا۔ ان کی ساری روحانی طاقت سلب ہو گئی۔ اس کے بعد شاہ کمال یہ کہتے ہوئے حجرے میں واپس چلے گئے۔ "عاقبت نااندیش! تیری یہی سزا ہے!"

اسی طرح ایک دن آپ کے چھوٹے صاحبزادے نورالدین دیوار پر گھڑسواری کے انداز میں بیٹھے اسے حکم دے رہے تھے۔ "چل آگے بڑھ!" دیوار مرتعش ہو گئی۔ شاہ کمال غصے میں باہر نکلے اور ڈانٹ کر کہا۔ "صاحبزادے! تم اپنی حیثیت اور مرتبے کا اظہار وقت سے بہت پہلے کیے دے رہے ہو!"

اس کے بعد انھیں دیوار سے اتار لیا اور ان کے سینے پر ہاتھ پھیر کر روحانی قوت سلب کر لی اور اس کے ساتھ ہی بچے کی روح بھی پرواز کر گئی۔

منجھلے صاحبزادے شاہ موسیٰ نے دونوں بھائیوں کا یہ حشر جو دیکھا تو باپ سے دوری اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ انھیں ڈر پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں ان کا بھی یہی حشر نہ ہو۔ انھوں نے ایک رات راہِ فرار اختیار کی۔ وہ ساری رات بھاگتے رہے اور صبح ہوئی تو دیکھا ہنوز کیتھل کے اندر ہی ہیں۔ اسی کشمکش میں انھوں نے دیکھا کہ شاہ کمال ان کے سامنے کھڑے ہیں اور پوچھ رہے

جنگ نے لوگوں کو بہت پریشان کر رکھا تھا۔ ایک لاپروا اور بے فکر بیوی ہر روز اپنے شوہر کو نہایت انہماک سے اخبار پڑھتے دیکھتی تو کڑھنے لگتی۔ ایک دن اُس نے شوہر سے اخبار چھین لیا اور پوچھا۔ "آخر تم ہر وقت اخبار ہی کیوں پڑھتے رہتے ہو؟"

شوہر نے جواب دیا۔ "سخت جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ اس کی تفصیلات پڑھتا رہتا ہوں۔"

بیوی نے کہا۔ "یہ لوگ کب تک لڑتے رہیں گے مل بیٹھ کر کوئی تصفیہ کیوں نہیں کر لیتے؟"

شوہر نے جواب دیا۔ "یہ دونوں مل جل کر تصفیہ ہی کرنے تو بیٹھے تھے کہ وہیں سے لڑائی شروع ہو گئی۔"

ہیں۔ موسیٰ تو پریشان کیوں ہے؟"

بیٹا باپ سے اپنی ذہنی کش مکش اور اندیشے چھپانے پر قادر ہوتا تو ضرور چھپاتا۔ اسے معلوم تھا کہ باپ نے سب کچھ کشف سے معلوم کر لیا ہے اور سوال تجاہلِ عارفانہ سے کیا گیا ہے۔ سب کچھ سچ سچ باپ کے گوش گزار کر دیا۔

شاہ کمال نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "تو مت گھبرا، ہم تجھے خرقۂ خلافت سے نوازیں گے۔"

اور اپنے اس وعدے کو انھوں نے اس طرح پورا کیا کہ موسیٰ کو خرقۂ خلافت عطا فرما کے کوٹ قبولہ (منٹگمری موجودہ ساہی وال) کی ولایت بخش دی۔

موسیٰ نے اعتراض کیا اور متاملانہ عرض کیا۔ "بابا جان! وہ تو حضرت بابا فرید الدین گنج شکر کا علاقہ ہے۔"

شاہ کمال نے جواب دیا۔ "تو ٹھیک کہتا ہے لیکن وہ یہ علاقہ تجھے بخش دیں گے کیوں کہ تو حضرت غوث اعظم کی نسل سے تعلق رکھتا ہے اور کون ہے جسے حضرت غوث اعظم کا ادب و پاس نہیں۔"

شاہ موسیٰ کوٹ قبولہ چلے گئے اور یہاں بڑا نام پیدا کیا۔

شاہ کمال کا بیشتر وقت حجرے ہی میں گزرتا تھا۔ آپ حجرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیتے تھے اور عبادت و ریاضت اور مراقبے میں مشغول ہو جاتے تھے۔ کبھی کبھی تو آپ چھ چھ ماہ اندر ہی رہتے اور باہر تشریف نہ لاتے۔

یہ ۲۹ جمادی الآخر ۹۸۱ھ کا ذکر ہے۔ بڑے صاحبزادے شاہ عماد الدین کسی غرض سے آپ کے حجرے کے دروازے پر پہنچے وہاں ہو کا عالم تھا انھیں کچھ شبہ ہوا، جھانک کر اندر دیکھا۔ وہاں شاہ کمال بے سدھ پڑے ہوئے تھے۔ شاہ عماد الدین کو بد اندیشی نے گھیر لیا۔ انھیں اپنے والد کی زندگی کی طرف سے ناامیدی محسوس ہوئی۔ وہاں سے ہٹے اور چند آدمیوں کو لے کر واپس آ گئے۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ بمشکل دروازہ اتارا اور دوڑ کر باپ کے پاس پہنچ گئے۔ ان کی آنکھیں بند تھیں اور نبض ساکت تھی۔ بے جان جسم مصلے پر لیٹا ہوا تھا۔ وصال کی خبر آناً فاناً پھیل گئی اور ایک کہرام برپا ہو گیا۔ دور دور سے لوگ آپ کے آخری دیدار کے لیے آنے لگے۔ گھر والے تجہیز و تکفین کا انتظام کرنے لگے۔ غسال غسل دینے لگا۔ ابھی وہ غسل سے فارغ نہ ہوا تھا کہ شاہ کمال نے کروٹ لی اور آنکھیں کھول دیں اور اپنے آس پاس لوگوں کو دیکھ کر تبسم فرمایا۔ غسال خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا سب سے زیادہ برا حال تھا۔ وہ وحشت سے بے ہوش ہونے ہی والا تھا کہ شاہ کمال کے لبوں کو جنبش ہوئی۔ دریافت فرمایا۔ "کیا ہمارے وصال کی خبر سارے شہر میں پھیل چکی ہے؟"

خوف زدہ غسال نے سر کی جنبش سے جواب دیا۔ "جی حضرت!"

آپ نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں اور ارشاد فرمایا۔ "اچھا یہ بات ہے تو ہم بھی جاتے ہیں!"

یہ کہا اور دم سادھ کر ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔

شہر کے باہر مشرقی جانب 'بدھ کیار' نامی تالاب کے کنارے آپ کی تدفین عمل میں آئی۔ مزار کے چاروں طرف مختلف النوع درختوں کا جھنڈ گھنی چھاؤں کیے رہتا ہے۔ کھرنی کی شاخیں املی کے درخت میں گھل مل گئی ہیں۔ جب موسم بہار آتا ہے تو نیم کی سبز پتیاں اور سفید پھولوں کا بچھونا ایک دل کش سماں پیدا کر دیتا ہے۔ مولسری کے پھول ہوا کے جھونکوں سے مینہ کی طرح برسنے لگتے ہیں۔

امتدادِ زمانہ سے مزار شکستہ ہو گیا تھا۔ اس کی از سرِ نو تجدید ہندوؤں کے ہاتھوں ہوئی۔ کیتھل کے ایک ہندو برہم دت شرما نے موجودہ سجادہ نشین مقبول محی الدین گیلانی کے نام ایک مختصر خط ۱۲ مارچ ۱۹۶۷ء کو لکھا تھا۔ اس میں انھوں نے شاہ کمال کے حالات معلوم کیے تھے۔ انھوں نے اپنے طویل خط میں لکھا تھا:

"میرے محترم روشن لال جی بی اے، پلسر سورگیہ باشی شری ہنس راج جی ریٹائرڈ چیف گڈس کلرک شاہ کمال کے مزارِ پاک کی تزئین اور آرائش کے روحِ رواں اور محرک ہیں ۔۔۔ یہ چار سال قبل شاہ کمال کے مزار پر تشریف لے گئے تھے۔ مزار کی خستہ حالت دیکھ کر پریشان ہو گئے اور انھوں نے قسم کھائی کہ مزار کو جلد از جلد درست کرایا جائے گا۔ یہ جناب شاہ کمال کے حکم ہی کا نتیجہ ہے۔ ہم سب ان کے لیے بہت عقیدت اور جذبۂ محبت رکھتے ہیں ۔۔۔ جو کچھ حضرت شاہ کمال نے ہم اہلِ ہنود کو حکم دیا تھا۔ یہ عین مقتضائے وقت تھا جس کی تعمیل کر دی گئی۔"

آپ نے ایک بار کسی سے فرمایا تھا۔ "خودی کے مکتب میں پڑھنا شروع کر، جب تک یہاں کی الف بے نہیں پڑھے گا، تب تک عاشقوں کے راز کو نہیں پائے گا۔"

آپ اسی درس گاہِ خودی کے معلّم اور سرخیلِ عاشقاں تھے۔ اور عشق زمانوں پر حاوی اور محیط ہے۔ اس کی گرفت میں زمان و مکان اور تمام مذاہب و ملل ہیں۔ کیا ہندو کیا مسلمان سبھی اس کے اسیر اور تابع ہیں۔

سسکتی عورت

محبت کرنے والوں کے لیے ایک نوجوان لڑکی کی دل گداز اور فکر انگیز داستان

جو محبت کرتے ہیں اور گداز آشنا ہیں وہی اس تحریر کا نشتر محسوس کر سکیں گے

معظم عزیز

میرٹھ کے ایک محلے میں ایک نوجوان موہن لال کا پتہ پوچھ رہا تھا۔

موہن لال کو کون نہیں جانتا تھا، کبھی اس نے اچھے دن دیکھے تھے مگر اب وہ غربت اور لاچاری کے دن گزار رہا تھا۔ تقدیر نے اُسے قلاش کر دیا تھا، دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ تباہ ہو گیا، اس پر مستزاد یہ کہ ایک حادثے میں اس کی بینائی بھی زائل ہو گئی۔ بینائی کی بحالی کے لیے اُس نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ حکیمی دوائیں، ڈاکٹری علاج، سنیاسیوں کے نسخے، علاج معالجے کے سلسلے میں موہن لال کا بال بال قرض میں جکڑ گیا، یہاں تک کہ اُسے اپنا آبائی مکان بھی سیٹھ نندا کے پاس گروی رکھنا پڑا۔

موہن لال کا خاندان مختصر تھا، ایک بیوی تھی جو اب اس کا سب سے بڑا سہارا تھی اور ایک نوجوان لڑکی چاندنی۔ چاندنی کا اصل نام چندا تھا مگر سب اُسے پیار میں چاندنی کہتے تھے۔ آنکھوں کی طرف سے مکمل مایوسی کے

بعد موہن لال اور اس کی بیوی کو چاندنی کی شادی کی فکر نے خاصا پریشان کر رکھا تھا۔ وہ ایک حسین وجمیل، پری وش اور ذہین لڑکی تھی، اگر وہ ہمیشہ سے غریب ہوتے تو شاید انھیں اس کی زیادہ فکر نہ ہوتی لیکن وہ امارت کے بلند مینار سے اچانک غربت کے گڑھے میں گر گئے تھے، اس لیے بیٹی کی شادی کرنا ان کے لیے آسان مسئلہ نہیں تھا۔

سیٹھ نندا اپنے قرض اور سود کی وصول یابی کے سلسلے میں اکثر موہن لال کے ہاں آیا کرتا تھا۔ یقیناً وہ اس حقیقت سے بھی واقف تھا کہ موہن لال اب کبھی قرض واپس نہیں کر سکے گا۔ موہن لال سے قرض واپس لینے کی ایک ہی صورت تھی کہ اسے مکان سے بے دخل کر دیا جائے مگر اُسے ایسے سخت رویّے کی ضرورت نہیں پڑی۔ جو کام موہن لال اور اس کی بیوی سرلا کی آہ و زاری اور ان کی جھکی ہوئی نگاہیں نہ کر سکیں، وہ کام چاندنی کی ایک نظر کر گئی۔ چاندنی کی نظر کا جادو تھا کہ سیٹھ نندا سب کچھ بھلا بیٹھا۔ وہ موہن لال کے گھر میں بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ پری جمال چاندنی کے حسنِ جہاں تاب سے اس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں اور اُسے اندازہ ہوا کہ موہن لال غریب ہونے کے باوجود کتنا نادر ہیرا اپنے گھر میں محفوظ کیے ہوئے ہے۔ سیٹھ نندا نے ایک جوہر شناس نگاہ سے چاندنی کا حسن اور بدن تولا اور جب وہ موہن لال کے مکان سے اُٹھنے لگا تو اس کا لہجہ، رویّہ اور انداز ہی بدل گیا تھا۔

سیٹھ نندا عام سیٹھوں اور ساہوکاروں سے مختلف شخص تھا، وہ تعلیم یافتہ اور مہذب تھا، چہرہ بھی پُروقار تھا اور عمر بھی کم تھی۔ یہی کوئی تیس بتیس سال مگر اس کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ سیٹھ نندا کو کاروباری بکھیڑوں میں شادی کے مسئلے پر غور و فکر کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ موہن لال کے ہاں اس کی آمد و رفت بڑھ گئی، پھر اس نے قرض کی واپسی کے سلسلے میں کبھی ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ وہ آتا، موہن لال سے مخلصانہ باتیں کرتا، اس کی بیوی کے پاس بیٹھا رہتا اور چاندنی کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے ترستا رہتا، چاندنی نگاہیں جھکائے شرماتی لجاتی اس کے سامنے سے گزرتی تو سیٹھ نندا ہوش و حواس کھو بیٹھتا، نندا کے حسنِ سلوک نے موہن لال اور سرلا کے دل فتح کر لیے تھے اور چاندنی کے حسن نے نندا کا دل مغلوب کر لیا تھا۔

سیٹھ نندا نے موہن لال کا رہن شدہ مکان واپس کر دیا اور اسے ہزاروں روپے کے قرض سے بھی نجات دلا دی۔ اس نے اس گھر میں اپنا اعتماد قائم کر لیا تھا چنانچہ چاندنی اب اس کے سامنے آنے جانے میں پہلے جیسی جھجک محسوس نہیں کرتی تھی۔ نوعمر، نازک اور خوب صورت چاندنی رسوئی میں بیٹھی کھانا پکا رہی ہوتی اور سیٹھ نندا آنگن میں بیٹھا اس کے باپ سے شیریں گفتاری کر رہا ہوتا اور کنکھیوں سے چاندنی کی طرف بھی دیکھتا جاتا۔ چاندنی کی حنائی اُنگلیوں میں لرزش سی پیدا ہو جاتی۔

نندا کہتا، ”موہن لال جی! دولت ایک بے اعتبار چیز ہے۔ میری نظروں میں شرافت کی اہمیت ہے۔ دولت کل آپ کے پاس تھی، آج کسی اور کے پاس ہے، ایسی چیز سے کون لَو لگائے۔“

اس حسنِ سلوک اور تاک جھانک میں خاصے دن گزر گئے مگر نندا حرفِ مطلب زبان پر نہ لایا۔ آخر دیوالی کے تیوہار پر موہن لال کو خوش گوار حالت میں دیکھ کر اس نے بڑے ادب سے اپنا دلی مقصد ظاہر کر دیا۔ موہن لال ہر اعتبار سے سیٹھ نندا کا احسان مند تھا، اسے موہن لال کے مخلصانہ رویّے سے پہلے ہی کچھ شبہ ہو چلا تھا، وہ انکار کیسے کرتا؟ اس نے اپنی بیوی سے رائے طلب کی۔ ماں بھی زیرِ بارِ احسان تھی۔

نندا میں ان کا محسن ہونے کے علاوہ بھی کئی خوبیاں تھیں، اگر وہ کوئی داماد ڈھونڈنے نکلتے تو نندا جیسا ہی کوئی شخص انھیں ملتا۔ البتہ ذات کی خلیج حائل تھی مگر یہ ایسی خلیج نہیں تھی جو پاٹی نہ جا سکے۔ چاندنی بھی اپنے ماں باپ کی مجبوری و معذوری محسوس کرتی تھی اور ان حالات میں خود کو ایک بوجھ تصوّر کرتی تھی، اس سے بھی رسماً پوچھا گیا اور اس نے بھی رسماً اثبات میں سر ہلا دیا، ایک ہفتے بعد دھوم دھام سے سیٹھ نندا اور چاندنی کی شادی ہو گئی۔ دونوں طرف کے اخراجات سیٹھ نندا نے برداشت کیے۔

۳۲ سالہ سیٹھ نندا نوخیز دُلھن کو لے کر اپنے مکان میں آ گیا، چاندنی کے آنے سے گھر کے در و دیوار گنگنانے لگے جیسے مدتوں بعد چاند نکلا ہو، جیسے مدتوں بعد بہار آئی ہو۔ چاندنی زمین کا چاند تھی، وہ سیٹھ نندا کے دل کا چاند تھی، چاندنی کو اپنے دامن میں سمیٹ کر سیٹھ نندا دیوانہ سا ہو گیا، چاندنی کی گداز رفاقت نے اسے ہر کام سے بیگانہ کر دیا۔ وہ اسے سامنے بٹھا کر دیر تک دیکھتا رہتا۔ اپنی زہرہ جمال بیوی کی ناز برداریاں کرتا اور اس کی دل جوئی میں ہمہ وقت مستعد رہتا۔ اس نے چاندنی کو بیش قیمت زیورات اور نفیس ملبوسات سے لاد دیا۔ چاندنی شوہر کی محبّتوں کے جواب میں اسے محبّتیں سونپتی، اس کے دل کا خلا پُر ہو رہا تھا اور اس کے حسن نے عجب رنگ دکھانے شروع کر دیے تھے — وہ ہر زاویے سے قیامت نظر آتی تھی۔

نندا نے اپنی محبوب بیوی کے لیے اپنا موجودہ مکان مسمار کر کے لاکھوں روپے کے خرچ سے ایک بڑی حویلی تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا، اس کا نام اس نے چاند محل رکھا۔ وہ مکان کی تعمیر کے زمانے میں سسرال منتقل ہو گیا اور تیز رفتاری سے چاند محل کی بنیادیں پڑنی اور دیواریں اُٹھنی شروع ہو گئیں۔ انھی دنوں کسی کام کے سلسلے میں سیٹھ نندا کو دہلی جانا تھا۔ چاندنی بھی ساتھ جانے کے لیے مچل گئی۔ شوہر کی کیا مجال تھی کہ وہ اپنی حسین بیوی کی کوئی فرمائش ٹالتا، چاندنی کی رفاقت میں دہلی کا سفر دل کش ہو جاتا، اُس نے سامان کی تیاری کا حکم دے دیا۔

تیسرے دن وہ دونوں دہلی پہنچ کے ایک شان دار ہوٹل میں مقیم ہو گئے۔ سیٹھ نندا صبح سے دوپہر تک کاروباری معاملات میں مصروف رہتا، دوپہر کے کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کرتا اور پھر چاندنی کو ساتھ لے کر شہر کی سیر کو نکل جاتا، وہ کناٹ پلیس میں گھومتے اور اعلا درجے کے ریستوران میں بیٹھتے۔

بسا اوقات یہ سلسلہ رات گئے تک جاری رہتا۔ سنہرے دن اور سنہری راتیں۔ چاندنی کی صرف ایک جنبشِ لب، صرف ایک جنبشِ نگاہ، صرف ایک شکنِ ابرو کی دیر ہوتی، نندا اس کے سامنے بچھ بچھ جاتا۔ چاندنی دہلی کی رونقوں میں کھو گئی تھی۔

دہلی پہنچنے کے پانچویں دن کا ذکر ہے، نندا باہر گیا ہوا تھا، چاندنی مورکی سی تمکنت سے بالکونی میں کھڑی بازار کی چہل پہل دیکھ رہی تھی، ساڑھی کا پلّو ہوا سے ڈھلک ڈھلک جاتا تھا، زلفیں آوارگی کی طرف مائل تھیں، چاندنی اپنی اس حالت سے بے نیاز تھی، وہ کہیں گم تھی، اپنے خوابوں اور خیالوں میں۔ یکایک برابر کی بالکونی کا دروازہ کھلنے سے چاندنی چونک پڑی۔ وہاں ایک نوجوان شب خوابی کے لباس میں کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نیند کے سُرخ سُرخ ڈورے تھے، چاندنی اُسے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ وہ ایک باوقار، وجیہہ اور دل کش نوجوان تھا۔ نوجوان کی آنکھوں میں بھی چاندنی کو دیکھ کر اضطراب سا پیدا ہوا۔ یہ لمحاتی کیفیت کئی صدیوں کا فاصلہ طے کر گئی۔ انھوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور ایک دوسرے سے نظریں چُرا لیں۔ پھر ان کی نگاہیں ملیں اور کتنے سوال کتنے جواب ان میں لہرا گئے۔

چاندنی گھبرا کر فوراً بالکونی سے ہٹ گئی اور لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ کمرے میں جا کر آرام کرسی پر دراز ہو گئی، اس کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ سانس ٹوٹ چکی تھی، نسوں میں ایک میٹھی سی کسک پیدا ہو گئی تھی، اس نے آنکھیں بند کر لیں، اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے دُور آسمان پر شعلے بھڑک اُٹھے ہوں اور ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے ہوں، اس کے خیالات دُھندلا گئے، اس نے بے قرار ہو کے آنکھیں کھول دیں اور ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اپنے سراپا کا جائزہ لیا۔ اس کا خمار آلود بدن آئینے میں جھلک رہا تھا — وہ خود سے شرما گئی۔ اسے اپنی از خود رفتگی سے خوف آنے لگا۔

”ارے — تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں؟“ سہ پہر کو نندا نے اس کے رُخسار تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

”ہوں —“ اس نے ناز سے ایک انگڑائی لی۔ ”آج کہیں جانے کو جی نہیں چاہتا۔“

”کیوں؟“ نندا نے تشویش سے پوچھا۔

”بس یوں ہی — کچھ جی اچھا نہیں ہے۔“ چاندنی نے کسمسا کر جواب دیا اور اپنے کانوں کے آویزے اُتارنے لگی۔

”ارے نہیں۔ یہ دہلی ہے، میرٹھ نہیں ہے۔ باہر نکل کے دیکھو — تمھارا جی بہل جائے گا۔ اچھا آج ہم سینما چلیں گے۔ ابھی تو تم نے دہلی کا ایک کونا بھی نہیں دیکھا۔“ نندا نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔

”اب کچھ دیکھنے کو جی نہیں چاہتا۔“ چاندنی نے خوابناک نگاہوں سے نندا کو دیکھا اور اس طرح مسکرا اٹھی جیسے کلی کھل گئی ہو۔

نندا نے بے اختیار اسے آغوش میں لے لیا، اسے چاندنی کی یہ دل رُبا باتیں بہت پسند تھیں۔ نندا نے پھر اصرار کیا اور چاندنی پھولوں بھری لچک دار شاخ کی طرح بل کھاتی ہوئی اٹھی اور تیار ہونے لگی، مانگ میں سیندور بھرتے وقت اس کا ہاتھ سست پڑ گیا اور وہ سوچنے لگی — نہ جانے اسے کیا ہو گیا ہے؟

جب وہ سُرخ جوڑے میں ملبوس نئی نویلی دُلھن کی طرح بن سنور کے اپنے شوہر کے پیچھے باہر نکلی تو غیر ارادی طور پر اس کی نظر برابر کے کمرے کی طرف اُٹھ گئی۔ دروازے میں تالا پڑا ہوا تھا۔ چاندنی کا تمتماتا ہوا چہرہ بجھ سا گیا مگر زینے سے اُترتے ہوئے جب اس نے ہال میں قدم رکھا تو ایک میز پر وہی نوجوان بیٹھا تھا، وہ سگریٹ کے کش لیتے ہوئے پُرشوق نگاہوں سے چاندنی کی طرف دیکھ رہا تھا، چاندنی کا چہرہ جگمگا اٹھا۔

تین چار گھنٹے کی سیر و تفریح کے بعد جب چاندنی واپس آئی تو اسے یہ دیکھ کر ایک لذّت سی محسوس ہوئی کہ نوجوان ابھی تک اسی جگہ اور اسی طرح بیٹھا ہے۔ دونوں نے پُرمعنی نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا، چاندنی کو دیکھ کر نوجوان کا چہرہ روشن ہو گیا۔

کمرے میں پہنچ کر سیٹھ نندا نے اسے اپنی آغوش میں جکڑ لیا مگر چاندنی کسمسانے اور تڑپنے لگی، نندا نے اسے اپنی حسین بیوی کی کوئی ادا سمجھا اور اس نے کسی قدر وحشیانہ طریقے سے اسے دبوچنا شروع کر دیا، چاندنی کسی ہرنی کی طرح قلانچ بھر کر دروازے پہ چلی گئی۔ اس کا لباس بکھر گیا تھا، نندا نے اسے حیرت سے دیکھا اور دروازے پر پہنچ گیا۔

”کیوں۔ آج تمھیں یہ کیا ہو گیا ہے؟“ نندا نے اس کے چٹکی لیتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔“ چاندنی کرب سے بولی۔ ”آج نہیں۔“

”آج کیا بات ہے، تمھاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”ہاں۔“ چاندنی نے شرما کر کہا۔ ”پر آج نہیں۔“

”اور آج تم بہت خوب صورت معلوم ہو رہی ہو۔ تم نے دیکھا اُس

میں انسانی فلاح و بہبود پر بحث چھڑی ہوئی تھی۔ یہ بات انسان کی بیماریوں اور فوری طبّی امداد تک جا پہنچی۔ ایک خاتون نے کہا "ہمیں چاہیے کہ ہم بلڈ بینک کو زیادہ سے زیادہ خون مہیا کرکے کمزور اور خون کے ضرورت مند مریضوں کی عظیم انسانی خدمت انجام دیں!"

تالیوں کی گونج اور داد تحسین کے نعروں میں اس تجویز کی تائید ہوئی۔ رجسٹر کھلا اور خون کی پیش کش کرنے والی خواتین نے نام اور پتے لکھوانے شروع کر دیے۔ ان خواتین نے اپنے شوہروں کے خون دینے کی فراخ دلانہ پیش کش کی تھی۔

لباس میں کتنے لوگ تمہاری جانب دیکھ رہے تھے۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ آج ان تمام حریص نظروں کا تم سے انتقام لوں گا۔" نندا نے جذباتی ہو کر کہا اور چاندنی کو اپنے بازوؤں میں اٹھا کر بستر پر لے آیا۔ چاندنی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے شوہر پر دہشت غالب ہے۔ آج اُسے اس چھیڑ خانی میں لطف نہیں آرہا تھا، اس نے نندا کے سوالوں اور اس کی وحشتوں سے بچنے کے لیے خود کو اس کے سپرد کر دیا۔

رات کے ڈھائی بجے ہوں گے، ساری دُنیا محوِ خواب تھی مگر چاندنی جاگ رہی تھی، اس نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا، وہ غافل ایک آسودہ نیند سو رہا تھا، چاندنی آہستگی سے اُٹھی اور دروازہ کھول کر بالکونی میں آگئی، اس نے برابر کے کمرے کی طرف دیکھا، زمین پر سگریٹوں کے بے شمار ٹکڑے پڑے ہوئے تھے، ایک سگریٹ ابھی تک سلگ رہا تھا، یقیناً وہ نوجوان ابھی ابھی بالکونی سے کمرے میں گیا ہے، چاندنی سگریٹ کے ٹوٹے کے ساتھ سُلگنے لگی، سگریٹ راکھ بن گیا لیکن چاندنی کی آگ میں اور اضافہ ہو گیا۔ وہ دیر تک بالکونی میں کھڑی رہی، اندر نندا سو رہا تھا، اس نے نندا کے جسم پر چادر ڈال دی اور پھر اس کے قریب لیٹ گئی۔

دُوسرے دن شوہر کے جانے کے بعد چاندنی ایک بار پھر دُلھن بنی، اس نے پورے اہتمام سے سنگھار کیا۔ جیسے راجہ اِندر کی سبھا سجانے جا رہی ہو۔ گلابی بدن، گلابی ساڑھی، گلابی بلاؤز۔ وہ گلاب کا پھول تھی ــ اس قدر بجنے کے بعد وہ بالکونی میں گئی، وہاں نوجوان موجود تھا اور مُسکرا رہا تھا۔

چاندنی کا سانس پھُول گیا، اپنے بستر پر آکر اس نے پھر حوصلے یک جا کیے اور بہت کچھ سوچا، وہ دوبارہ گئی اور نوجوان کی پُرشوق نظروں کی تاب نہ لا کر پھر واپس آگئی۔ بار بار یہی ہوتا رہا۔ آخر اس نے ایک فیصلہ کر لیا۔ وہ تمام اندیشوں اور وسوسوں کا جائزہ لے چکی تھی، وہ ایک ذہین لڑکی تھی۔ اس کا شوہر اُس سے والہانہ محبت کی باتیں کر کے گیا تھا ــ شوہر سے وفاداری کی زنجیر اس کے پیروں میں پڑی ہوئی تھی مگر یہ زنجیر اُس کاری نظر کے شعلے سے ہمیشہ پگھل جاتی ہے، جس کے اُٹھنے پر وقت اور مقام کی کوئی پابندی نہیں عائد کی جا سکتی۔

چاندنی کے دِل میں ایک طوفان برپا تھا۔ وہ اپنے آپ میں نہیں تھی۔ وہ اس زنجیر سے بندھی کشاں کشاں اپنے محبوب کی جانب چلی جا رہی تھی، اس نے اپنے سَراپا پر ایک گہری نظر ڈالی اور جھرجھری لے کر دروازے کی طرف بڑھی۔ زندگی میں پہلے کبھی چاندنی نے اپنے اندر اتنی کشش محسوس نہیں کی تھی، ساڑھی کا آنچل سنبھال کے اس نے برابر کے کمرے کی طرف دیکھا۔ دروازے کا ایک پَٹ کھُلا ہوا تھا، وہ ڈرتی جھجکتی کمرے میں داخل ہو گئی، اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ کیا کہنا ہے اور کیا سُننا ہے؟

نوجوان، چاندنی کو اپنے کمرے میں دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ چند لمحوں تک وہ بالکل مبہوت رہا، جیسے اسے سکتہ ہو گیا ہو۔ اس نے اضطراری کیفیت میں کہا: "بیٹھیے"۔

چاندنی شرم و حیا سے لرزتی ہوئی ایک کُرسی پر بیٹھ گئی، نوجوان اُسے محبّت اور محویت سے دیکھنے لگا۔ ان کے درمیان چند ثانیوں کے لیے خاموشی طاری رہی، وہ ایک دوسرے سے نظریں چُرا رہے تھے، پھر نوجوان کے چہرے پر مُسکراہٹ چھا گئی۔ اور وہ دونوں کوئی بات کیے بغیر مُسکرا دیے اور انھوں نے جلتی، بُجھتی نگاہوں کے ذریعے ایک دوسرے سے بہت کچھ کہہ دیا۔

"میں کئی راتوں سے سو نہیں سکا ہوں۔" نوجوان نے پہل کی۔

چاندنی خاموش رہی، اس نے شرما کر نظریں جھُکا لیں۔

"میں نے خوابوں میں ہمیشہ آپ کو دیکھا ہے۔" نوجوان نے پھر جسارت کی ــ

چاندنی کے لَب ہلے لیکن وہ کچھ بول نہ سکی۔

"اور ایک مدّت بعد میں نے آپ کو پا لیا ہے، کاش میرے خواب جھُوٹے نہ ہوں۔" نوجوان نے جذباتی ہو کر کہا۔

چاندنی کی آنکھیں بولتی رہیں، نوجوان نے آگے بڑھ کر اس کا نرم و نازک ہاتھ تھام لیا، وہ دُہری ہو گئی۔ اس نے مزاحمت کے طور پر کچھ کہنا چاہا مگر الفاظ اس کے ہونٹوں پر ایک دل آویز تبسم بن کر بکھر گئے۔ وہ ایک دہشت زدہ فاختہ کی طرح تڑپ کر نوجوان کے بازوؤں میں پناہ گزیں ہو گئی۔

وہ ایسے ملے، جیسے انھیں بچھڑے ہوئے ہزار سال گزر چکے ہوں، وہ دونوں گرد و پیش سے بے خبر دیر تک راز و نیاز میں مصروف رہے انھیں یہ بھی خیال نہ رہا کہ وہ کہاں ہیں اور کتنا وقت گزر گیا ہے؟ پھر انھوں نے کچھ عہد و پیمان کیے اور ایک دوسرے کے دِل میں ارمانوں کا چراغ روشن کر کے بادلِ نخواستہ رخصت ہو گئے۔

چاندنی اپنے کمرے میں پہنچی تو تھوڑی دیر بعد نندا آگیا اور اس نے آتے ہی چاندنی کے رخساروں پر اپنا قبضہ جما لیا، چاندنی نے آج دہلی کے بازاروں اور تفریح گاہوں میں گھومنے کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ وہ فوراً تیار ہو گئی اور خاموشی سے اپنے شوہر کے ساتھ ہوٹل سے باہر چلی گئی۔

رات کو وہ کئی بار اُٹھ کر بالکونی میں گئی، جہاں نوجوان کھڑا ہوا سگریٹیں پھُونک رہا تھا۔

پھر جب صبح نندا حسبِ معمول کام پر چلا گیا تو چاندنی نوجوان کے کمرے میں منتقل ہو گئی۔ کئی دِنوں تک یہ ہوا کہ وہ صبح سے دوپہر تک وہیں رہتی۔ رات کو وہ کئی کئی بار بالکونی میں جاتی اور شام کو نندا کے ساتھ سیر کے لیے نکل جاتی۔

نوجوان کا نام کیلاش تھا اور وہ دہلی میں کسی اعلا ملازمت کی اُمید میں ٹھیرا ہوا تھا۔ چاندنی نے اُسے میرٹھ آنے کی دعوت دی اور اصرار کیا کہ وہ وہیں کوئی ملازمت کرے۔ اس نے کیلاش کو اپنے مکان کا پتہ بتلاتے ہوئے کہا کہ اُس میں نیچے کا کچھ حصّہ خالی ہے۔ وہ تم کسی طور کرائے پر لے لینا۔"

سیٹھ نندا دہلی میں دس بارہ دِن قیام کے بعد میرٹھ چلا آیا۔ کیلاش بھی اُس وقت تک دہلی میں ٹھیرا رہا تھا۔ چاندنی آخر میں دو تین مرتبہ بالکونی میں جا کر اُسے الوداع کہہ کے رُخصت ہو گئی تھی، اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے، نندا نے چاندنی کی نَم آنکھوں پر کوئی توجہ نہیں دی جو آخری لمحے تک کیلاش کے وجود کا محاصرہ کیے رہیں ــ

چاندنی کو میرٹھ آئے تین ہی دن ہوئے تھے کہ شام کے وقت کسی نے بیرونی دروازہ کھٹکھٹایا۔ چاندنی لپک کے کھڑکی میں پہنچی، دروازے میں اس کی توقع کے مطابق کیلاش کھڑا تھا۔ چاندنی کے منہ سے سسکی نکل گئی۔

سیٹھ نندا نے جا کے دروازہ کھولا۔ کیلاش اس کے لیے قطعی اجنبی تھا کیونکہ وہ دہلی میں اُسے نہیں دیکھ سکا تھا۔ "فرمایئے!" سیٹھ نندا نے پھیکے انداز میں پوچھا: "آپ کس سے ملنا چاہتے ہیں؟"

"شاید میں صحیح جگہ پہنچا ہوں۔" کیلاش نے شائستگی سے کہا: "آپ غالباً موہن لال جی ہیں؟"

"نہیں، میرا نام نندا ہے، البتہ یہ مکان موہن لال جی کا ہے، فرمایئے اُن سے کیا کام ہے؟"

"اوہ!" کیلاش نے مسکرا کے کہا: "نندا جی! مجھے معلوم ہوا ہے آپ کے مکان کا نیچے کا حصّہ کرائے کے لیے خالی ہے؟"

"ہاں ہے تو۔" نندا نے مختصر جواب دیا اور اسے بیٹھک میں لے آیا۔ اس نے کیلاش سے کئی سوالات کیے۔ کیلاش نے ہر سوال کا مناسب اور موزوں جواب دیا۔ اس نے بڑھے ہوئے کرائے پر بھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس کی شائستگی سے متاثر ہو کر نندا مکان دینے پر کچھ آمادہ نظر آنے لگا۔ چاندنی کیلاش کو بتا چکی تھی کہ کسی کنوارے آدمی کو مکان کرائے پر نہیں دیا جائے گا، اس لیے کیلاش نے اپنے آپ کو شادی شدہ ظاہر کر کے نندا کو مطمئن کر دیا، اس نے کہا۔ "میری بیوی راجپوتانے میں ہے، حالات ٹھیک ہوتے ہی میں اُسے بھی بُلا لوں گا۔"

سیٹھ نندا اچھی طرح اطمینان کر لینے کے بعد کیلاش کو مکان دینے پر رضامند ہو گیا۔ دوسرے روز کیلاش اپنے سامان سمیت چاندنی کے مکان میں منتقل ہو گیا۔ سیٹھ نندا کاروبار اور نئے مکان کی تعمیر کے سلسلے میں بہت مصروف ہو گیا تھا اس لیے رات گئے گھر واپس آنے لگا تھا۔ جب نندا اپنے کام پر چلا گیا تو چاندنی چپکے سے کیلاش کے کمرے میں پہنچ گئی اور بے اختیار کیلاش کی آغوش میں سما گئی۔ پھر یہ ہوا کہ جب بھی موقع ملتا، چاندنی اپنی ماں کی نظر بچا کر کیلاش کے پاس پہنچ جاتی اور وہ دونوں ایک دوسرے میں گم ہو جاتے، اس قربت سے اُن کی شدّتیں کم نہیں ہوئیں بلکہ اور بڑھ گئیں۔ یہاں تک کہ ایک پل کی جدائی بھی دونوں کو شاق گزرنے لگی۔

چاندنی اس چوری چھُپے کی محبّت کے انجام سے یقیناً بے خبر نہیں تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ ایسی باتیں زیادہ دیر تک نہیں چھُپ سکتیں۔ نیا مکان آدھے سے زیادہ تعمیر ہو چکا تھا، اس کی تعمیر مکمل ہوتے ہی چاندنی کو اپنے شوہر کے ساتھ وہاں منتقل ہو جانا تھا لیکن وہ کیلاش سے بچھڑنے کے لیے کسی طرح تیار نہیں تھی۔ وہ دونوں تنہائیوں میں

ایک دوسرے سے مستقل وابستہ ہونے کی تجویزیں سوچتے رہتے،
آخر چاندنی کے ذہنِ رسا میں ایک ترکیب آئی یا یوں کہیے کہ عشق نے اپنا
نشیب دیکھ لیا۔ اس نے ایک روز کیلاش کے ہاتھ میں پانچ ہزار روپے
تھما دیے۔ کیلاش چاندنی سے رقم لینے کے لیے تیار نہیں تھا مگر جب
چاندنی نے اُس سے ضد کی اور اپنا منصوبہ سمجھایا تو وہ آمادہ ہوگیا۔
چاندنی نے اُس سے ایک کیمرہ اور زنانہ راجپوتانی ملبوس مہیا کرنے
کی فرمائش کی۔ کیلاش نے پہلی فرصت میں اُسے یہ چیزیں فراہم کر دیں۔
عورتوں کا روایتی راجپوتانی لباس اور ایک کیمرہ ــــ کیلاش چاندنی کا منصوبہ
سُن کر اُس کی ذہانت کا قائل ہوگیا تھا۔ منصوبے کا پہلا مرحلہ انھوں
نے بحسن وخوبی انجام دے دیا اور اُن دنوں کا انتظار کرنے لگے جب
یہ رسمی دُوری ختم ہو اور وہ دونوں ہمیشہ کے لیے ایک ہو جائیں۔

کیلاش کو میرٹھ آئے ہوئے ڈیڑھ ماہ سے زیادہ عرصہ گزر
چکا تھا۔ وہ کم آمیز آدمی تھا اور لوگوں سے کم ملتا تھا' اس عرصے میں
نندا سے بھی اُس کی ملاقات گاہے گاہے ہوتی تھی اور میرٹھ میں اُس
نے ایک اچھی ملازمت بھی حاصل کر لی تھی' ایک روز کیلاش میز
کے سامنے بیٹھا مطالعے میں مصروف تھا کہ اُس نے چاندنی کی
ماں کو اپنے کمرے کی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ اُس نے پہلے ہی
اپنے حُسنِ اخلاق سے چاندنی کی ماں کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ وہ
سامنے آئی تو کیلاش نے ادب سے کھڑے ہو کر پرنام کیا "بیٹھیے
ماں جی! کہیے میں کیا سیوا کر سکتا ہوں؟"

جواب دینے کے بجائے چاندنی کی ماں کی نظر اُس تصویر کے
فریم پر اٹک گئی جس میں کیلاش اُس کی بیٹی چاندنی کی ہم شکل لڑکی کے
ساتھ کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں، وہ تذبذب
کے عالم میں کبھی تصویر کی طرف دیکھتی اور کبھی کیلاش کی طرف۔ کیلاش
نے حیرانی کے لہجے میں پوچھا "کیا بات ہے ماسی؟"

"تصویر میں تمھارے ساتھ یہ کون لڑکی کھڑی ہے؟" چاندنی
کی ماں نے تجسّس سے دریافت کیا۔

"یہ آپ کی بہو ہے" کیلاش نے سادگی سے جواب دیا۔

"تعجّب ہے" چاندنی کی ماں زیرِ لب بڑبڑائی "ہو بہو وہی۔
تمھاری بیوی تو بالکل میری چاندنی کی طرح ہے۔ کوئی فرق معلوم
نہیں ہوتا۔"

"کون چاندنی؟" کیلاش نے سادگی سے پوچھا۔

"ارے تم نے چاندنی کو نہیں دیکھا؟ وہ میری بیٹی ہے۔"

"جی نہیں۔ کبھی اتفاق نہیں ہوا' میں اصل میں ملازمت
کے سلسلے میں گزشتہ دنوں زیادہ تر گھر سے باہر رہا۔"

"اچھا یہ تصویر تھوڑی دیر کے لیے مجھے دے دو۔ چاندنی
کو دکھاؤں گی تو وہ بھی اچنبھے میں پڑ جائے گی۔"

"لے جائیے ماں جی۔ تصویر تو ہوتی ہی دکھانے اور دیکھنے
کے لیے ہے مگر خیال رہے کئی خطوں کے بعد اُس نے مجھے پچھلے
ہفتے تصویر بھیجی ہے۔"

"اچھا اچھا" چاندنی کی ماں سرلا تصویر اپنے ساتھ لے گئی۔
اُس نے جب یہ تصویر چاندنی کو دکھائی تو چاندنی کے معصوم چہرے
پر حیرتوں نے یلغاری کر دی۔ وہ دیر تک گنگ رہی' پھر اپنے شوہر
کا انتظار کرنے لگی۔ نندا گھر آیا تو ماں بیٹی نے اُسے کرائے دار کی بیوی
کی تصویر دکھائی۔ وہ بھی اس حیرت انگیز مشابہت پر انگشت بدنداں
رہ گیا۔ ایک لمحے کے لیے اُس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ ایک راجپوت
عورت اپنے روایتی لباس میں سر سے پیر تک زیوروں میں لدی
پھندی کیلاش کے ساتھ کھڑی تھی "یہ قدرت کا عجیب کرشمہ ہے"
سیٹھ نندا نے زیرِ لب کہا اور چاندنی کو اپنے سینے میں سمیٹ لیا۔

"تمھیں کیسا لگ رہا ہے؟" چاندنی نے اشتیاق سے پوچھا۔

"عجیب سا' مجھے دُکھ ہوا" نندا نے چاندنی کی زلفیں چوم لیں۔

"کیوں؟"

"میں سمجھتا تھا کہ دُنیا میں تمھارے رنگ روپ کی صرف ایک
عورت ہے' جس کا مالک میں ہوں۔"

"ہونہہ" چاندنی نے خفگی سے اپنی زلفیں کھینچ لیں۔

"کیا ناراض ہوگئیں؟" نندا نے ہنستے ہوئے کہا "میں تو یوں
ہی کہہ رہا تھا، تمھی میرے لیے سب کچھ ہو۔ ممکن ہے وہ لڑکی تم
جیسی سُندر ہو مگر تم جیسی محبّت کرنے والی نہ ہو۔"

"اچھا یہ بتاؤ تمھیں کیسا لگا؟"

"مجھے تو خوشی ہوئی کہ میں دنیا میں اکیلی نہیں ہوں" چاندنی
نے مسکراتے ہوئے کہا "پر یہ کیسی انوکھی بات ہے مجھے اُس سے
ملنے کی تمنّا ہے۔"

دوسرے دن صبح نندا کے جانے کے بعد چاندنی کیلاش کے کمرے
میں چلی گئی اور اس نے اُسے خوشخبری سُنائی کہ منصوبے کا پہلا
مرحلہ حسن وخوبی کے ساتھ انجام پا گیا ہے کیلاش بے قراری سے اس
کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے چاندنی کو بے تاب ہو کے گلے لگا لیا۔ دوسرے

مرحلے پر عمل کرنے کے خیال سے کیلاش بہت خوف زدہ تھا لیکن چاندنی مصر تھی کہ اس پر عمل کیے بغیر وہ کبھی ایک نہیں ہو سکیں گے اور ہمیشہ تڑپتے رہیں گے، دوسرے مرحلے میں خاصے دن لگ گئے۔ اُدھر مکان تیزی سے مکمل ہو رہا تھا۔ کیلاش کے آنے کے وقت چاندنی کھڑکی میں کھڑی ہو جاتی اور کیلاش کا مُرجھایا ہوا چہرہ دیکھ کر سمجھ لیتی کہ اسے آج بھی ناکامی ہوئی ہے، کھڑکی سے اُس کی نگاہیں صدہا مکانوں کا کام کر جاتیں۔ اُن دنوں نندا اور زیادہ دیر میں گھر آتا تھا۔ جب مکان تکمیل پانے لگا تو ایک دن چاندنی گھبرائی ہوئی کیلاش کے پاس پہنچی اور اس نے کیلاش سے کہا۔ "اب یہ آخری دن ہیں، نندا جی آج رات بھی دیر سے گھر لوٹیں گے۔ اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ہمیں اپنا منصوبہ آج ہی مکمل کر لینا چاہیے۔ ہم کسی دن بھی نئے مکان میں منتقل ہو سکتے ہیں، ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔"

"دیکھو، آج میں پھر جا رہا ہوں، بڑی مشکل سے ایک ہزار روپے میں اُسے تیار کیا ہے، پانچ سو پیشگی دے چکا ہوں۔"

"تم کیا جانو مجھ پر کیا گزر رہی ہے" کیلاش نے رازداری سے کہا۔ "اب مجھے خوف آنے لگا ہے۔"

"میں نے خود کو میڈیکل کالج کا طالب علم ظاہر کیا ہے، کسی دن بھی کام بن جائے گا۔" کیلاش نے اُمید کے ساتھ کہا۔

"بھگوان کرے آج ہی، آج پھر نندا جی دیر سے آئیں گے۔"

اور بھگوان نے اُسی دن چاندنی کی دُعا قبول کر لی۔ اُسی رات ساڑھے دس گیارہ کا عمل ہو گا۔ موسمِ سرما کی رات تھی، سارے محلے پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ چاندنی کے ماں باپ حسبِ عادت جلدی سو چکے تھے۔ نندا ابھی تک نہیں آیا تھا۔ چاندنی بڑی بے چینی سے اپنی نرم، لچک دار ریشمی گدّوں والی مسہری پر کروٹیں بدل رہی تھی، اسے اب رات کو نیند ہی نہیں آتی تھی، پھر وہ بستر سے اُٹھ کر نیچے آئی اور بیرونی دروازے کا پٹ کھول کے کھڑی ہو گئی۔ آج کیلاش بھی ابھی تک نہیں آیا تھا۔

پونے گیارہ بجے کے قریب کیلاش اپنی پشت پر ایک بڑی گٹھڑی لادے مکان میں داخل ہوا۔ چاندنی کا دل ڈولنے لگا۔ دونوں نے اشاروں اشاروں میں بات کی، کیلاش چاندنی کے پیچھے چپکے سے اُوپر آ گیا اور اُس نے گٹھڑی کھول دی، چاندنی دو قدم پیچھے ہٹ گئی، گٹھڑی میں کسی بوڑھی عورت کی سکڑی سمٹی لاش موجود تھی۔ کیلاش نے لاش کو مسہری پر لٹا دیا اور دبے پاؤں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ اس کے چہرے پر فکرمندی کے آثار تھے۔

چاندنی نے لرزتے ہاتھوں سے خواب گاہ کے دروازے کی چٹخنی لگا دی۔ پھر اس نے جلدی جلدی اپنے تمام کپڑے اُتار کے دوسرا لباس زیبِ تن کر لیا۔ اس لباس میں وہ ایک حسین راجپوت عورت معلوم ہوتی تھی، چاندنی نے اپنے اُتارے ہوئے کپڑے جیسے تیسے مسہری پر پڑی ہوئی لاش کو پہنا دیے اور اسے چادر اُڑھا دی، چاندنی سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی مگر کوئی ایسا جذبہ تھا جو اس کا حوصلہ برقرار رکھے ہوئے تھا۔ اس نے کھڑکی سے جھانک کر نیچے دیکھا۔ کیلاش صحن میں بڑی تیزی سے ٹہل رہا تھا۔ چاندنی نے میز کے نیچے سے موٹے رسّے کا ایک گولا نکالا اور اسے کھول کر اس کا ایک سرا کھڑکی سے نیچے فرش تک لٹکا دیا۔

پھر اس نے گہری نظر سے کمرے کا جائزہ لیا۔ کسی خیال کے تحت وہ سخت اُداس ہو گئی مگر جلد ہی اُس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا اور مسہری کے نیچے سے مٹی کے تیل کا ڈبّا نکال کر لاش پر چھڑکنے لگی۔ لاش تیل میں نہا گئی۔ چاندنی نے حسرت سے اپنے کمرے کی طرف دیکھ کر آگ لگا دی، ایک چھوٹا سا شعلہ بل کھا کے بلند ہوا اور تیزی سے اطراف کا احاطہ کرنے لگا۔ چاندنی دوڑ کر کھڑکی میں پہنچی اور نیچے لٹکے ہوئے رسّے کے ذریعے اندھیرے میں غائب ہو گئی۔

"آگ، آگ، آگ، انسے موہن لال کی دل خراش چیخوں نے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ تھوڑی دیر میں سارا محلّہ جاگ گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک ہجوم جمع ہو گیا۔ کیلاش بھی اس ہجوم میں شامل تھا اور آگے بڑھ بڑھ کر آگ بجھانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ کمرہ دھوئیں اور شعلوں سے بھرا ہوا تھا۔ مسہری اور اس کے اطراف کی چیزیں آگ کی لپیٹ میں اُچھل رہی تھیں، دوسرا سامان بھی تیزی سے جل رہا تھا۔ کیلاش نے موقع پا کر کھڑکی سے لٹکتا ہوا رسّا نیچے گرا دیا اور آگ بجھانے میں دوسروں کا ساتھ دینے لگا۔ آگ پر قابو پانے میں بہت دیر لگی۔

دیر ہو چکی تھی، چاندنی کی لاش بُری طرح جل جانے کی وجہ سے ناقابلِ شناخت ہو گئی۔ جلا ہوا، ٹکڑوں میں بٹا ہوا جسم نظر آ رہا تھا۔ گھر میں کہرام مچ گیا۔ موہن لال اور اُس کی بیوی سرلا کی آہ و زاری نے آسمان سر پر اُٹھا لیا تھا۔ وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہے تھے، چاندنی کی المناک موت پر پورا محلّہ غم زدہ تھا۔ کسی نے سیٹھ نندا کو جا کے خبر دی۔ جب وہ پاگلوں کی طرح گھر لوٹا تو اس نے اپنا سر دیواروں سے پھوڑنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ نہ روتا تھا نہ چیختا تھا۔ سکتے کی حالت میں لوگوں نے اس ناتواں کو بستر پر لٹا دیا۔

چاندنی مر گئی تھی اور گھر میں اندھیرا ہو چکا تھا۔ اس کی موت کو دس دن گزر چکے تھے لیکن اس کے ماں باپ کی آنکھیں ابھی تک جھڑن بہا رہی تھیں، انھیں کوئی صبر کی تلقین کرتا تو ضبط کا بندھن اور ٹوٹ جاتا اور آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک سمندر رواں ہو جاتا۔ نندا نے چاند محل کی تعمیر کا کام رکوا دیا تھا اور کاروبار بند کر دیا تھا۔ وہ چاندنی کے سوگ میں نیم دیوانہ نظر آتا تھا۔ کیلاش ہر طرح ان ستم رسیدوں کی دل جوئی اور غم گساری کرتا تھا۔

ان کی حالت کسی قدر سنبھلی تو ایک روز کیلاش سب سے اجازت لے کر اپنی بیوی کو لینے راجپوتانے روانہ ہو گیا۔ وہ ایک ہفتے تک غائب رہا۔ آٹھویں دن موہن لال کے مکان کے سامنے ایک تانگا رکا۔ کیلاش اپنی بیوی کو ساتھ لے آیا تھا۔ اس کی بیوی نے ہلکے سُرخ رنگ کا ریشمی گھاگھرا پہن رکھا تھا۔ گھاگھرے کے کناروں پر سفید رنگ کا چوڑا گوٹا لگا ہوا تھا۔ دھانی رنگ کی چُندری کے لمبے گھونگھٹ سے چاندنی کا دلکش چہرہ جھلک رہا تھا۔ کیلاش بیوی کو دروازے کے پاس چھوڑ کے اُوپر گیا۔ اس نے موہن لال اور اس کی بیوی کو پرنام کر کے اپنی بیوی کی آمد سے مطلع کیا۔

"اُوپر کیوں نہیں لے آئے بیٹے؟" سرلا نے اشتیاق اور حسرت سے کہا۔

کیلاش فوراً نیچے جا کے اپنی بیوی کو اُوپر لے آیا۔ کیلاش کی بیوی نے موہن لال اور اس کی بیوی کو ادب سے نمسکار کیا۔ چاندنی کی ماں اُسے محویت سے تکے جا رہی تھی۔ موہن لال کا دل ایک مانوس سی آواز سن کر دھڑک رہا تھا۔ "کیا نام ہے بیٹی تمھارا؟" موہن لال کی بیوی نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"جی۔ جا۔ جانکی ماتا جی۔"

"بڑا سُندر نام ہے، بھگوان جانتا ہے میری بیٹی چاندنی بالکل تمھاری طرح تھی۔"

"جی ہاں، میرے پتی دیو نے مجھے ان کے بارے میں بتایا ہے۔" کیلاش کی بیوی نے تاسف سے کہا۔ "اب مجھے آپ اپنی بیٹی سمجھیں۔"

جانکی نے چند روز میں اپنے حُسنِ سلوک سے موہن لال اور اُس کی بیوی کے دل موہ لیے۔ اسے اپنے ماں باپ سے بے پناہ محبت تھی، وہ انھیں بڑھاپے میں بے سہارا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ کیلاش نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ہر حال میں اس کے ماں باپ کا خیال رکھے گا۔ چاندنی کو حاصل کر کے کیلاش کے چہرے پر رنگ آ گیا تھا۔ اس کے قدم زمین پر نہیں پڑتے تھے، وہ چاندنی کے ماں باپ کے قدموں میں بچھا جاتا تھا۔

ایک دن جانکی اپنی ماں سرلا کے پاس بیٹھی ہوئی باتیں کر رہی تھی کہ سیٹھ نندا آ گیا۔ وہ بہت کمزور اور بوڑھا سا شخص معلوم ہو رہا تھا۔ چہرے پر غم و اندوہ نے عجب بے رونقی پیدا کر دی تھی، جانکی نے اُسے آتا دیکھ کر لمبا سا گھونگھٹ نکال لیا۔

"یہ کون دیوی ہیں؟" سیٹھ نندا نے حیرانی کے ساتھ اپنی ساس سے پوچھا۔ اس نے شاید جانکی کی ایک جھلک دیکھ لی تھی۔

"یہ ہمارے کرائے دار کی پتنی ہیں۔"

سیٹھ نندا حواس باختہ ہو گیا۔ اس کی گردن جھک گئی اور وہ اپنے کمرے میں جا کر بُری طرح رونے لگا۔ جانکی کنکھیوں سے اسے دیکھ کر اس کے کمرے سے گزرتی ہوئی نیچے چلی گئی۔

میرے دوست رام دیال کی ماں ایک گیانی دھیانی عورت تھی۔ اُس نے مجھ سے انکا دیوی کی پُراسرار قوت کا بارہا ذکر کیا تھا لیکن میں نے اُسے ایک توہم سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ ایک روز دفتر جاتے وقت مجھے اپنے سر میں کچھ غیر معمولی چبھن محسوس ہوئی۔ میں نے سر جھٹکا، بالوں میں انگلیاں پھیریں مگر چبھن کم نہ ہوئی۔ میں نے اپنے سر پر تصور کی نگاہ ڈالی تو ایک ناقابلِ یقین منظر نظر آیا۔ کوئی خوبصورت نازک نوعمر اور نخریلی لڑکی میرے سر پر بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ یہ انکا تھی۔ انکا ایک غیر مرئی دیوی تھی۔ وہ کسی بھی شخص کے سر پر جا کر اُسے اپنا آلۂ کار بنا لینے کی طاقت رکھتی تھی۔ اُس کے لیے ایک مخصوص جاپ کرنا پڑتا تھا۔ جاپ کے ذریعے جو شخص اُس پر تصرف حاصل کر لیتا تھا انکا اُس کے اشاروں پر ناچتی تھی۔ اُسے اپنے آقا کی خوشنودی کے لیے دشوار سے دشوار کام انجام دینے کا یارا حاصل تھا۔ چنانچہ بڑے بڑے پنڈت اور پجاری اُس کے حصول کی خاطر جان کی بازی لگانے کے لیے تیار رہتے تھے مگر میرے سر پر وہ خود بخود چلی آئی تھی۔ اُس نے مجھے پسند کر لیا تھا۔ انکا کی آمد میری خوش نصیبی کا آغاز ثابت ہوئی۔ اُس نے ایک غریب الوطن مفلس کو ایک متمول شخص بنا دیا۔ اُس کی بدولت میرے شب و روز رنگ رلیوں اور عیش و عشرت میں گزرنے لگے مگر اس زندگی کا دوسرا رخ انتہائی ہولناک تھا۔ انکا کی طاقت و وجود کی بقا انسانی خون پر منحصر تھی لیکن وہ خود اپنے ہاتھوں سے کسی انسان کو قتل کرنے کی صلاحیت سے محروم تھی۔ اُس کے لیے یہ کریہہ اور ظالمانہ کام مجھے انجام دینا پڑتا تھا۔ انکا کے اشارے پر میں نے سب سے پہلے اپنی محبوبہ نرگس کے منگیتر کو ہلاک کیا۔ یہ میرا پہلا قتل تھا۔ اس بھیانک خدمت کے صلے میں انکا نے مجھے نہال کر دیا اور کچھ ایسے ڈرامائی حالات پیدا کیے کہ نرگس اپنے والدین سے باغی ہو کر ہمیشہ کے لیے میری آغوش میں آگئی۔ نرگس کی رفاقت میری زندگی کی ایک بہت بڑی مسرت تھی مگر میں انکا کی وجہ سے قتل و غارت، مقدمات، گرفتاری اور رسوائی کے ہنگاموں میں اُلجھا رہتا تھا۔ اس لیے مجھے سکون حاصل نہیں تھا۔ میں نے انکا سے پیچھا چھڑا کر شریفانہ زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کیا اور انکا سے گلوخلاصی کی کوشش شروع کر دیں۔ انکا بپھر گئی۔ اُس نے میرے لیے مصیبتوں کے پہاڑ کھڑے کر دیے۔ کار کا حادثہ کرا کے میرا ایک ہاتھ ضائع کرا دیا اور نرگس کو مجھ سے چھین کر ایک نامحرم کی جھولی میں ڈال دیا۔ یہ شرمناک صورتِ حال میرے لیے قطعاً ناقابلِ برداشت تھی۔ بادلِ ناخواستہ مجھے انکا سے مفاہمت کرنی پڑی۔ نرگس واپس آگئی اور میں ایک بار پھر لذتوں اور اذیتوں کی دھوپ چھاؤں سے دوچار ہو گیا۔ رفتہ رفتہ انکا میری عادت بن گئی۔ وہ میرے سر پر سجدہ ہوتی تو میں خود کو نامکمل محسوس کرنے لگتا۔ انہی دنوں ایک عجیب سانحہ پیش آیا۔ پونا کے ایک کمینے پنڈت تریبنی داس نے میری اور انکا کی شدید مدافعت کے باوجود خصوصی جاپ کر کے انکا کو حاصل کر لیا۔ طوطا چشم انکا نے مجھ سے آنکھیں پھیر لیں۔ میری دنیا اندھیر ہو گئی۔ تریبنی داس نے انتقاماً مجھے اپنا غلام بنا کر مجھ سے بے شمار انسانیت سوز جرائم کا ارتکاب کروایا اور مجھے ذلت و خواری کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا۔ میں اپنی زندگی کا وہ الم ناک دور کبھی نہیں بھول سکتا۔ پھر ایک دوسرے پنڈت بدری نرائن نے مجھے انکا کی بازیافت کے لیے رام پور کے ایک مجذوب برکاتی شاہ کا پتہ بتایا۔ پتہ بتانے کے معاوضے میں اُس نے مجھ سے یہ عہد لیا کہ جب انکا واپس آجائے گی تو میں کچھ دنوں کے لیے اُسے بدری نرائن کی تحویل میں دے دوں گا۔ میں نے وعدہ کر لیا اور افتاں و خیزاں برکاتی شاہ کے پاس پہنچا۔ اُس مردِ بزرگ نے میری دستگیری کی اور ایک ویران قبرستان میں مجھ سے چلہ کشی کروائی۔ کچھ روز بعد انکا دوبارہ مجھے مل گئی اور بدری نرائن ایفائے عہد کے لیے میرے سر پر سوار ہو گیا۔ میں انکا سے بچھڑنے کا عبرت ناک خمیازہ ایک بار بھگت چکا تھا اس لیے میں نے بدری نرائن کو ٹال دیا۔ بدری نرائن بڑا ذلیل اور ظالم آدمی تھا۔ اُس نے میرا جینا محال کر دیا۔ وہ نیچ ہتھکنڈوں پر اتر آیا یہاں تک کہ ایک روز اُس نے انکا کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر نرگس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔ بدری نرائن کے خلاف میرے سینے میں لاوا دہکنے لگا۔ وہ بدذات کلکتے جا کر کالی کے مندر میں پناہ گزیں ہو گیا۔ کالی کی مہان شکتی کے مقابلے میں انکا بے بس تھی مگر میں انجام سے بے پروا ہو کر طوفان اور آندھی کی طرح کلکتے جا پہنچا۔ یہاں میں نے اشتعال کے عالم میں مندر کے بڑے پجاری کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ انکا نے مجھے قابو میں رکھنے کے لیے میری دماغی قوت سلب کر لی۔ میں زندہ درگور ہو گیا۔ ایسے میں اگر کلدیپ میری دلداری نہ کرتی تو میں خودکشی کر لیتا۔ کلدیپ پونا کے ایک دولت مند خاندان سے تعلق رکھتی تھی مگر میری محبت اُسے میرے ساتھ شہر شہر بھٹکا رہی تھی۔ مجھ پر بدری نرائن کو ٹھکانے لگانے کا جنون سوار تھا۔ اُس سے نمٹنے کے لیے میں ہندوستان کے ایک بہت بڑے پنڈت پریتم لال سے مدد لینے کے لیے انکا اور کلدیپ کو ساتھ لے کر پریتم لال کے استھان پر پہنچا۔ یہ جگہ میسور کی ویران پہاڑیوں میں واقع تھی۔ یہاں پہنچ کر مجھ سے ایک زبردست گناہ سرزد ہو گیا۔ میں پریتم لال کی کنواری داسی مالا پر دست درازی کر بیٹھا۔ نتیجتاً مجھے پریتم لال کے غضب ناک عتاب کا شکار ہونا پڑا۔ اُس نے مجھے مفلوج کر کے انکا کو میرا خون پینے پر مجبور کر دیا اور کلدیپ کو اپنی داسی بنا لیا۔ ممکن تھا کہ عتاب کی یہ اذیت دہ مدت طویل ہو جاتی لیکن پریتم لال کا آخری وقت قریب آپہنچا۔ نزع کے عالم میں اُس نے مجھے معاف کر کے مالا کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھما دیا اور مجھے اپنی کچھ شکتی بھی دان کی۔ اُس کے کریا کرم کے بعد انکا اور مالا کو ساتھ لے کر اور کلدیپ کو بادلِ ناخواستہ رخصت ہو کر میں پونا پہنچا۔ یہاں میں نے تریبنی داس سے بھیانک انتقام لیا۔ میں نے انگلیاں گاڑ کے اُس کی آنکھیں نکال لیں۔ پھر اُسے معذور کر کے سڑکوں پر بھیک مانگنے کے لیے چھوڑ دیا۔ اب میرا دوسرا شکار بدری نرائن تھا۔ میں کلکتے کے لیے ٹرین میں سوار ہوا۔ راستے میں اچانک — برسوں کے بچھڑے ہوئے چچا جان سے ملاقات ہو گئی۔ کلکتے میں انھوں نے میرے ساتھ قیام کیا۔ بدری نرائن اب تک کالی کے مندر میں روپوش تھا۔ کلکتے میں ایک عجیب انکشاف ہوا۔ مالا کے والدین یہیں رہتے تھے۔ انھیں شہر میں ایک مسلمان کے ساتھ مالا کی موجودگی کا پتہ چل گیا۔ ایک دن میری غیر موجودگی میں انھوں نے مالا کو ہوٹل سے برآمد کر کے چچا جان کو اُس کے اغوا کے الزام میں گرفتار کرا دیا۔ پھر انکا اور آنجہانی پریتم لال کے ایک دوست سادھو جگدیو نے ڈرامائی انداز میں ان مصائب پر قابو پایا۔ چچا جان رہا ہو گئے اور مالا پھر مجھے مل گئی۔ اب کلکتے میں ٹھہرنا خطرناک تھا۔

چچا جان کے اصرار پر میں نے کچھ روز اُن کے گھر رہ کر گزارنے کا فیصلہ کیا۔ وہ لکھنؤ میں رہتے تھے۔ ہم لکھنؤ کے لیے روانہ ہوئے۔ ٹرین میں تزئین نامی ایک نوعمر اور خوبصورت لڑکی ملی۔ اُس میں مجھے اپنی مرحوم بیوی نرگس کی شباہت نظر آئی۔ میں نے بڑی شفقت اور انسیت کے ساتھ اُس سے باتیں کیں۔ میرے مخلصانہ رویّے نے اُسے بے حد متاثر کیا۔ وہ لکھنؤ کی ایک مشہور طوائف اشرفی بیگم کی لڑکی تھی اور اُس گندے ماحول سے مطمئن نہیں تھی۔ میں نے اُس سے وعدہ کیا کہ میں تمھیں وہاں سے نکالنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔ لکھنؤ میں چند روز بہت اچھے گزرے۔ میری چچا زاد بہنیں میرے اور مالا کے لیے بچھی جاتی تھیں۔ مالا میری بہترین رفیقہ ثابت ہوئی تھی۔ ایک شام انکا کو ساتھ لے کر میں اشرفی بیگم کے بالاخانے جا پہنچا۔ اشرفی بیگم ان دنوں تزئین کی اولین خوشہ چینی کے نیلام کی تیاری کر رہی تھی۔ لکھنؤ بھر کے امرا اور نوابین خوبصورت تزئین کے امیدوار تھے۔ خصوصاً ایک بڑا رئیس نواب بنّن علی خاں اس معاملے میں بڑھ چڑھ کر دلچسپی لے رہا تھا۔ میں اُس کے راستے کی دیوار بن گیا۔ اسی دوران میں اشرفی بیگم نے کسی شخص سے تزئین کا سودا طے کر دیا لیکن جس شام تزئین بکنے والی تھی اُسے اچانک کسی نے اغوا کر لیا۔ اشرفی بیگم نے اغوا کا الزام میرے سر تھوپ کر مجھے جیل بھجوا دیا۔ یہی مصیبت کیا کم تھی کہ ایک اور قیامت ٹوٹی۔ دیرینہ دشمن بدری نرائن نے کالی کے مندر میں چھپ کر انکا کے حصول کا جاپ مکمل کیا اور انکا کو مجھ سے چھین لیا۔ میں جیل سے باہر نکلا تو دنیا ویران تھی۔ انکا کے حصول نے بدری نرائن کا دماغ آسمان پر پہنچا دیا۔ اُس نے مجھ سے گن گن کر بدلے لیے اور سب سے بڑی کمینگی یہ کی کہ اپنے ناپاک بیروں کے ذریعے مالا کو ختم کروا دیا۔ یہ دوسرا زخم تھا جو اُس نے میرے دل کی گہرائی میں لگایا تھا۔ میں تلملا کر رہ گیا۔ مجھے جینا فضول معلوم ہونے لگا۔ کوئی بعید نہ تھا کہ میں کسی دیوار سے سر پھوڑ کر مر جاتا کہ ایک روز دفعتاً میری انکا میرے پاس لوٹ آئی۔ میرے محسن سادھو جگدیو نے خصوصی جاپ سے اُسے حاصل کر کے میرے قدموں میں ڈال دیا تھا۔ بدری نرائن نے موقع کی نزاکت بھانپ کر دو موسموں کے لیے پھر کالی کے مندر میں پناہ لے لی۔ انکا کے اکسانے پر میں نے اشرفی بیگم سے انتقام لینے کی ٹھانی۔ اشرفی بیگم کی موت بڑی عبرت ناک ثابت ہوئی۔ اُس کے ایک قوی ہیکل سازندے بنّے خاں نے انکا کے زیرِ اثر درندوں کی طرح اپنی مالکہ کا خون پیا۔ بالاخانے میں بھگدڑ مچ گئی۔ اس افراتفری سے فائدہ اٹھا کر بنّن علی اشرفی بیگم کی تجوری سے تمام نقدی اپنی حویلی کے کاغذات لے اڑا جو اُس نے دل نشیں نامی طوائف کے عوض اشرفی بیگم کی تحویل میں دے دی تھی۔ بنّن علی قلاش ہو کر اشرفی بیگم کے ہاں چلمیں بھرنے لگا تھا۔ اُس کی یہ بدترین حالت میری ہی وجہ سے ہوئی تھی۔ میں نے فوراً انکا کو اُس کے تعاقب میں روانہ کر دیا اور خود مقتل میں اکیلا رہ گیا۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ پولیس نے مجھے نرغے میں لے لیا۔ پولیس کے ساتھ بدذات بدری نرائن بھی موجود تھا۔ آج وہ مجھے ختم کر دینے کا پختہ ارادہ کر کے آیا تھا۔ میں پوری طرح پھنس چکا تھا لیکن اچانک ایک پُراسرار لڑکی کلپنا نے نمودار ہو کر مجھے اپنی حفاظت میں لے لیا اور دشمنوں کے حصار سے نکال کر آناً فاناً کلدیپ کے استھان پر پہنچا دیا۔ کلپنا پہلے بھی بعض مشکل موقعوں پر میری مدد کر چکی تھی۔ اُس کی اصلیت میرے لیے ایک سربستہ راز

تھی۔ بہرحال کلدیپ کا استھان میرا گھر تھا۔ میں اپنے گھر پہنچ گیا تھا۔ کلدیپ نے پریم لال کی جانشینی کا پورا پورا حق ادا کیا تھا اور اب وہ اپنی کٹھن ریاضتوں کے باعث ایک بھاری شکتی والی عورت بن چکی تھی مگر میرے لیے اس میں وہی اپنائیت اور چاہت تھی۔ یہاں ایک حیرت انگیز انکشاف ہوا۔ منوہر ترزین کلدیپ کے ساتھ تھی اور بڑی خوشگوار زندگی گزار رہی تھی۔ ترزین میں میری خصوصی دلچسپی کے پیش نظر کلدیپ نے اپنی پراسرار شکتی کے ذریعے اُسے اپنے پاس بلوا لیا تھا۔ کلدیپ اور ترزین نے میرے لیے دیدہ و دل فرش راہ کر دیے۔ میں بے پایاں مسرتوں سے ہم کنار ہو گیا۔ کچھ مدت بعد انکا بھی وہیں پہنچ گئی۔ اُس سے معلوم ہوا کہ لکھنؤ کی پولیس سرگرمی سے میری تلاش میں ہے اور بدری نرائن پھر کالی کے مندر میں جا چھپا ہے۔ بدری نرائن کا نام میرے لیے ایک گالی سے کم نہیں تھا۔ میرا خون کھول گیا لیکن میں کیا کر سکتا تھا؟ سر دست ہندوستان کی زمین مجھ پر تنگ تھی۔ میں نے کلدیپ کے مشورے پر کچھ عرصہ یورپ میں گزارنے کا پروگرام بنایا اور دولت علی کے فرضی نام سے پاسپورٹ بنوا کر ممبئی سے لندن جانے کے لیے طیارے میں سوار ہو گیا۔ دورانِ سفر انگلستان کی ایک رئیس زادی سارا سے میری دوستی ہو گئی۔ لندن پہنچ کر میں نے اُس کے ساتھ متعدد شبینہ کلبوں اور دوسری تفریح گاہوں میں کئی بہترین شامیں گزاریں۔ اُس کا باپ لارڈ اسمتھ بھی مجھ پر بہت مہربان تھا۔ انکا بھی لندن آ کر مسرور و مطمئن تھی مگر بدقسمتی میری پرانی رفیق ہے۔ وہ مجھے تلاش کرتی ہوئی لندن بھی پہنچ گئی۔ رابرٹ نامی ایک نوجوان سارا کا امیدوار تھا۔ سارا کا میری طرف جھکاؤ دیکھ کر وہ مجھ سے حسد کرنے لگا۔ اُس کا حسد اس قدر بڑھا کہ ایک روز اُس نے سارا کے باپ کو ایک ایسے گلاس میں زہر دلوا دیا جس پر میری انگلیوں کے نشانات تھے مگر اس سے پہلے کہ پولیس مجھ پر ہاتھ ڈالتی میں نے انکا کے ذریعے ایک عجیب کرشمہ دکھا کر پولیس کو انگشت بدنداں کر دیا۔ میری انکا مقتول لارڈ کی روح بن کر نوجوان سراغ رساں جم کے سر پر پہنچ گئی اور روح نے اصل قاتل کی نشاندہی کر دی۔ رابرٹ گرفتار ہو گیا۔ میرے اس باطنی کمال نے جم کو میرا بندۂ بے دام بنا دیا۔ وہ میرا دم بھرنے لگا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اپنے مخفی علوم جرمنی کے جنگی جنونیوں کے خلاف استعمال کر کے دنیائے انسانیت کی خدمت بجا لاؤں۔ وہ مصر تھا کہ میں برلن جاؤں اور وہاں سے ایک جرمن سائنس داں کو اغوا کر کے لندن پہنچا دوں۔ یہ کام کرشمہ کار انکا کے لیے بچوں کا کھیل تھا پھر بھی میں اس کھیڑے میں ہرگز نہ پڑتا لیکن جم نے اپنی ایک ساتھی جین کو میری ہم سفری کے لیے منتخب کر کے مجھے برلن جانے پر مجبور کر دیا۔ جین گلستانِ افرنگ کا ایک تر و تازہ گلاب تھی۔ رہ رہ کر میرے دل میں اُسے فتح کرنے کی ہوک اُٹھتی تھی چنانچہ جین، انکا اور میں برلن پہنچ گئے اور جب جین کی توقع کے بالکل خلاف انکا نے صرف چند گھنٹوں میں گوہرِ مقصود حاصل کر لیا تو حیران و معترف جین بے اختیار میری آغوش میں آ سمائی۔ برلن میں جین کے ساتھ میں نے اپنی زندگی کے انتہائی سنہرے دن گزارے اور سیر ہو کر لندن آ گیا۔ اتفاق سے لندن کے کلب میں مجھے ایک اور شگفتہ لڑکی ملی۔ اُس کا نام ارما تھا۔ ارما کے ساتھ میں نے دو حسین راتیں بسر کیں۔ ایک روز جم، جین ۔۔۔ اور سارا کے ساتھ مجھے ایک شعبدہ گاہ میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ترکی کے دو چینی جادوگر اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ میں نے تفننِ طبع کے لیے انھیں چیلنج کر دیا۔ ان بے چاروں نے نادانستگی میں میرا چیلنج قبول کر لیا۔ انکا سرگرمِ عمل ہو گئی۔ جادوگروں کو بھرے مجمع میں میرے ہاتھوں ذلیل ہونا پڑا۔ اُن کی ایک ساتھی تمارا نے میرے ساتھ شب بسری کر کے مجھے میری فتح کا خراج ادا کیا۔

لندن کا ایک جاگیردار ایڈورڈ بھی سارا کا طلب گار تھا۔ اُس نے جوشِ رقابت میں میرے پیچھے چھ آدمی چھوڑ دیے۔ یہ خاصے تندرست لوگ تھے۔ انکا کو یک نہ شد چھ تندرست انسانوں کا خون پی کر ایک مدت بعد بے انتہا فرحت حاصل ہوئی۔ چند روز بعد ایڈورڈ کو انکا کے طلسم میں پھنس کر خودکشی کرنی پڑی۔ ان ہنگاموں نے مجھے لندن میں جی بھر کے نہیں ٹھہرنے دیا اور میں اپنے خاندان، جم، جین، تمارا اور سارا سے رخصت ہو کر جہاز میں سوار ہو گیا۔ چلتے وقت میں نے بے سہارا سارا کا ہاتھ جم کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ سفر شروع ہو گیا مگر اس سے پہلے کہ ہم ہندوستان کی حدود میں داخل ہوتے، ہمارا جہاز شدید خطرے سے دوچار ہو گیا۔ اچانک میں نے ایک خالی نشست پر کلپنا کو بیٹھے دیکھا۔ اُس نے یہ انکشاف کیا کہ بدری نرائن کے بیروں نے جہاز کے گرد گھیرا ڈال لیا ہے تاکہ میں ہندوستان پہنچنے سے پہلے ہی لقمۂ اجل بن جاؤں۔ میں سراسیمہ ہو گیا۔ انکا اور کلپنا دفعِ بلا کے لیے میری نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ آخر موت و زیست کی ایک طویل کشمکش کے بعد جہاز تہران ایئرپورٹ پر اتار لیا گیا۔ تین بدھ بھکشو بھی ہمارے ساتھ سفر کر رہے تھے جن میں ایک بھکشو کا نام کرپالا تھا۔ اُس نے مجھ سے نہایت مہربانی کا برتاؤ کیا اور اپنے تحیر خیز کشف کے ذریعے میرے حالات معلوم کر کے مجھے بتایا کہ میرے لیے ہندوستان جانا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ اُس نے مجھے اپنے ساتھ تبت چلنے کی دعوت دی مگر بدری نرائن بھوت کی طرح میرے سر پر سوار تھا۔ میں اُسے جلد از جلد موت کے گھاٹ اتار دینا چاہتا تھا اس لیے چوتھے روز تہران سے روانہ ہو کر ممبئی پہنچ گیا۔ اس عرصے میں میرا مربی سادھو جگدیا انتقال کر چکا تھا۔ میرا دل ٹوٹ گیا۔ بدری نرائن نے ہندوستان بھر کے پنڈتوں اور پجاریوں سے ساز باز کر کے میرے لیے قدم قدم پر جال بچھا دیے تھے۔ کلدیپ اپنے استھان پر کسی لمبے جاپ میں مصروف تھی اور میرے لیے وہاں تک پہنچنے کے تمام راستے مسدود تھے۔ ہندوستان میں کوئی جگہ محفوظ نہیں تھی۔ میں گفتنی و ناگفتنی حادثات سے دوچار ہوتا ہوا ایک قافلے کے ساتھ میلوں پیدل سفر کر کے تبت چلا گیا۔ کرپالا نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنے ایک ہم عمر بھکشو نندا کے حوالے کر دیا۔ نندا نے مجھ پر زبردست محنت کی۔ اُس نے مجھ سے مختلف طویل، صبر آزما اور پُرمشقت ... کرا کر میری مخفی صلاحیتیں بیدار کر دیں۔ میں دنیوی آلائشوں سے الگ ہو کر برسوں اُس کے ساتھ رہا۔ اس عرصے میں اُس نے مجھے انتہائی بے نیاز اور طاقت ور شخص بنا دیا۔ جب میں فارغ التحصیل ہو گیا تو اپنے پیشوا نندا کے حکم پر مجھے ایک دل ہلا دینے والی خدمت انجام دینی پڑی۔ اُس کے شدید اور بے تابانہ اصرار پر میں نے ایک نوکیلے پتھر سے اُس کا سر پھاڑ کر اُسے قیدِ حیات سے آزاد کر دیا اور اُس کی ہدایت کے مطابق اُس کے خون سے غسل کیا۔ اس طرح وہ تمام شکتیاں مجھ میں منتقل ہو گئیں جو اُس مردِ کامل کی کل زندگی کا نچوڑ تھیں۔

میں ہندوستان واپس آ گیا۔ اب میں ایک ناقابلِ تسخیر شخص تھا لیکن مجھ میں صلح جوئی اور عفو و درگزر کی صفات پیدا ہو گئی تھیں جن کے سبب میں نے اپنے بدترین دشمن بدری نرائن کو بھی معاف کر دیا تھا مگر بدری نرائن بدستور میرے خون کا پیاسا تھا۔ لکھنؤ میں اُس کے گرگے پنڈت ترمبن داس نے ایک بے بنیاد الزام کے تحت مجھے تھانے پہنچوا دیا۔ مجبوراً مجھے ترمبن داس کو گونگا بنانا پڑا۔ پولیس خوف زدہ ہو کر میرے راستے سے ہٹ گئی۔ لکھنؤ سے میں سیدھا کلدیپ کے استھان پہنچا۔ بدری نرائن کے متعین کردہ دو سادھوؤں نے استھان کے گرد حصار کھینچ رکھا تھا۔ میں اُن سے اُلجھنا نہیں چاہتا تھا مگر وہ مرنے پر تلے ہوئے تھے۔ انھوں نے ایک جادوئی عمل سے مجھے روکنے کی کوشش کی۔ میں نے اُن کا عمل انھی کی طرف لوٹا دیا۔ وہ دلخراش چیخوں کے ساتھ تڑپ کر موت کے منہ میں جا پڑے۔ کلدیپ اب تک جاپ میں مصروف تھی۔ ترزین نے میری بے حد خدمت کی۔ کچھ روز وہاں رہنے کے بعد میں مستقبل میں قعود و قیام کے بندوبست کے لیے ممبئی آ گیا۔ دشمنوں نے یہاں بھی میرے پیچھے پولیس لگا دی۔ ناہید نامی ایک اجنبی لڑکی نے اسلامی اخوت کے پیشِ نظر ایک روز مجھے مطلع کیا کہ آج رات میرے ہوٹل پر چھاپا پڑنے والا ہے۔ میں چوکنا ہو گیا۔ میری ہمدردی کے جرم میں ناہید کو ایک پنڈت گوپال داس نے زنجیروں سے جکڑ کر اُس پر انسانیت سوز مظالم ڈھانے شروع کر دیے۔ مجھے بروقت اطلاع ہو گئی۔ میں فوراً پہنچا۔ میں نے تمام گوپال داس کو غیر معمولی بے دردی سے ہلاک کر کے ناہید کو موت کے منہ سے نکال لیا۔ وہ بُری طرح زخمی تھی۔ میں اُسے پشت پر لاد کر باہر نکلا تو بدری نرائن اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ میرا راستہ روکے کھڑا تھا۔ اُن کے چہروں پر شقاوت اور رعونت کی پھٹکار برس رہی تھی۔ میں چٹان کی طرح جم گیا۔ انھوں نے مجھے ٹھکانے لگانے کی ہر ممکن کوشش کر لی لیکن ناکام رہے۔ اُلٹا انھی کا ایک آدمی جہنم رسید ہو گیا۔ بدری نرائن اور اُس کے ایک ساتھی بلو برکو جان بچا کر بھاگنا پڑا۔ پھر ممبئی کے ایک مشہور ڈاکٹر سکسینہ سے میں نے ناہید کا باقاعدہ علاج کروایا۔ ناہید ڈاکٹر کے گھر پر رہتی تھی اور میں ڈاکٹر کی خوبصورت لڑکی پریم کی معیت میں وقت گزارتا تھا۔ پریم میرے شب و روز کے معمولات اور انکا کی مشغولیتوں سے بے حد متاثر تھی۔ ناہید کا اصل نام جمیلہ تھا۔ اُسے ایک بے وفا ہندو لڑکا دکن سے ورغلا کر ممبئی لے آیا تھا۔ جب وہ صحت یاب ہو گئی تو میں نے اُسے گلبرگہ میں اُس کے باپ رکن الدین کے گھر پہنچا دیا۔ دل شکستہ ماں باپ نے سب کچھ بھول کر بیٹی کو کلیجے سے لگا لیا۔ جمیلہ کی چھوٹی بہن طلعت کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ رکن الدین نے مجھے دکن کے ایک قلندر سید سے ملوایا۔ سید ایک پہنچا ہوا بزرگ تھا۔ وہ چند بے ربط جملوں میں مجھے فقر و طریقت کے بیش بہا نکات سے نواز کر چلا گیا۔ اُس نے مجھے بہت متاثر کیا۔ ایک دن اتفاقاً میں گلبرگہ کے ایک مندر میں جا پھنسا۔ مندر کے پجاری آنند لال نے مجھے پہچان کر مجھ پر وار کرنا چاہا لیکن اُسے اپنے قدموں میں گرانے کے لیے مجھے زیادہ جدوجہد نہیں کرنی پڑی۔ میں نے اُسے زندہ چھوڑ دیا۔ وہ میرا گرویدہ ہو گیا۔ گلبرگہ میں سکون کے چند دن ہی گزرے تھے کہ ممبئی پولیس کی درخواست پر نظام شاہی پولیس مجھے اور جمیلہ کو گرفتار کرنے پہنچ گئی۔ رکن الدین کے گھر خون کا ڈراما کھیلنا مناسب نہیں تھا اس لیے میں نے جمیلہ کو پولیس کی نظروں سے اوجھل کر کے خود کو برضا و رغبت گرفتاری کے لیے پیش کر دیا۔ مجھے ہتھکڑیاں پہنا دی گئیں۔ پولیس کی جیپ مجھے لے کر تھوڑی ہی دور گئی ہو گی کہ ایک سڑک پر مجھے سید مجذوب نظر آیا۔ میں نے چلا کر اُس سے جمیلہ کے تحفظ کی استدعا کی اور تن بہ تقدیر ہو کر بیٹھ گیا۔ راستے میں نوجوان پولیس انسپکٹر سید غوث نے مسلمان ہونے کے ناتے ہمدردانہ لہجے میں مجھ سے میری صداقت پوچھی۔ مجھے اُس کی آنکھوں میں خلوص کی چمک نظر آئی اس لیے میں نے اپنی خوں چکاں داستان کے کچھ باب جستہ جستہ اُسے سنا دیے۔ وہ ششدر رہ گیا۔ اُس نے آب دیدہ ہو کر کہا ”میں مقدمے میں تمہاری مدد کرنے کے لیے ممبئی پہنچوں گا۔“ مجھے ہنسی آ گئی۔

انکا ایک خاموش تماشائی کی حیثیت رکھتی تھی۔ اُسے ہر نازک موقع پر میرے اشارے کا انتظار رہتا تھا مگر میں خون خرابے سے بچنے لگا تھا اس لیے عموماً اُسے زحمت دینے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ حیدرآباد لے جا کر مجھے ممبئی پولیس کی تحویل میں دے دیا گیا۔ ہم ممبئی روانہ ہوئے۔ ممبئی کی ہندو پولیس نے مجھے طرح طرح سے زچ کرنا چاہا۔ میں ضبط کیے رہا لیکن کب تک؟ آخر مجھے ان عاقبت نااندیشوں کو سبق دینا پڑا۔ پھر انھیں کوئی گستاخی کرنے کی جسارت نہیں ہوئی۔ چند روز بعد ممبئی کی ایک بند عدالت میں میرے مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی۔ ترمبن داس سے لے کر بلو برکو تک سبھی دشمنوں نے میرے خلاف گواہیاں دیں حالانکہ بدری نرائن ایک روز بھی کارروائی میں شریک ہونے نہیں آیا۔ یہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک عجیب و غریب مقدمہ تھا۔ عدالت میں کھلبلی مچ گئی۔ سید غوث ممبئی پہنچ چکا تھا اور میرے توسط سے پریم کے گھر مقیم تھا۔ اُس نے اور پریم نے میرے منع کرنے کے باوجود ایک قابل وکیل انوپ چندر کی خدمات حاصل کر لی تھیں۔ وکیلِ استغاثہ اور مخالف گواہوں نے ہرزہ سرائیوں کی انتہا کر دی تھی مگر انوپ چندر نے مدافعت کا حق خوب ادا کیا۔ گلبرگہ کے پنڈت آنند لال نے خلافِ توقع اچانک عدالت میں پہنچ کر میرے حق میں بیان دیا۔ انکا کی پراسرار قوتوں کا ذکر بار بار کیا گیا۔ انگریز جج نے خواہش ظاہر کی کہ اگر انکا واقعی کوئی حقیقی وجود ہے تو اُسے میرے سر پر بھیجا جائے۔ میں نے شوخی سے انکا کو جج کے سر پر بھیج دیا۔ یہ منظر قابلِ دید تھا۔ اس ہنگامہ خیز مقدمے کے فیصلے کے روز سید مجذوب نے اچانک عدالت میں پہنچ کر ہندو پنڈتوں میں ہراس پھیلا دیا۔ اُس نے بڑے مجنونانہ تحکم سے اپنی لاٹھی زمین پر مار مار کر جج سے کہا ”فیصلہ اس سے لکھ!“ اُسے دھکے دے کر باہر نکال دیا گیا۔ پھر فیصلے کا وقت آیا تو عدالت پر سناٹا طاری تھا۔ عدالت نے فیصلہ سنایا کہ ”چونکہ ملزم جمیل احمد خاں پراسرار انکا کے زیرِ اثر تھا اس لیے جو کچھ بھی ہوا اُس کی ذمے داری ملزم پر عائد نہیں ہوتی۔ اُسے باعزت بری کیا جاتا ہے۔“ مخالفین کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ سید غوث، پریم اور انوپ چندر کے چہرے گلاب ہو گئے۔ انکا ناچنے لگی۔ پھر ابھی حوالات اور مقدمے کی کسل مندی بھی دور نہیں ہوئی تھی کہ غریب آنند لال کو میری حمایت کے جرم میں متعصب پنڈتوں نے قید کر دیا اور انکا کی اطلاع کے مطابق اُس پر سفاکانہ مظالم ڈھانے لگے۔ میں اُسی وقت انکا کو پریم اور سید غوث کے پاس چھوڑ کر کالی کے مندر میں پہنچا۔ وہاں پہنچ کر میں آنند لال کی مدد کرنے کے بجائے خود پھنس گیا۔ مجھے دھوکے سے مندر کے تاریک اور متعفن تہ خانے میں دھکیل دیا گیا۔ میں نے رہائی کے لیے اپنی شکتیاں آزمانے کی کوشش کی مگر کوئی شکتی کارگر نہیں ہوئی۔ اچانک کالی کی مورتی کی آنکھوں کے خول سے ناقابلِ یقین جسامت کے خوں خوار چوہے برآمد ہوئے اور زہریلے دانتوں سے میرا جسم کترنے لگے۔ میں نے شدتِ کرب سے آنکھیں بند کر لیں۔ جو سزا مجھے عدالت نہیں دے سکی تھی وہ دشمنوں نے دے دی تھی۔ بے بسی کی عبرت ناک موت منہ کھولے میرے سامنے کھڑی تھی۔

چوہوں نے مجھے مار ڈالنے کے لیے انتہائی ہولناک اور ناقابلِ برداشت اذیتیں پہنچائیں مگر مجھے مارنا چوہوں کے بس کی بات نہیں تھی۔ میں نے مراقبے کیے، مخفی علوم آزمائے، ارتکاز کی مشقیں دہرائیں اور سب سے آخر میں بالکل بے سدھ ہو کر خود کو اُن کی غذا بننے کے لیے چھوڑ دیا۔ اُن کی یلغار سے میں بُری طرح لہو لہان ہو گیا۔ پھر وہ مجھے بے ہوشی کے گڑھے میں دھکیل کر اپنے اپنے بلوں میں جا گھسے۔ میں اس خوفناک تہ خانے میں گیارہ ماہ تک محبوس رہا۔ آخر ایک پراسرار کرن کی ایما پر انتہائی ہیبت کذائی کے عالم میں باہر نکلا۔ گیارہ مہینے کے بے مثال ضبط و تحمل نے میری باطنی قوتوں میں حیرت انگیز اضافہ کر دیا تھا۔ باہر مندر کے پجاری ورطۂ حیرت میں غرق تھے کہ میں موت کے تہ خانے سے زندہ کیسے نکل آیا؟ ایک نیک دل پنڈت مرلی دھر نے اس تحیر خیز واقعے سے متاثر ہو کر مجھ سے ہمدردانہ سلوک کرنا چاہا مگر پجاریوں کا سرغنہ پنڈت کیلاش میرے راستے کا روڑا بن گیا۔ اُس نے ایڑی چوٹی کا زور لگا لیا کہ میں مندر سے باہر نہ جانے پاؤں مگر میں نے اُس کی خطرناک مزاحمت چٹکیوں میں اُڑا دی اور باہر آ گیا۔ اس عرصے میں بڑے بڑے واقعات رونما ہو چکے تھے۔ ہر چرن نامی ایک خبیث پنڈت نے میری اسیری سے فائدہ اُٹھا کے خصوصی جاپ کے ذریعے انکا کو حاصل کر لیا تھا۔ اُس نے طوطا چشم انکا کی مدد سے بے گناہ پریم کی دوشیزگی لوٹ لی تھی اور اُس کے باپ کی ڈسپنسری تباہ کر دی تھی۔ یہ معمولی جرم نہیں تھے۔ میرے سینے میں انتقام کا لاوا کھولنے لگا لیکن سب سے پہلے مجھے مصیبت زدہ آنند لال کی دست گیری کرنی تھی۔ آنند لال کا پتہ معلوم کرنے کے لیے مجھے ایک روز کیلاش کو دبوچ کر اُس کا چہرہ داغ دار کرنا پڑا۔ غریب آنند لال وندھیاچل کے پہاڑوں میں گھاٹیاں بھگت رہا تھا۔ میں نے ڈاکٹر سکسینہ، پریم اور سید غوث کو گلبرگے منتقل کر کے رکن الدین کی حویلی میں ٹھہرا دیا تاکہ وہ وہاں سید مجذوب کی حفاظت میں رہیں اور خود تنِ تنہا وندھیاچل کی طرف چل پڑا۔ راستے کے ایک آشرم میں مجھے آگے جانے سے روکنے کی کوشش کی گئی مگر میں نے وہاں کے بڑے پجاری پر تشدد کر کے راستہ ہموار کر لیا۔ مجھے نالکھ آشرم پہنچنا تھا۔ درمیان میں عیار انکا اپنے موجودہ آقا کے حکم پر مجھے ورغلانے کے لیے آئی مگر میں نے اُسے بُری طرح دھتکار دیا۔ آخر اسّی میل کا پیدل سفر کر کے میں نالکھ آشرم پہنچ گیا۔ یہ جگہ خوب صورت دیوداسیوں اور تارک الدنیا سادھوؤں کی ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ یہاں شنکر نامی ایک مہربان سادھو نے مجھے اپنی کٹیا میں ٹھہرا لیا اور ایک سُندر دیوداسی نے میری مہمان نوازی کی لیکن میں کسی بات سے لطف اندوز نہیں ہو سکا کیونکہ آنند لال کا کہیں پتہ نہ تھا۔ نرمی سے اُس کا سُراغ حاصل کرنا محال تھا اس لیے ایک موقع پر میں نے مجبوراً ایک حسین و جمیل داسی کو پکڑ لیا اور وحشیانہ ایذا رسانی کے ذریعے اُس سے آنند لال کا پتہ اُگلوانے کی سعی کرنے لگا۔ میں نے اُس کی نرم و نازک مرمریں کلائی گیلے کپڑے کی طرح مروڑ کر رکھ دی۔ وہ درد سے بلبلا اُٹھی۔ اُسی وقت سادھو شنکر آ دھمکا۔ اُس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ داسی کی کلائی میرے فولادی پنجے میں تھی اور میں سادھو شنکر کی شعلہ بار آنکھوں میں آنکھیں گاڑے کھڑا تھا۔

سادھو شنکر کی قہر آلود نظریں میرے لیے ناقابلِ برداشت تھیں۔ میں نے طیش میں آ کے دیوداسی پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ وہ درد و کرب سے چیخنے لگی یہاں تک کہ اُس کی روح اس اذیت سے نجات پا گئی اور نالکھ آشرم کی زمین ایک نازک اندام دوشیزہ سے محروم ہو گئی۔ اس عبرت ناک سانحے کے باوجود سادھو شنکر مجھے آنند لال کا پتہ بتانے سے گریز کرتا رہا۔ آخر مایوسی اور غصے کی شدت میں مجھے دنیا کو اُس کے وجود سے بھی پاک کرنا پڑا۔ یہ دو اموات نالکھ آشرم کی پُرسکون فضا میں ہلچل مچا دینے کے لیے کافی تھیں۔ اپنے انجام کی مجھے پروا نہ تھی۔ میرا غصہ اس قدر شدید تھا کہ سارے نالکھ آشرم کو قبرستان میں تبدیل کر سکتا تھا چاہے بعد میں کچھ بھی ہو۔ مجھے حیرت ہوئی جب سادھوؤں نے قابلِ داد ضبط و تحمل کا ثبوت دیا۔ انھوں نے مجھ سے کوئی باز پرس نہیں کی بلکہ میرے اصرار پر ایک سن رسیدہ سادھو بلرام نے اگلی پورن ماشی میں آنند لال کا پتہ بتانے کا وعدہ کر لیا۔ پھر یہاں مجھے مہمانوں کی طرح رکھا گیا اور حسین ترین دیوداسیوں نے زرخرید کنیزوں کی طرح میری خدمت کی۔ میری طاقت و عظمت کا سکہ سارے نالکھ آشرم پر بیٹھ چکا تھا۔ وہ مجھ سے کوئی دھوکا نہیں کر سکتے تھے اس لیے میں اس خوب صورت جگہ پر دیوداسیوں کے جھرمٹ میں سکون سے اگلی پورن ماشی کا انتظار کرنے لگا۔ ایک رات ناقابلِ فہم وحشت و اضطراب میں میں نے انھیں برہنہ ہونے کا حکم دیا۔ اُن کی بے بسی دیکھنے کے لائق تھی۔ ہزار شرم و حیا کے باوجود انھیں اپنے لباس اتارنے پڑے۔ میرے جذبات میں تلاطم برپا ہو گیا پھر بھی میں نے کوئی عملی قدم نہیں اُٹھایا۔ ضبطِ نفس کے اس کمال پر میں خود حیران ہوں۔ انھی میں ایک لڑکی میری دوسری بیوی مالا کی ہم نام تھی۔ مالا کے نام اور اُس کے معصوم چہرے نے اُسے مجھ سے قریب کر دیا۔ اُس نے اپنی والہانہ اطاعت شعاری سے میرے دل میں خصوصی جگہ بنا لی تھی۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میری کھوئی ہوئی مالا مل گئی ہو۔ پورن ماشی کے موقع پر بوڑھے بلرام نے مجھے آنند لال کا پتہ بتا دیا لیکن پتہ بتاتے ہی وہ لڑکھڑا کر گرا اور مر گیا۔ اُس کی لاش سادھوؤں نے خاموشی سے اُٹھا لی۔ آنند لال شیو شنکر پارک میں تھا۔ میں کسی تاخیر اور تکان کے بغیر پہاڑوں، چٹانوں اور سبزہ زاروں کو عبور کر کے وہاں جا پہنچا۔ یہ ایک ہیبت ناک جگہ تھی مگر میں ان جگہوں اور ہر قسم کے پراسرار ماحول کا عادی ہو چکا تھا۔ سب سے پہلے ایک میلے کچیلے بوڑھے شخص سے میرا سابقہ پڑا۔ اُس نے میرے راستے میں رکاوٹ کھڑی کرنے کے لیے خطرناک حملے کیے اور قہقہے لگاتا رہا۔ میں اتنا پُرجوش اور مستعد تھا کہ وہ غلیظ شخص میرا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ اُس نے اپنے سر کی جوئیں میرے کپڑوں پر ڈال دیں۔ میں پورے تحمل سے اُس کے حملوں کا جواب دیتا رہا۔ آخر زچ ہو کر اُس نے مجھے آنند لال کا ٹھکانا بتا ہی دیا۔ آنند لال تنور کے مانند دہکتی ہوئی ایک خستہ عمارت میں قید تھا۔ میں عمارت میں بے دھڑک داخل ہو کر اُسے باہر نکال لایا۔ اُس کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اُس نے جب مجھے پہچانا تو اُس کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ اُسے یقین نہیں آتا تھا کہ میں شیو شنکر پارک تک پہنچ سکتا ہوں۔ وہ گھور گھور کر مجھے دیکھتا رہا۔ واپسی میں سارے راستے وہ مجھ سے طرح طرح کے سوالات کرتا رہا اور مختصراً اپنی روداد سناتا رہا۔ نالکھ آشرم پہنچنے کے بعد میں نے مالا کو بھی ساتھ لے لیا۔ سادھوؤں نے میرے سامنے آنے کی جرأت نہیں کی۔ پھر ہم ایک دشوار سفر کر کے گلبرگے پہنچ گئے۔ بے مروت انکا نے مجھے چین کا سانس نہیں لینے دیا۔ وہ ریل کے سفر کے دوران میرے سر پر آ گئی اور اُس نے حسبِ معمول مجھے دھمکیاں دیں۔ اُس نے میری چچازاد بہنوں کو لکھنؤ سے اغوا کر کے اپنے آقا ہر چرن کی ناپاک آغوش میں جھونکنے کی دھمکی دی۔ انکا لمحوں میں کہیں سے کہیں پہنچ سکتی تھی اور یہ بعید نہیں تھا کہ ہر چرن کے اشارے پر وہ میرے لیے کوئی مصیبت کھڑی کر دے چنانچہ میں نے آنند لال اور مالا کو سید غوث اور پریم کے ساتھ رکن الدین کے ہاں چھوڑا اور ہر چرن کا قصہ ختم کرنے کے لیے مدراس کی طرف روانہ ہو گیا۔ گلبرگے میں میری ملاقات سید نامی بزرگ سے ہو گئی مگر وہ اپنی ایک جھلک دکھا کر غائب ہو گیا۔ ہر چرن مدراس میں نہیں تھا، ممبئی منتقل ہو گیا۔ اُس نے بچنے کی بہت کوشش کی لیکن جمیل احمد خاں سے اُس کا واسطہ پڑنے والا تھا۔ ممبئی کے ایک شان دار ہوٹل میں مقیم ہر چرن کو انکا کی موجودگی اور مدد کے باوجود بڑے مضحکہ خیز اور ڈرامائی حالات میں اپنی جانِ ناتواں سے ہاتھ دھونے پڑے۔ میں نے کوئی ایسا نشان ... نہیں دیا جس سے دوبارہ پولیس مجھے پریشان کر سکتی۔ ابھی میں ہوٹل سے چند قدم آگے گیا ہوں گا کہ انکا کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ڈولتی ہوئی میرے پاس آ گئی۔ میں نے اُس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ اُس نے میرے سر پر ایک ... لگا کر سرگوشی کی ”اے سنو ۔۔۔ کیا بہت ناراض ہو؟“

ٹیکسی ممبئی سینٹرل اسٹیشن کی طرف رواں تھی۔

ہر چرن کی موت نے میرے کاندھے سے ایک وزنی بوجھ اُتار دیا تھا۔ اب ہوٹل والے پولیس کو اطلاع دے رہے ہوں گے اور تھوڑی دیر میں پولیس پہنچ جاتی ہو گی۔ انکا کا ذہن پلٹ دینے کے بعد ہر چرن کی موت کا کوئی عینی شاہد باقی نہیں تھا، البتہ انکا سب کچھ جانتی تھی لیکن اس وقت وہ میرے سر پر موجود تھی۔ ایک مدت بعد وہ پھر اسی انداز اور شوخی سے وہاں دراز تھی جیسے کوئی عرصے بعد اپنے گھر آیا ہو۔ میرا سر اس کا آشیانہ تھا لیکن خود میرا کوئی آشیانہ نہیں تھا۔ میں ٹیکسی کی نشست سے سر لگائے ممبئی کے بازاروں اور شہر کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ میرا خیال تھا ہر چرن مجھ سے مقابلے کی کوشش کرے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ میں نے کسی حقیر کیڑے کی طرح اُسے مسل دیا تھا۔ پولیس کے بعد ممبئی کے مہان پنڈتوں کو خبر ہو گی کہ ہر چرن اس حالت میں مارا گیا ہے اور اس کے سر سے انکا غائب ہے اور جب انھیں معلوم ہو گا کہ یہ کام جمیل احمد خاں نے کیا ہے تو ان کا اشتعال دیدنی ہو گا۔

گو میں وہاں نہیں ہوں گا۔ پریم کی دوشیزگی کا بدل ہر چرن کی موت نہیں تھی۔ مجھے نقصان کے اس سودے کا احساس تھا۔ ”کیا سوچ رہے ہو۔“ انکا نے آہستگی سے کہا۔

میں اپنے خیالوں میں ڈوبا رہا۔ ”کیا بہت خفا ہو؟ معاف نہیں کرو گے؟“ انکا نے خوشامد کی۔

”تم کون ہو؟“ میں نے پوچھا۔ ”میرا سر چھوڑ دو۔“

”تمہارا سر چھوڑ دوں تو کہاں جاؤں؟ تم نے ہر چرن کو مار دیا ہے اب تمہارے سوا میرا کون ہے؟“ انکا نے شوخی سے کہا۔

”کوئی اور سر تلاش کر لو۔ کسی نئے پنڈت کے سر پر جاؤ۔ انھیں تمہاری بڑی ضرورت ہے۔“ میں نے اکتاہٹ سے کہا۔

”جمیل!“ انکا بسور کر بولی۔ ”تم سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بن رہے ہو۔ ہر چرن کی مدد کرنا میرا فرض تھا کیوں کہ اُس وقت وہ میرا آقا تھا۔“

”اسی لیے میں نے تبت میں نندا کے استھان پر سردی گرمی کا خیال

کیے بغیر اپنی زندگی کے بہترین دن گزار دیے تھے۔ مجھے اب تمھاری ضرورت نہیں ہے، میں تو ہرچرن سے پریم کا انتقام لینے آیا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے، تم میری وجہ سے نہیں آئے تھے مگر مجھے دیکھو، میں سیدھی تمھارے پاس آئی ہوں۔" انکا کے لہجے میں حسرت شامل ہو گئی تھی۔

"تم اس شخص کے پاس آئی ہو، جسے تم نے قدم قدم پر نقصان پہنچانے کی کوشش کی، تم نے پریم کو نہیں چھوڑا، تم نے مجھے بہکانے کی کوشش کی، تم نے سید غوث سے مجھ پر حملہ کرایا۔ یہ سب تمھاری وجہ سے ہوا ہے، میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ میں برسوں سے مارا مارا پھر رہا ہوں۔ یہ سب کس کی وجہ سے ہوا ہے؟" میں نے غصے سے کہا۔ "اور تم شوخیاں کر رہی ہو؟"

"لیکن اس میں میری خطا کیا ہے؟" انکا رقت بھری آواز میں بولی۔ "جب میں تمھارے پاس تھی تو میں نے تمھارے کسی حکم کی تعمیل سے کبھی انکار کیا؟"

"لیکن جب تم چلی گئیں تو تم نے اپنے سابقہ احسانات کے بدلے گِن کے لیے، تم بہت خطرناک عورت ہو۔ آدمی تم سے دُور دُور رہے تو بہتر ہے۔ اسے اس اذیت سے تو نجات مل جاتی ہے کہ جس نے اس کے ساتھ ظلم کیا ہے اس سے ماضی میں کوئی آشنائی تھی۔"

"تمھاری تمام باتیں درست ہیں اور میرے پاس ان کا کوئی جواب بھی نہیں ہے سوائے اس کے کہ میں تمھارے سر سے چمٹی رہوں۔ اگر تم مجھے کوئی حکم دینا نہیں چاہتے اور تمھیں میری ضرورت نہیں رہی تو ٹھیک ہے میں تمھارے کسی معاملے میں دخل نہیں دوں گی، خاموش بیٹھی رہوں گی لیکن کہیں اور بھٹکنے کے بجائے میں تمھارے سر پر رہنا چاہتی ہوں۔ مجھے اتنی اجازت تو دو۔"

"ناوفنتیکا کوئی اور پنڈت تمھیں حاصل کرنے کی کوشش کرے تو میں تو ایک کھلونا ہو گیا۔" میں نے جھلا کر کہا۔

"اب شاید کوئی اور پنڈت عرصے تک یہ حماقت نہ کرے لیکن آنندلال، آنندلال تو تمھارا دوست ہے۔" انکا کے لبوں پر دوبارہ مسکراہٹ تیرنے لگی۔

"تم کیا کہنا چاہتی ہو؟" میں نے چونک کر پوچھا۔ "کیا آنندلال؟"

"ہاں وہ بے چارہ گلبرگہ میں میرے حصول کے لیے جاپ کرنے بیٹھ گیا ہے۔" انکا نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "جب تم گلبرگہ سے چلے تھے تو اس نے سوچا تھا اپنے دوست کو انکا کا تحفہ کیوں نہ پیش کیا جائے؟ اس نے خیال کیا ہو گا اگر ہرچرن تمھارے ہاتھ نہ پڑا تو یوں ہی اس کے پیچھے بھاگتے رہو گے، اس لیے وہ خود جاپ کرنے بیٹھ گیا۔ اب میں اتالیس دن تک تمھارے پاس رہوں گی۔ پھر آنندلال کے سر پر چلی جاؤں گی اور وہ مجھے طشتری میں سجا کر تمھاری خدمت میں پیش کرے گا۔"

"اوہ۔ وہ بیوقوف پنڈت۔ آنندلال کو معلوم نہیں تھا کہ ہرچرن مجھ سے بچ کر کہاں جائے گا؟ اس نے یہ حماقت کیوں کی؟"

"وہ تمھیں زحمتوں سے بچانا چاہتا ہے۔ اس کے ارادے برے نہیں ہیں۔ وہ تمھارا دوست ہے۔"

"مگر میں اس کا تحفہ واپس کرنے اور ٹھکرانے کی قوت بھی رکھتا ہوں۔" میں نے نفرت سے کہا۔

"بہت ناراض ہو چکے مجھ پر۔ اب کوئی اچھی بات کرو۔ تم سے خوبصورت باتیں کیے ہوئے عرصہ گزر گیا۔"

"انکا! تم سے بات کرنے کو جی نہیں چاہتا۔"

"کیا کوئی صورت صلح صفائی کی نہیں ہو سکتی؟" انکا نے اداسی سے کہا۔

"بس یہی کہ تم میرے سر سے دفع ہو جاؤ۔"

انکا خاموشی سے میرا سر کریدنے لگی۔ آنندلال کی خبر نے مجھے ایک اور تشویش سے دوچار کر دیا تھا۔ ٹیکسی اسٹیشن کے احاطے میں پہنچ کر رکی۔ میں نے کرایہ ادا کیا اور پلیٹ فارم پر آ گیا لیکن ابھی تک میں کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکا تھا، اب صرف بدری نرائن رہ جاتا تھا جس کا ناپاک وجود جلد از جلد ختم کر کے ہی اطمینان کے موسم کی توقع کی جا سکتی تھی۔ کلدیپ ابھی تک جاپ میں مصروف تھی۔ میں چاہتا تھا کہ تزئین کو پریتم لال کے استھان سے لا کر رکن الدّین کی حویلی میں منتقل کر دوں کیوں کہ وہ کلدیپ کے طویل جاپ سے شدید تنہائی اور مایوسی محسوس کر رہی ہو گی۔ اُدھر گلبرگہ میں رکن الدّین کی حویلی میں، پریم، ناہید، مالا اور سیّد غوث میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ انکا بدستور میرے سر پر موجود تھی اور اس کی نظریں میرے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں۔ ایک زمانہ تھا کہ ان نظروں کی چبھن مجھے بوکھلا دیا کرتی تھی لیکن اب میں ان باتوں سے بے نیاز ہو چکا تھا۔

"کیا میں کوئی بات کر سکتی ہوں؟" انکا نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"تم اپنے آپ کو پریشان کر رہی ہو؟"

"میں کلدیپ اور تزئین کے بارے میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔"

"تمھیں ان دونوں سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔"

"ارے تم تو پتھر بن گئے ہو۔"

"تمھاری موجودگی میرے اہم فیصلوں میں مخل ہو رہی ہے۔"

"تم کیا فیصلے کر رہے ہو؟" انکا نے حجّت کی۔ "کچھ ہمیں بھی بتاؤ، ہمیں بھی اپنی پریشانیوں میں شامل کر لو۔ ہم تمھارے دشمن نہیں ہیں۔"

"ہونہہ۔" میں نے مسکرا کے کہا۔ "اب مجھے سہاروں پر اعتماد نہیں رہا۔ یہاں کوئی کسی کا دوست نہیں۔"

پلیٹ فارم پر لوگوں کا ہجوم تھا۔ انکا بے بسی سے تلملانے لگی۔ میں کبھی کبھی عالمِ تصوّر میں نظر اٹھا کر دیکھ لیا کرتا تھا، اس کی کیفیت مجھ سے چھپی نہیں تھی۔ میں اپنے خیالوں میں محو تھا۔ انکا میرے سر پر پہلو بدل رہی تھی۔ اس نے مجھے منانے کی بہت کوشش کی۔ میں تھوڑی دیر تک چہل قدمی کرتا ہوا ایک ارادے سے ٹکٹ گھر کی جانب بڑھا اور میں نے ٹکٹ بابو سے سورت کا ایک ٹکٹ مانگا۔

"جمیل! کیا واقعی تم اتنے غصّے میں ہو کہ تمھاری نظروں نے دُور تک دیکھنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ ہرچرن نے تم سے بدری نرائن کے بارے میں ٹھیک کہا تھا لیکن اب وہ سورت میں نہیں ہے، ہرچرن کا انجام معلوم ہو جانے کے بعد وہ سورت سے چل پڑا ہے، جنوب کی طرف۔"

"میں تمھاری دخل اندازی پسند نہیں کرتا۔"

"میری بات مان لو۔ تم کہاں تک بدری نرائن کا تعاقب کرو گے؟ وہ بھاگتا رہے گا۔ پہلے تمھیں کلدیپ اور تزئین کا خیال کرنا چاہیے۔ کلدیپ بدری نرائن کے سلسلے میں زیادہ سودمند ثابت ہو گی۔ کلدیپ کے استھان پر پنڈت پجاری دھونی رمائے بیٹھے ہیں، انھیں یقین ہے کہ کسی نہ کسی دن تم وہاں ضرور پہنچو گے۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ تم بہت تھک چکے ہو۔ تھکن تمھارے چہرے سے عیاں ہے۔ جمیل احمد خاں! میرے پیارے، بدری نرائن فرار ہے تو اسے فرار ہی رہنے دو۔ یہ کتنے لطف کی بات ہے کہ اب وہ تم سے دامن بچاتا پھر رہا ہے۔ کبھی کسی مندر میں، کبھی کسی پہاڑ پر، کبھی کسی مہان پنڈت کے استھان میں۔ اس وقت سے فائدہ اٹھا کر تم تزئین، ناہید اور کلدیپ کا ٹھکانا پیدا کر لو۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟"

"نہیں آپ بہت صحیح کہہ رہی ہیں۔ آپ اپنے چہیتے بدری نرائن کو معاف کرنے کا مشورہ دے رہی ہیں۔" میں نے طنزیہ کہا۔ "آپ کا تو کوئی جواب ہی نہیں۔ اب اپنا منہ بند رکھیے اور شرافت سے اُتر جائیے۔ مجھے آپ کا کوئی مشورہ قبول نہیں۔"

"کیا میں اتنی بُری لگتی ہوں؟ اب میرے لیے تمھارے دل میں کوئی جگہ نہیں رہی؟" انکا میرے تلخ رویّے سے روہانسی ہو گئی۔

"تم تکرار کر رہی ہو اور خواہ مخواہ بات کو طول دے رہی ہو۔"

"مجھے شبہ ہے کہ تم یہ باتیں دل سے نہیں کہہ رہے ہو۔"

"تم تو دلوں کا حال جانتی ہو۔"

"جانتی تو ہوں۔ پر تمھارے دل کا یقین نہیں آتا۔"

"میرا دل بہت صاف ہے۔ پہلے کی طرح گندا نہیں ہے۔"

"تو کیا میں چلی جاؤں؟" انکا نے تلخی سے کہا۔

"میں تمھارا یہ آخری احسان ہمیشہ یاد رکھوں گا۔"

"ٹھیک ہے جمیل!" انکا سرد آہ بھر کر بولی۔ "ٹھیک ہے تم واقعی مجھ سے اُکتا چکے ہو، میں جا رہی ہوں۔" میں نے جواب نہیں دیا۔ انکا کچھ دیر تک گومگو کی کیفیت میں بیٹھی رہی، پھر بہت آہستگی اور خاموشی کے ساتھ میرے سر سے رینگ گئی۔

وہ چلی گئی اور میں نے اُسے نہیں روکا۔ سورت جانے والی گاڑی تیار کھڑی تھی میں ڈبّے میں بیٹھ گیا۔ مجھے بیٹھے ہوئے ابھی چند منٹ ہوتے ہوں گے کہ انکا کا چہرہ میری نظروں کے سامنے گھوم گیا۔ میں نے اسے دھتکار دیا تھا۔ انکا جا چکی تھی اور میں سوچ رہا تھا میں نے اُسے کیوں جانے دیا؟ وہ اپنے آقا ہرچرن کے اشاروں پر ناچنے کے لیے مجبور تھی۔ وہ جب بھی آزاد ہوتی تھی، کسی جاپ کے بغیر میرے سر پر آ جاتی تھی۔ بدری نرائن کے بارے میں اس کی معلومات یقیناً درست ہوں گی۔ اب میرا سورت جانا بے کار ہے۔ تو کیا میں کلدیپ کے ٹھکانے پر جاؤں اور تزئین کو وہاں سے لے آؤں؟ لیکن اس سے پہلے مجھے گلبرگہ جانا چاہیے جہاں رکن الدّین کی حویلی میں ٹھہرے ہوئے میرے ہی خواہ کشمکش سے دوچار ہوں گے، میں ڈبّے سے اُٹھ آیا اور میں نے ٹکٹ گھر جا کر اپنا ٹکٹ بدلوا لیا۔ ٹکٹ بابو نے میری طرف حیرت سے دیکھا لیکن وہ میرا حلیہ دیکھ کر مطمئن ہو گیا، میرے بال بڑھے ہوئے تھے اور جسم پر سادہ سا لباس تھا۔ مجھے ٹکٹ دے کر ٹکٹ بابو کھڑکی بند کر کے باہر آ گیا، اور میرے قدم چھوتے ہوئے بولا۔ "مہاراج! بہت پریشان ہوں جی! کوئی اُپائے کر دیجیے۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا، وہ ایک پستہ قد منحنی سا، غریب کلرک تھا۔

"کیا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"بس جی آپ کچھ کر دیجیے۔"

"تھک گیا ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں جی۔" وہ زمین پر نظریں گاڑ کے بولا اور اس کے آنسو مجھے اپنے پیروں پر محسوس ہوئے۔

"اُٹھ جا۔" میں نے اُسے کاندھا پکڑ کے اُٹھایا، وہ بجلی کی طرح چمک کے اُٹھا۔ میں نے کہا۔ "کچھ دن اور انتظار کر اور اپنی بہن کی شادی، جہاں وہ چاہتی ہے کر دے۔"

"کیا مہاراج؟" اس کے الفاظ حلق میں اٹک گئے۔

"جو میں کہتا ہوں وہ کر۔ میں تیرا خیال رکھوں گا۔ جا اب اپنا کام کر۔ کتنے لوگ کھڑکی پر کھڑے ہیں۔"

وہ سہما ہوا اٹھا اور ٹکٹ گھر میں داخل ہو گیا۔ وہ بہت تھکا ہوا تھا لیکن مجھ سے زیادہ نہیں۔ اس نے تو مجھے اپنے زخم دکھا دیے مگر میں اپنے زخم کسے دکھاتا؟ اس سارے جہان میں صرف ایک چہرہ نظر آتا تھا اور وہ میری کلدیپ کا چہرہ تھا۔ گلبرگہ جاتے وقت مجھے سکون سے ارتکاز کی مشقیں کرنے کا موقع مل گیا۔ اوپر سیٹ پر لیٹ کر میں نے اپنے آپ کو تفکرات سے آزاد کر کے کچھ

وقت عدم میں گزار دیا۔ مراقبہ عدم ہی کی ایک حالت ہے۔ جہاں سے واپس آکر توانائیاں بڑھی ہوئی معلوم ہوتی ہیں، مراقبہ، برداشت کا سب سے مفید عمل ہے۔ وہ زندگی میں موت کا ذائقہ چکھنے کا ایک اعلا ذریعہ ہے۔ موت جو عام انسانوں کی نظر میں زندگی کی بیخ کنی ہے اور جو ذہنِ رسا کے لیے زندگی کی ایک دوسری کیفیت سمجھی جاتی ہے موت ایک مکمّل انقطاع ہے لیکن خاتمہ نہیں، مراقبہ زندگی سے ایک عارضی انقطاع ہے مگر یہ باتیں چھوڑیے۔ میں اپنے عجیب و غریب واقعات کا سلسلہ ملاتا ہوں۔

گلبرگہ میں رکن الدّین کی حویلی میں اس وقت، سیّد غوث، مالا، پریم اور اس کا باپ موجود تھے، اس گھر میں اتنے افراد کی موجودگی سے بڑی رونق ہو گئی تھی۔ میں جب وہاں پہنچا تو عید سی ہو گئی۔ رکن الدّین اور ناہید نے میری خاطر مدارات کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ رکن الدّین ایک بلند حوصلہ اور عالی ظرف شخص تھا۔ دکن کے لوگ مہمان داری میں بہت آگے رہتے ہیں اس بار میں بہت جلد آ گیا تھا، سیّد غوث بے چینی سے حالات جاننے پر مُصر تھا، جب میں نے پریم کے سامنے ہر حرِن کی موت کا واقعہ اُسے سُنایا تو وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ ہر حرِن کی موت سے پریم کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے خوشیوں کے چراغ جلے، پھر ٹمٹما کر بجھ گئے۔ میں نے یہ ذکر ہی موقوف کر دیا۔ ہر حرِن کے ذکر نے اس کے دل میں اس کی بربادی کا احساس تازہ کر دیا تھا۔ میں نے گلبرگہ آتے وقت ریل میں چند فیصلے کر لیے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ ہر حرِن کی موت اور آنند لال کی شیو شنکر پارٹ سے واپسی کے بعد اب ہندو پنڈتوں پجاریوں کے رویّے میں فرق آ جانا چاہیے۔ پھر میں گلبرگہ میں حضرت گیسو دراز کے علاقے میں موجود تھا۔ جہاں مجھ پر سیّد مجذوب کی نگاہِ کرم بھی تھی۔ سیّد مجذوب کا اندازِ قلندری یہ تھا کہ وہ جب چاہتا تھا مجھ سے خود مل لیتا تھا۔ مجھے اس کی تلاش میں کبھی کامیابی نصیب نہیں ہوئی تھی اس لیے اس بار گلبرگہ کی گلیوں میں، میں نے اُسے تلاش نہیں کیا۔ دوسرے روز گھر کے ہنگاموں سے فارغ ہو کے میں سیّد غوث کے ہمراہ گلبرگہ کے سنہرے علاقے سے دور آنند لال کی کٹیا تک گیا یہیں آنند لال سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ آنند لال کو منڈل میں بیٹھ کے الکا کے حصُول کا سخت جاپ کرتے دیکھ کر مجھے بڑا تاسف ہوا۔ میں اسے منڈل سے باہر نہیں نکال سکتا تھا۔ وہ جس الکا کے لیے جاپ کر رہا تھا، اُسے میں نے خود دھتکار کر جُدا کر دیا تھا۔ آنند لال کے جاپ میں ۲۷ روز رہ گئے تھے اور یہ ۲۷ روز اسے ہر حالت میں منڈل میں بیٹھ کر گزارنے تھے اور کامیاب واپس آنا تھا، اگر اس عرصے میں وہ اپنے جاپ میں ناکام ہو جاتا یا کوئی باہر کی طاقت اس کا استغراق توڑنے میں کامیاب ہو جاتی تو آنند لال بڑی عبرت ناک موت مارا جاتا۔ مجھے اس بات کا بھی خیال رکھنا تھا کہ کوئی پنڈت آنند لال اور مجھ سے انتقام لینے کے لیے منڈل میں رخنہ انداز ہونے کی کوشش نہ کرے۔ آنند لال نے اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالنے میں عجلت کی۔ اس سے کوئی بات نہیں ہو سکتی تھی۔ میں اور سیّد غوث اسے دیکھ کر چلے آتے۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد سب لوگ بیٹھک میں اکٹھے ہوئے تو بڑی دلچسپ باتیں چل نکلیں، رکن الدّین کی بیوی اور ناہید کی چھوٹی بہن۔ ناہید (مجھے اس کا نام ناہید ہی یاد آتا تھا حالانکہ اس کا اصل نام جمیلہ تھا چنانچہ جہاں میں ناہید کہوں تو جمیلہ، جمیلہ کہوں تو ناہید سمجھ لیا جائے) پریم، مالا، ڈاکٹر سکسینہ، سیّد غوث، اور رکن الدّین میں درمیان میں بیٹھا ہوا تھا۔ ہم سب اِدھر اُدھر کی باتوں میں مصروف تھے، اس بھرے گھر میں مجھے کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہوتی تھی، رکن الدّین کی بیوی گلوریاں بنا رہی تھی۔ یہاں سب تھے۔ میں نے ایک بڑا خاندان ترتیب دیا تھا، میں نے پریم کو دیکھا اس کے چہرے کی شادابی واپس آ گئی تھی۔ اب وہ ملیح صبیح خوبصورت چہرے کی لڑکی تھی جسے میں نے پہلی بار دیکھا تھا، پھر میری نگاہ ناہید پر گئی۔ ناہید بھی اپنے گھر میں آ کر صحت مند اور دلکش ہو گئی تھی، یوں بھی وہ کم حسین نہیں تھی۔ ناہید کے ساتھ مالا بیٹھی ہوئی تھی۔ مالا نے چھوٹی موری کا پاجامہ اور ڈھیلا کرتا پہن رکھا تھا، وہ بہت کم بات کر رہی تھی۔ اس لیے کہ اس گھر میں آئے ہوئے اُسے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ لباس کی تبدیلی نے مالا کے حُسن میں عجیب نکھار پیدا کر دیا تھا، یہ تین نوجوان حسین لڑکیاں میرے سامنے تھیں، میں نے ان سے خود کو وابستہ کر کے ایک بڑی ذمّے داری اپنے سر لے لی تھی۔ یہ کلدیپ اور ترتین نہیں تھیں مگر انھی کی طرح مجھے عزیز تھیں۔ میری مصروفیت اور شب و روز کا کوئی بھروسا نہیں تھا۔ یہ لڑکیاں کب تک اچھے دنوں کا انتظار کرتی رہیں گی؟ نالکھ آشرم سے مالا کو ساتھ لا کے شاید میں نے غلطی کی تھی۔ میں نے ایک اور لڑکی کو اپنی الجھنوں میں شامل کر لیا تھا گلبرگہ آئے ہوئے ایک دن گزر چکا تھا لیکن ابھی تک مالا سے مجھے تنہائی میں بات کرنے کا کوئی موقع نہیں ملا تھا۔ میں اس کی نظریں پہچانتا تھا اور اس لیے مجھے مالا کی موجودگی سے اُلجھن ہو رہی تھی، جب یہ سب لوگ خوش فعلیوں میں مصروف تھے تو میں نے کہا۔

”ذرا میری سنو، میرے عزیزو! میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ تم سب کو یہاں دیکھ کر مجھے جو مسرّت ہو رہی ہے وہ بیان سے باہر ہے یہ ایک بڑا سا خاندان نظر آتا ہے۔ یہ چمکتے ہوئے مسکراتے ہوتے پُر اُمید چہرے میرا خون بڑھا رہے ہیں لیکن اس موقع پر مجھے ترتین اور کلدیپ کی کمی محسوس ہوتی ہے، اب تم سے کچھ چھپانا بے سود ہے، میری زندگی کے بعض عجیب واقعات تمہارے علم میں آ گئے ہیں۔ کلدیپ میسور کی پہاڑیوں پر موجود ہے اور اس کے ساتھ وہ لڑکی بھی ہے جو میری بیٹی ہے۔ شاید تم میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے، میں اس وقت اپنے حالات کی تفصیل نہیں بتاؤں گا، لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ دنیا میں بہت کم لوگوں کو اُن حالات سے سابقہ پڑا ہوگا جو میرے ساتھ تواتر سے پیش آئے۔“

”خاں صاحب!“ رکن الدّین بڑی عقیدت سے بولا۔ ”کیا آپ ہمیں تفصیل سے نہیں بتائیں گے؟ اس وقت سب لوگ موجود ہیں۔ رات اپنی ہے، ہم آپ کی عبرت ناک سرگزشت سننے کے منتظر ہیں۔“

”رکن الدّین خاں!“ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”مجھے معاف کیجیے کہ میں سب کو تم سے مخاطب کر رہا ہوں لیکن میرے مخاطب سبھی لوگ ہیں۔“ پھر میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میری سرگزشت اتنی عجیب ہے کہ بعض واقعات پر خود مجھے یقین نہیں آتا مگر یہ انھیں سنانے کا موقع نہیں ہے۔ ابھی یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا ہے۔ ابھی کلدیپ کو میسور کی پہاڑیوں سے اُتارنا اور بدری نرائن ایک پنڈت سے حساب چُکانا ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں کلدیپ اور ترتین کو وہاں سے لانے کے لیے میسور جا رہا ہوں۔ اس محفل میں، جب وہ دونوں یہاں آ جائیں گی تو میرے سینے پر جو ایک غبار ہے وہ دور ہو جائے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس خاندان کے ایک فرد کی حیثیت سے میں بعض معاملات میں دخل دے سکتا ہوں۔ میرا دوست آنند لال، بدقسمتی سے ان دنوں ایک مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہے، وہ کوئی ایک ماہ بعد فارغ ہو جائے گا، اس وقت تک میں تم لوگوں سے درخواست کروں گا کہ سب اسی جگہ مل جل کر رہیں۔ اور مجھے اجازت دیں کہ میں یہاں آ کر اپنے سانسوں کا بوجھ اُتار سکوں۔“

”آپ پھر جا رہے ہیں؟“ پریم درمیان میں بول اُٹھی۔

”ہاں پریم۔“ میں نے شفقت کے انداز میں کہا۔ ”مجھے اب ترتین کو لانا ہوگا چاہے کلدیپ نہ آ سکے لیکن اطمینان رکھو، میں جلد ہی واپس آ جاؤں گا، میری وجہ سے تم سب نے بڑی پریشانیاں اٹھائی ہیں۔“

”آپ شرمندہ کر رہے ہیں۔ میرا خیال ہے ہم سب بے حد خوش ہیں، مجھے دو بیٹیاں اور مل گئیں اور ایک بیٹا بھی۔ اتنے اچھے لوگ ایک جگہ اکٹھے ہو جاتے ہیں تو گھر میں بہار آ جاتی ہے۔ جمیلہ کے آنے سے پہلے یہ گھر بہت اُداس تھا۔ آپ نے بڑا احسان کیا ہے۔“ رکن الدّین نے سیّد غوث پریم اور مالا کی طرف تائیدی نظروں سے دیکھا۔

”ابھی دو بیٹیاں باقی رہ گئی ہیں۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”ہم ان کا عمر بھر انتظار کریں گے۔“ رکن الدّین نے عزم سے کہا۔

رات گئے تک یہ محفل جمی رہی، کسی کا سونے کو جی نہیں چاہتا تھا چائے بنتی رہی اور پان تیار ہوتے رہے، مالا کی اجنبیت دُور کرنے کے لیے سیّد غوث اسے چھیڑتا رہا۔ وہ جھینپتی رہی اور ہنستی رہی۔

گوشت

پک رہا تھا، بھوکے بے تکلّف مہمان بے چینی سے اس کے پکنے کا انتظار کر رہے تھے۔ آخر ایک مہمان اٹھا اور دیگچی سے دو چار بوٹیاں نکال کر چٹ کر گیا۔ بولا۔ ”نمک پھیکا ہے!“

دیکھا دیکھی دُوسرا مہمان بھی اٹھا اور وہ بھی چند بوٹیاں چٹ کر گیا اور کہنے لگا۔ ”مرچ بھی کم ہے!“

تیسرے نے سوچا میں کیوں پیچھے رہوں، اُٹھا اور کئی بوٹیاں کھا گیا اور کہنے لگا۔ ”کیا گھی نہیں پڑا؟“

صاحبِ خانہ بے چینی سے یہ حرکت دیکھ رہے تھے۔ جب برداشت نہ کر سکے تو خود بھی بقیہ بوٹیاں کھا گئے اور فرمایا ”دیگچی میں اور سب کچھ تو ہے مگر گوشت نہیں ہے!“

چار روز تک گلبرگہ میں قیام کے بعد میں نے میسور جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس دوران گھر کی رونقوں، دعوتوں اور ہنگاموں میں الکا مجھے کئی بار یاد آئی۔ یہی گھر تھا جہاں الکا اِدھر سے اُدھر کودی پھرا کرتی تھی۔ مالا میرے پیچھے سائے کی طرح لگی رہتی تھی۔ نالکھ آشرم کی بات اور تھی، یہ رکن الدّین کی حویلی تھی۔ میں اس سے کھنچا کھنچا رہا۔ میری روانگی کی اطلاع سے وہ بڑی مایوس ہو گئی تھی۔ گلبرگہ میں آخری رات رکن الدّین نے نہ جانے کس منشا سے محفلِ سماع منعقد کر ڈالی۔ میں ایک ایسا شخص جو عمر بھی تک ہندو پنڈتوں، پجاریوں، مندروں، دیوداسیوں اور الکا کے ساتھ رہا ہو، اس کے لیے یہ ایک انوکھی بات تھی۔ محفلِ سماع شروع ہوئی تو میرے اندر بہت سے احساسات جاگ اٹھے اور مجھے اپنے اعصاب پر قابو رکھنا مشکل ہو گیا، میرے جسم پر رعشہ سا طاری ہو گیا اور حالت اتنی بگڑی کہ رکن الدّین کو مجبوراً قوالی بند کرانا پڑی، میرے جسم پر موجود ململ کا کُرتا پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔ قوالی کے خاتمے کا اعلان ہوا تو سیّد لاٹھی ٹیکتا ہوا دیوان خانے میں نمودار ہوا اور اس نے رکن الدّین کو ڈانٹنا شروع کر دیا کہ محفلِ سماع درمیان میں کیوں بند کر دی گئی؟ مجھے ہوش نہیں تھا لیکن میں نے سیّد کو دیکھ لیا، میں اس سے چمٹ گیا۔ وہ مجھے دھکّا دے کر دیوان خانے سے چلا گیا، دوبارہ جب قوالوں نے اسی طرح کی گردان کی تو میرا حال دگرگوں ہو گیا۔ قوالی کے اختتام پر رکن الدّین اور سیّد غوث نے مجھے میرے بستر پر ڈال دیا۔ میں رات بھر نزع کی کیفیت میں مبتلا رہا اور جب صبح مجھے ہوش آیا تو میرا سر بھاری تھا اور دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔

بہت دنوں بعد میری یہ حالت ہوئی تھی کہ میں اپنے قابو سے باہر ہو جاؤں۔ مجھ میں ضبط اور برداشت کے بے مثال جوہر پیدا ہو چکے تھے لیکن رات نہ جانے کیا ہوا، جیسے ہی قوال نے تان اٹھائی اور تکرار کی، میں اپنے آپ میں نہیں رہا، ہفتوں مہینوں، برسوں ارتکاز اور مراقبے کی مشق کرنے والا شخص ہاتھ پاؤں چلاتا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے قوال کی لے میرے دل پر ضرب لگا رہی ہے اور میرے دور افتادہ خوابیدہ احساسات جھنجوڑ رہی ہے۔ پھر پریشانی کا ایک دورہ پڑا اور میں نے خود کو ملامت کی لیکن میں کیوں نادم تھا؟ اور کیوں اپنے آپ سے شکایت کر رہا تھا؟ اس کی وجہ خود میرے ذہن میں واضح نہیں تھی۔ بستر سے اٹھ کر میں نے غسل کیا اور ذہن پُرسکون کرنے کے لیے ارتکاز میں ڈوب گیا۔ ارتکاز کرنے میں مجھے شروع شروع میں دشواری ہوئی لیکن میں ہر طرف سے توجّہ ہٹا کر اسے ایک جانب مائل کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔

گلبرگہ سے میری روانگی کے وقت مجھے رقّت انگیزی، گداز اور جذبہ خیزی کے ایک اور مرحلے سے گزرنا پڑا، وہ سب اسٹیشن تک آنا چاہتے تھے لیکن میں نے سیّد غوث کے سوا کسی کو ساتھ نہیں لیا۔ سیّد غوث میسور تک میرے ساتھ جانے کی ضد کرنے لگا۔ مجھے اُسے سمجھانے بجھانے میں خاصی دشواری پیش آئی۔ خلافِ توقع وہ کچھ خاموش اور سنجیدہ سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ میں نے اسے کریدنے کے لیے پوچھا "کیا بات ہے سیّد غوث؟ تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

"مجھے اپنے ساتھ لے جانے میں آپ کو کیا عذر ہے؟"

"ضد مت کرو۔" میں نے اُسے سمجھایا۔ "کلدیپ کے استھان پر جانے کے لیے مجھے پنڈتوں کی ایک ٹولی سے نبرد آزما ہونا پڑے گا، پتہ نہیں کیا حالات پیش آئیں۔ بدری نرائن ابھی تک زندہ ہے اور اُسے پنڈتوں کی اعانت حاصل ہے، وہ انتہائی کمینہ خصلت ہے۔ مجھے یقین ہے پریتم لال کی پہاڑی پر میرا چڑھنا اور کلدیپ سے ملنا وہ برداشت نہیں کرے گا اور میرے راستے میں حائل ہونے کی کوشش کرے گا، میں خواہ مخواہ تمھیں ساتھ رکھ کر پریشانیوں میں الجھانا نہیں چاہتا، جب کہ رکن الدین کی حویلی میں تمھارا ٹھیرنا ضروری ہے، وہاں صرف ایک مرد ہے، یوں بھی اپنے ساتھ تمھاری موجودگی کی وجہ سے میرا ذہن تقسیم ہو جائے گا۔"

وہ کچھ توقف کے بعد دبی زبان میں بولا۔ "کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ میں ہمیشہ آپ کے ساتھ رہوں۔"

"سیّد غوث!" میں نے اُس کے چہرے پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "تمھاری رفاقت میرے لیے مسرّت کا باعث ہوگی۔ میں تمھارا اخلاص کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔"

"میں کچھ اور چاہتا ہوں۔" سیّد غوث نے آہستگی سے کہا۔

"جو کہنا چاہتے ہو، صاف صاف کہو۔"

آپ نے ایک بار تزئین کے بارے میں مجھ سے اپنی پریشانی کا ذکر کیا تھا۔" سیّد غوث نے نظریں جُھکا کر کہا۔ "میں نے اس وقت آپ سے کچھ نہیں کہا، مجھے ڈر تھا کہ کہیں میری جسارت آپ کو ناگوار نہ گزرے۔"

"میں سمجھا نہیں سیّد غوث۔" میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

"میں چاہتا ہوں اب آپ کے ساتھ ہی رہوں۔" وہ اب بھی اشاروں میں عندیہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اوہ تم تزئین کے سلسلے میں کچھ کہنا چاہتے ہو؟" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "مگر تمھیں تو یہ علم بھی نہیں کہ وہ کون ہے۔ ابھی تک تم نے اس کی جھلک بھی نہیں دیکھی۔"

"میرے لیے یہی کافی ہے کہ آپ اسے اپنی بیٹی کہتے ہیں۔" وہ بولا۔ "یہ میری درخواست ہے۔"

رکن الدین کی حویلی میں سیّد غوث اور پریم کی بے تکلّفی اور چھیڑ چھاڑ دیکھ کر میں نے سوچا کہ پریم اور سیّد غوث کی جوڑی خوب رہے گی، حالانکہ پریم ایک پارسی لڑکے سے محبت کرتی تھی مگر اب اس سے شادی پر آمادہ نہیں تھی، ہر حرن کے شرم ناک واقعے کے بعد اس نے اپنے محبوب سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی اور سمجھتی تھی کہ اب وہ اُس کے لائق نہیں ہے، وہ اپنے محبوب کو دھوکا دینا نہیں چاہتی تھی، میں نے پریم کو کئی بار ٹٹولا تھا اور اس نے سرے سے شادی کرنے ہی سے انکار کر دیا تھا۔ سیّد غوث نے مجھے ایک اور طرح سوچنے پر مائل کر دیا تھا، تزئین کے لیے اس سے بہتر انتخاب فی الحال میری نظر میں نہیں تھا۔ اس نے تزئین کا ہاتھ تھامنے کا اظہار کر کے میرے سر سے وزن اتارنے کی پیشکش کی تھی۔ میں نے اس سے کوئی وعدہ نہیں کیا، گو مجھے یقین تھا کہ تزئین میرے کسی فیصلے سے انکار نہیں کرے گی لیکن اس کی مرضی اور کلدیپ کا مشورہ میرے لیے ضروری تھا۔

میں نے سیّد غوث کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "میری جان! تم سے زیادہ قریب میرے لیے کون ہوگا لیکن میں تمھیں آخری جواب نہیں دے سکتا۔ میری واپسی کا انتظار کرو۔ کلدیپ کا بھی تزئین پر اتنا ہی حق ہے جتنا میرا۔ میں اس سے تمھارے سلسلے میں مشورہ کروں گا۔"

"مجھے اعتماد ہے، آپ کا فیصلہ میرے حق میں ہوگا۔" سیّد غوث نے بڑے اعتماد سے جواب دیا پھر وہ اس وقت تک میرے ساتھ رہا جب تک گاڑی اسٹیشن سے روانہ نہ ہو گئی۔ نظام شاہی پولیس کا ایک جوان العمر انسپکٹر سیّد غوث، جو کبھی مجھے گرفتار کرنے آیا تھا، آج مجھ سے کس قسم کی رفاقت کا طالب تھا؟ وقت بھی کیسے کیسے چولے بدلتا ہے۔

گلبرگہ کی جانب سے مطمئن ہو جانے کے بعد ریل میں مجھے پریتم لال کے استھان کی رکاوٹوں کا جائزہ لینے کا موقع مل گیا تھا، اب تک متعدّد پنڈت پجاری میرے عتاب کا نشانہ بن چکے تھے اور ان کا ہر وار سہہ کر میں بار بار اُن کے سامنے سینہ سپر ہو جاتا تھا لیکن وہ اس آنکھ مچولی سے باز نہیں آتے تھے۔ ان کی شدّت میں خاصی کمی ہو گئی تھی، پولیس کا زور بھی ٹوٹ چکا تھا، آنند لال بھی اب ان کے قبضے میں نہیں رہا تھا، الکا بھی ان کے پاس نہیں تھی، میں شیو شنکر پاڑ تک پہنچ گیا تھا اور میں نے ان کے ایک سادھو شنکر کو ہلاک کر دیا تھا، دوسرے پجاری کو شیو شنکر پاڑ کا پتہ بتانے کی سزا مل چکی تھی۔ میرے پاس وقت کی کمی نہیں تھی، آنند لال کا جاپ ختم ہونے میں بہت دن باقی تھے۔ پہاڑی پر جانے سے پہلے میں نے میسور کے ویران علاقوں میں دو تین روز تک غیر معمولی مشقیں جاری رکھیں۔ پھر میں دیکھے بھالے راستوں کی طرف چل پڑا۔ کلدیپ سے ملاقات کا تصوّر حوصلے بڑھاتا تھا۔ نندا کی نصیحت کے مطابق میں بدری نرائن سے پہلے کلدیپ کو اپنانے جا رہا تھا، مجھ جیسے مضبوط اعصاب کے شخص کے دل میں میٹھی میٹھی کسک پیدا ہو رہی تھی۔ میں جب پہاڑی کے نزدیک پہنچ گیا تو مجھے دُور سے وہ پُجاری نظر آئے جو یکساں فاصلوں پر پہاڑی کے اردگرد بیٹھے تھے۔ میں اس وسیع پہاڑ کا چکر کاٹنے کے بعد ایک جگہ رُک گیا اور کسی طویل ہنگامے سے بچنے کے لیے محفوظ راستے تلاش کرنے لگا۔

اسی وقت میرے سر پر دھماکا ہوا، وہ پھر آ گئی تھی، میں نے عالمِ تصوّر میں نظریں اٹھائیں تو وہ بڑی شکستہ اور اعصاب باختہ نظر آئی۔ "تم۔" میں نے ناگواری سے کہا۔ "تم پھر آ گئیں؟"

"ہاں۔ میں تمھارے بغیر نہیں رہ سکتی۔" اس نے مدھم لہجے میں کہا۔

"مگر مجھے تمھارے بغیر ہی سکون ملتا ہے۔"

"مجبوری کی بات اور ہے لیکن میں تم سے جدا ہونے کا تصوّر تک نہیں کر سکتی۔ تم ایک بڑے جادوگر ہو۔"

"کوئی نیا تیور اختیار کرو۔"

"تزئین کو دیکھنے کو جی چاہ رہا تھا۔ میں نے سوچا تمھارے سر پر رہوں گی تو ادھر چلی جاؤں گی۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی ہے کہ تم نے سیّد غوث کو منتخب کر لیا ہے۔"
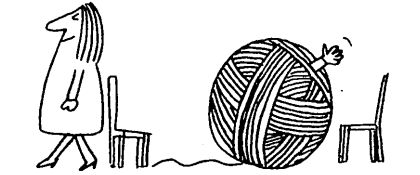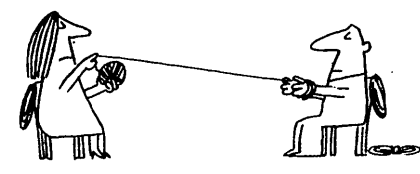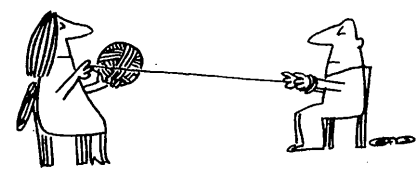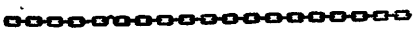
"الکا!" میں نے کچھ سمجھتے ہوئے تیزی سے کہا۔ "اگر تم نے غوث اور تزئین کے درمیان آنے کی کوشش کی تو اچھا نہ ہوگا۔ میری بات...."

"جمیل!" الکا نے میرا جملہ کاٹ کر مغموم آواز میں کہا۔ "میں تمھاری دشمن کبھی نہیں ہو سکتی۔ تزئین سے مجھے اتنا ہی لگاؤ ہے جتنا تم سے۔"

"آج تم آزاد ہو۔ اس لیے ایسی باتیں کر رہی ہو لیکن کل مجھے پریم کا حشر یاد ہے۔ کون جانے کل تم سیّد غوث اور تزئین کے سلسلے میں بھی خطرناک بن جاؤ۔ ہو سکتا ہے کوئی پنڈت پھر تمھیں قبضے میں کر لے اور تم۔ لیکن یہ بات ذہن نشین رکھنا کہ مجھے تمھارے وجود کے خلاف جنگ کرنی ہوگی اور یہ میں کر سکتا ہوں۔ تم میرے ارادوں سے بخوبی واقف ہو۔"

"ہاں جمیل! تم درست کہتے ہو، لیکن اگر تم نے مجھ سے ہمیشہ نفرت کی تو میں خود کو سمندر یا آگ کی نذر کر دوں گی۔"

الکا کے لہجے اور اس کی ڈبڈبائی آنکھوں نے مجھے اپنی جانب کھینچا

شروع کر دیا۔ میں نے کسی قدر نرمی سے کہا۔ "تم بڑی حرّافہ ہو۔ تم کُٹنی ہو۔"
"میں جو کچھ بھی ہوں، تمھاری ہوں۔"
"کیا تم گلبرگہ گئی تھیں؟"
"ہاں میں وہیں تھی۔ تمھاری نظروں سے دُور دُور رہتی تھی لیکن میں کئی بار سیّد غوث اور پریم کے سر پر گئی ہوں اور تمھیں یہ معلوم ہے؟ میری ان سے خوب باتیں ہوئیں۔"
"لیکن انھوں نے مجھے نہیں بتایا۔"
"وہ تمھیں بتا کر تمھاری ناراضی مول لیتے؟"
"اوہ تبھی پریم اور سیّد غوث نے تمھارا ذکر دلچسپی سے نہیں کیا۔"
"وہ کیسے بتاتے میں نے انھیں منع کر دیا تھا۔"
"تم نے سیّد غوث سے کیا بات کی؟" میں نے تجسّس سے پوچھا۔
"میں نے سیّد غوث کو تزئین کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ وہ تو اسی دن تم سے بات کرنا چاہتا تھا، جب تم نے تفصیل بتائی تھی، مجھے اسے ہموار کرنے میں زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی۔ وہ تم سے بے حد مخلص ہے وہ خود ہی آمادہ ہو گیا۔ تم نے خود دیکھا ہوگا جب وہ تم سے بات کر رہا تھا، میں اس کے سر پر نہیں تھی۔"
"گویا تمھی نے اُسے منہ کھولنے پر اُکسایا؟"
"کیوں، کیا تزئین پر میرا حق نہیں ہے؟" وہ بسورتے ہوئے بولی۔ "کیا اسے گندے ماحول سے نکالنے میں میں نے تمھاری مدد نہیں کی تھی؟"
انکا بہت جذباتی باتیں کرنے لگی۔ میری خاموشی دیکھ کر اسے اور شہہ ملی، پھر وہ تزئین کا سارا واقعہ دُہرانے لگی جیسے میں تو اس میں شامل ہی نہیں تھا۔ انکا نے مجھے موم کرنے کے لیے ماضی کے کئی حوالے دیے، جب وہ خاموش ہوئی تو میں نے کہا۔ "اچھا اچھا۔ اب چپ رہو۔ سیدھی طرح بیٹھی رہو۔"
یعنی یہ کہ۔ میں تمھارے پاس... میں"
"ہاں ہاں مجھے معلوم ہے تم کہیں نہیں ٹلوگی۔"
انکا نے میرے سر پر ناچنا شروع کر دیا۔ اس کے زرد چہرے پر بہار آ گئی پھر وہ کہنے لگی۔ "تمھیں معلوم ہے کیا ہوا؟"
"کیا ہوا؟" میں نے مسکرا کے پوچھا۔
"کیا نہیں ہوا؟ ارے میں پنڈتوں پجاریوں کے ساتھ تھی نا۔ میرے سامنے انھوں نے تمھیں موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے بڑے بڑے منصوبے بناتے تھے۔ ہرجن ان کا آلۂ کار تھا لیکن مجھے حاصل کرنے کے بعد وہ آرام و آسائش میں پڑ گیا۔ اسے لڑکیوں اور گانجے کی ایسی عادت پڑی کہ مجھے اس کے لیے روز ایک لڑکی فراہم کرنا پڑتی تھی۔ وہ اپنے محسن پنڈتوں پجاریوں سے کترانے لگا تھا اور مجھے لیے لیے آوارہ گردی کرتا رہتا تھا۔ جب وہ مر گیا تو پولیس آئی۔ کانتی کو چونکہ تم نے مفلوج کر دیا اس لیے وہ کچھ نہیں بتا سکی مگر پولیس نے اسے گرفتار کر ہی لیا اس لیے کہ ہرجن کی لاش اس کے کمرے سے برآمد ہوتی تھی۔"
"کیا کانتی قید میں ہے؟" مجھے اس خبر سے صدمہ پہنچا۔
"ہاں۔ حالانکہ وہ انھیں قسمیں کھا کر یقین دلاتی رہی ہے کہ وہ بے گناہ ہے۔" انکا نے افسوس سے کہا۔
"ہم نے اس غریب کے لیے کچھ نہیں کیا؟"
"میں تمھارے چکر میں پھنسی رہی، مجھے فرصت ہی کہاں ملی؟ لیکن وہ کانتی کو آخر چھوڑ دیں گے۔"
"اگر نہ چھوڑا تو مجھے پھر بمبئی جانا پڑے گا۔"
"اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ ہاں جمیل! یہ تو بتاؤ تم نے مالا کو کہاں سے حاصل کیا؟ کتنی سندر ہے۔ اس کے بارے میں تمھارا ذہن خراب معلوم ہوتا ہے۔" وہ شوخی سے بولی۔
"بکواس کرتی ہو۔ عجب احمق چیز ہو۔" میں نے جھنجلا کر کہا۔
"مگر اس کے بارے میں کیا سوچا ہے تم نے؟" انکا شرارت سے بولی۔
"استدلال کا جاپ ختم ہونے کا انتظار ہے۔"
"میں خود تم سے یہی کہنے والی تھی۔"
"اچھا آگے بڑھو۔ آگے مجھے کوئی اچھی صورت نظر نہیں آتی۔"
اس وقت جب میں کلدیپ کی پہاڑی پر چڑھنے کی جستجو میں لگا ہوا تھا، انکا کی دوبارہ آمد نے مجھے بڑی تقویت بخشی تھی، حالانکہ میں کسی طاقت کی حمایت کے بغیر اُن کی سرکوبی کے لیے پہنچ گیا تھا۔ بظاہر وہ ایک خوبصورت دوشیزہ کا چھوٹا سا نمونہ تھی لیکن اس کی دُور بیں نظریں بڑی حساس تھیں۔ میں نے اس سے بدری نرائن کے بارے میں پوچھا تو انکا نے مجھے بتایا کہ وہ میرے سائے سے بھاگتا ہے۔ اُسے کالی کی شکتی اور بڑے پجاریوں کا تعاون حاصل تھا جو اُسے بروقت میرے ارادوں سے آگاہ کر دیتے تھے۔ کلدیپ نے کالی شیو شنکر اور دوسرے دیوتاؤں کے لیے بڑے کٹھن جاپ کیے تھے۔ انکا کا خیال تھا کہ اگر کلدیپ میرے ساتھ مل کر بدری نرائن کی سرکوبی کی سعی کرے تو کالی کی شکتی درمیان سے ہٹ سکتی ہے۔ میں انکا کے ساتھ بدری نرائن کے بارے میں گفتگو کر رہا تھا کہ اچانک انکا میرے سر سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھیں دُور کچھ دیکھ رہی تھیں، میں نے اس کے تیور بدلتے ہوئے دیکھے۔ "ادھر کیا دیکھ رہی ہو؟"
"اور انھیں خبر ہو گئی ہے کہ تم یہاں آ گئے ہو اور وہ تمھارے آگے بڑھنے پر ایک ساتھ حملہ آور ہوں گے۔"
"تمھارا کیا خیال ہے؟" میں نے بے پروائی سے کہا۔
"میں جانتی ہوں تم کس زور پر یہ بات کہہ رہے ہو لیکن وہ تعداد میں کئی ہیں۔ تمھاری ذرا سی غفلت بنا بنایا کام بگاڑ دے گی۔ وہ اوّل و آخر تمھارے دشمن ہیں۔ ان میں گیانی دھیانی لوگ بھی ہیں۔ تم نے ننداکے استھان سے آنے کے بعد انھی پنڈتوں کے ہاتھوں صدمے اٹھائے ہیں۔"
انکا نے جس خطرے کا اظہار کیا تھا، وہ ٹھیک ثابت ہوا۔ ابھی ہم کچھ ہی آگے بڑھے ہوں گے کہ اُن پنڈتوں اور پجاریوں کا جتھا صاف نظر آنے لگا جو وہاں تعینات کیے گئے تھے، ان کی تعداد غالباً آٹھ تھی اور وہ سب خوف ناک نظروں سے میری سمت دیکھ رہے تھے۔ میں نے اپنی آنکھیں ان پر جما دیں۔ ایک بوڑھے پنڈت کے سوا ان میں کوئی ایسا نہیں تھا جو میرے سامنے قدم جمانے کی ہمت کر سکتا۔ انکا محتاط ہو کر بیٹھ گئی۔ میں اپنی چھاتی پھلا کر ان کی جانب بڑھا۔ میرے ان کے درمیان بہت کم فاصلہ رہ گیا تھا۔
"جمیل! سنو، میں اُس بوڑھے کے سر پہ جا رہی ہوں جو سب سے آگے کھڑا ہے۔ اس کا نام وشنو داس ہے۔ اس نے اپنا وقت فضول باتوں میں نہیں گنوایا ہے۔ بدری نرائن نے سوچ سمجھ کر اسے یہاں بٹھایا ہے۔ کہو تو میں اس کے سر پہ چلی جاؤں کم از کم کچھ توجہ ہٹانے میں تو کامیاب ہو ہی جاؤں گی۔"
"تم زحمت نہ کرو انکا رانی!" میں نے اسے روکتے ہوئے کہا۔
"بس خاموشی سے میرے سر پہ بیٹھی شعبدے دیکھتی رہو۔ میری آنکھیں وشنو داس کے جسم کے اندر ہیں۔ یہ بوڑھا شخص مجھے بُرا نہیں لگتا۔ میں کوشش کروں گا کہ یہ زندہ رہے لیکن گر اس نے میرا راستہ آسانی سے نہ چھوڑا تو مجھے مجبوراً اسے موت کا جام پلانا ہوگا۔ اس کے باقی ساتھی تو مجھے مشکل نظر نہیں آتے۔"
"میں یوں ہی بیکار بیٹھے بیٹھے اکتا جاؤں گی۔ اس کے باقی ساتھیوں کے سروں پر تو مجھے جانے دو۔" انکا نے اصرار کیا۔
"ابھی ٹھہری رہو۔ دیکھتی رہو کہ آگے کیا ہوتا ہے۔"
"تمھاری مرضی۔" انکا ناراضی سے بولی۔ اس کی سُرخ، شعلہ بار نظریں گھوم رہی تھیں۔ میں فاصلہ گھٹاتا رہا۔ پھر میں کچھ آگے جا کر ایک لمحاتی مراقبے میں ڈوب گیا۔ ہر طرف شیطانی قوتیں موجود تھیں۔ دُوسری طرف وشنو داس اور اس کے ساتھی خندہ پیشانی سے مجھے تہہ تیغ کرنے کی فکر میں سرگرداں نظر آتے تھے۔ جس دن کا انھیں انتظار تھا، وہ آ گیا تھا۔ ان کے تیوروں میں نفرت اور غضب کے دریا موج زن تھے۔ ان سب کے جسموں پر بھبھوت ملا ہوا تھا۔ خاص طور پر وشنو داس کی پیشانی پہ مجھے بالائی قوتوں کا جال سا نظر آ رہا تھا۔ میں اس کے قریب ہو کر اس سے متاثر ہو رہا تھا۔ وہ اپنے گیان دھیان میں یکتا معلوم ہوتا تھا۔ ہمارے درمیان فاصلہ بہت مختصر رہ گیا۔ میں دیدہ و دانستہ رُک گیا۔ میں پہل کرنے سے گریز کر رہا تھا۔
"رُک کیوں گئے جمیل احمد خاں؟" وشنو داس سرد آواز میں بولا۔
"تم پر ترس آتا ہے۔" میں نے بے ساختہ کہا۔
"ہاں میں نے بدری نرائن سے تمھارے بارے میں بہت کچھ سُن رکھا ہے۔ ہر مہا پرش کچھ نہ کچھ جانتا ہے۔" وشنو داس نے طنزاً کہا۔
"تم مجھے گیانی دھیانی دکھائی دیتے ہو وشنو داس! میرے بارے میں تمھارا کیا وچار ہے؟"
"بالک ہو۔" وہ بڑے ٹھوس لہجے میں بولا۔ "دو چار جنتر منتر آتے ہیں، ابھی کٹھن تپسیا کی ضرورت ہے۔"
"اسی کارن دُور سے چل کر تمھارے پاس آیا ہوں مہاراج!

کیا مجھے ایک چیلے کی طرح سویکار نہیں کرو گے؟“
”مورکھ ہے۔“ وہ حقارت سے بولا۔ ”کیا تم اتنا بھی نہیں جانتے کہ ہم کس کارن بیٹھک لگائے بیٹھے ہیں؟“

”پہاڑوں کی گپھاؤں میں دیوی دیوتاؤں کی اور (طرف) لو لگانے اور جاپ کرنے سے منش جیون کے جھمیلوں سے دور رہتا ہے۔ تم کس چکر میں پڑ گئے وشنو داس مہاراج؟“ میں نے سادگی سے کہا۔

”مکتی چاہتے ہو تو اُلٹے قدموں لوٹ جاؤ۔“ وشنو داس نے سخت لہجے میں کہا۔ ”میں نے بدری زائن کو وچن دیا ہے کہ جب تک میرے شریر میں آتما موجود ہے، تم یہاں سے آگے نہیں جا سکتے۔“

”دھرماتماؤں کو سنسار کے ان وچاروں میں دیکھ کے مجھے دکھ ہوتا ہے۔ کیا تمہارے لیے یہی بات کافی ہے کہ تم نے بدری ناتھ کو وچن دیا ہے۔ تم نے یہ نہیں سوچا کہ بدری زائن کتنا بڑا پاپی ہے؟ کوئی وچن نہیں بھی دو۔۔۔ میں بھی اس سے کم پاپی نہیں ہوں۔“

”تو کیول پاپی نہیں، تیرے اندر راون کی آتما موجود ہے، تو دشٹ ہے۔ مہاپرشوں سے مسخری کرتا ہے؟“ وہ تیز لہجے میں بولا۔ ”ناریوں سے لو لگانا بالکوں کا کام ہے مورکھ! اُس ناری کے پریم نے تجھے دیوانہ کر رکھا ہے جو اوپر دھونی رمائے بیٹھی ہے، پر تیرا اس کا سنگم نہیں ہو سکتا۔“

”وشنو داس مہاراج! تم سب کچھ جانتے ہو۔ وہی سندر ناری فساد کی جڑ ہے۔ تم نے اُسے کیوں چھوڑ دیا ہے؟ جاؤ اُسے نرکھ میں جھونک دو۔ میں وچن دیتا ہوں، اگر تم اسے راستے سے ہٹا دو تو سارا جیون تمہارے چرنوں میں بتا دوں گا۔“

”اپرادھی!“ وشنو داس غصے سے کانپتا ہوا بولا۔ ”کیا تو یہ کہنا چاہتا ہے کہ میں اپنے دھرم کی ایک مہان ناری کو مار ڈالوں؟“

”تو پھر مجھے مار ڈالو۔۔۔ مجھے اُس ناری کے بغیر چین نہیں آتا مہاراج! مجھے اوپر جانے دو۔“ میں نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔

”جا تو یہاں سے چلا جا۔۔۔ دھرماتماؤں کا کام یہ نہیں ہے کہ خون بہاتے پھریں۔ میں تجھے شما کرتا ہوں۔ اپنا راستہ لے اور پھر کبھی ادھر آنے کا وچار نہ کرنا۔“

”جان پڑتا ہے، میرے بارے میں تم نے بہت کم سنا ہے مہاراج!“

”تو اس بات پر گھمنڈ کرتا ہے کہ کالی کے تہہ خانے سے کیسے واپس آ گیا؟ نالکھ آشرم اور شیو شنکر پہاڑ کس طرح چلا گیا؟ تو نے ہر چرن کو مار دیا ہے، پر دیوی دیوتا تجھے کب تک چھوٹ دیتے رہیں گے؟“
وہ کہنا چاہتا تھا کہ میری نجات میں یقیناً دیوی دیوتاؤں کی کوئی مصلحت ہو گی۔ میں اس کا مفہوم سمجھ گیا۔ ”ممکن ہے وہ اس بار بھی چھوٹ دے دیں اور میں اپنی ناری کے پاس چلا جاؤں۔ سچے پریم سے تو بھگوان بھی پرسن ہوتا ہے مہاراج!“ میں نے چٹکی لی۔

”تو اس طرح جاتا دکھائی نہیں پڑتا۔“ وشنو داس کرخت لہجے میں بولا۔ ”میری نظریں اس چھوکری کو دیکھ رہی ہیں جو تیرے سر پر آلتی پالتی مارے بیٹھی ہے۔ پرنتو یہ بھی تیرے کسی کام نہیں آئے گی۔“

”وشنو داس! تم نے اپنی شکتی کے بل پر انکا کو دیکھ لیا لیکن ابھی تک تم نے میرے بارے میں جو رائے قائم کی ہے، وہ غلط ہے۔ تمہارے مہان پنڈتوں پجاریوں کے اندازے ہمیشہ غلط ثابت ہوئے ہیں۔ وہ بھی اپنے پریے (بدری زائن) کے اکسانے پر میرے راستے میں حائل ہوئے تھے۔ اسی جگہ پریتم لال کے استھان پر، اسی جگہ پہلے بھی ایک گھمسان کا رن پڑ چکا ہے۔“

”سمے برباد مت کر۔ جیون سے زیادہ سندر کوئی چیز نہیں ہے میری مان اور الٹے قدموں واپس چلا جا۔ اس کٹیا کا دھیان من سے نکال دے۔“

”تم اتنے دیالو (مہربان) کیسے بن گئے مہاراج؟“

”تو بڑا ہٹی ہے۔ کیا میں اپنے کسی پجاری کو اشارہ کروں کہ وہ تیری بدھی (عقل) ٹھکانے پر لائے۔“

”تم کیا کرو گے؟“

”میں تجھے بتاؤں کہ میں کیا کروں گا۔“ یہ کہہ کر وشنو داس نے اپنے قریب کھڑے ہوئے پجاریوں میں سے ایک کو اشارہ کیا۔ ”اس سے نمٹ لے۔“ وہ بے پروائی سے مخاطب ہوا۔

وشنو داس کا ساتھی جھجکتے ہوئے تن کر کھڑا ہوا۔ اس نے ایک بار ڈنڈوت کیا۔ اس کے سارے بدن پر کپکپی طاری ہو گئی اور اس نے گمبھیر انداز میں کوئی چٹکی سی میری طرف پھینکی۔۔۔ میں اپنی جگہ جما رہا۔ تھوڑی دیر تک وہ اسی طرح چٹکیاں بجاتا اور میری طرف پھینکتا رہا۔

”یہ کیا کر رہا ہے؟“ میں نے حیرانی سے پوچھا۔

”یہ تیرے دن کم کر رہا ہے۔“ وشنو داس نے حقارت سے جواب دیا۔

”بڑا نٹ کھٹ ہے۔ یہ کوئی مداری معلوم ہوتا ہے۔ سمے

مجسٹریٹ نے ایک مجرم کو کئی بار اپنی عدالت میں دیکھ کر، سزا سناتے ہوئے کہا۔ "دیکھو اب بھی سنبھل جاؤ، چوری بہت بُرا کام ہے۔ تم کتنی ہی بار جیل کی ہوا کھا چکے ہو!"

چور نے مایوسی سے جواب دیا۔ "حضورِ والا! کام تو بہت اچھا ہے۔ لیکن عدالت اور پولیس کے چکر نے اس کا سارا مزہ کرکرا کر کے رکھ دیا ہے۔"

برباد کر رہا ہے۔" میں نے وشنوداس کا جملہ دُہرایا، وہ کچھ پریشان سا ہو گیا تھا۔ "یہ لوگ کیا کہتے ہیں جمیل صاحب!" انکا نے مجھے ٹھوکا دیا۔ پجاری اب تک ہچکیاں بجا رہا تھا۔ وشنوداس غصّے سے اُس پر دہاڑا اور اس کے ہاتھ پر تھوک دیا۔ پجاری سہم کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ وشنوداس نے قہر کی ایک نگاہ میرے جسم پر ڈالی۔

"کیا اب بھی تم مجھے روکو گے؟" میں نے سنجیدگی اختیار کی۔

وشنوداس نے بیزاری سے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ "کیا میں اسے اوپر جانے دوں؟"

"نہیں وشنوداس مہاراج!" وہ ایک ساتھ بولے۔ "ہم جیون دان کر دیں گے۔ پہاڑی سے قریب ہی پجاریوں کا ایک جتھا موجود ہے، تم نے اسے شما کرنا چاہا، پر یہ پاپی شما کے یوگ نہیں ہے۔" ان کے لہجے سے کمزوری اور خوف عیاں تھا۔

"جمیل! مذاق چھوڑو، جلدی کرو، اگر انھیں موقع مل گیا تو یہ کھیل خطرناک ہو سکتا ہے۔"

وشنوداس کے بوڑھے جسم میں کوئی بجلی سی کوندی۔ میں اس گیانی دھیانی پجاری کی شکتیاں تول چکا تھا لیکن وشنوداس اب اپنا عمل شروع کر چکا تھا، اس کا جسم پارے کی طرح لرز رہا تھا۔ میں نے یکبارگی آنکھیں موند کر اپنے آپ کو سمیٹا اور وشنوداس کو تنبیہ کی کہ وہ میرے راستے کا پتھر بننے کی کوشش نہ کرے۔ وشنوداس کا چہرہ آگ بنا ہوا تھا۔ اسے میری شکتی کا کوئی اندازہ نہیں تھا، خدا کی بخشی ہوئی مہان شکتیاں ابھی تک اس کی نظروں سے اوجھل تھیں۔ یہی ان پجاریوں کی غلطی تھی کہ وہ میری تبت میں گزاری ہوئی مدت سے بے خبر تھے۔ وشنوداس کے تمام ساتھی مجھے سفاکی سے کچل ڈالنے پر آمادہ نظر آتے تھے لیکن کوئی بات انھیں روکے ہوئے تھی۔ وہ بات میرا حصار تھی، وہ بات میری شکتی کی چکا چوند تھی، استقامت کے ساتھ میرے کھڑے ہونے کا انداز تھا اور یہاں تک بے دھڑک چلے آنے اور اُوپر جانے کا اصرار کرنے کی جرأت تھی۔ میں نے درمیان کے اشتعال انگیز جملے حذف کر دیے ہیں۔ وشنوداس میری بصارت چھیننے کا کوئی مہلک جاپ کر چکا تھا۔ بظاہر اس کے لیے یہ بڑا آسان کام تھا۔ انکا اضطراب سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ پریتم لال کے استھان پر پنڈتوں پجاریوں سے ایک معرکہ فرض تھا۔ کئی پنڈت تو میرے انتظار سے تھک کر اپنے اپنے استھان لوٹ چکے تھے، اب وشنوداس اور اس کے چیلوں اور ساتھیوں کی ٹولی رہ گئی تھی۔ نالکھ آشرم میں سادھو شنکر کی تباہی کے بعد سے مجھے اپنی شکتی پر کچھ اور اعتماد ہو گیا تھا۔

اچانک وشنوداس نے نہری اوم کئی بار تیزی سے دُہرایا اور گلے میں پڑی ہوئی جنیو کی ڈوری کو جھٹکا دے کر میرے پیروں میں ڈال دیا۔ میں نے اپنے پیر آزاد کرنے کی کوشش کی لیکن مجھے محسوس ہوا جیسے وہ سوت کی ڈوری نہ ہو بلکہ کوئی مضبوط تار ہو جس نے میرے پیر جکڑ لیے ہیں، پھر بھی میں مطمئن کھڑا رہا، یہ کھیل تماشے میرے لیے پرانے ہو چکے تھے۔ میرے پیر ایک سوتی ڈوری سے اُلجھے ہوئے تھے۔ میرے بندھے پیروں سے وشنوداس کے ساتھ کھڑے ہوئے پجاریوں کے چہروں پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ انھوں نے ستائش کی نظروں سے اُسے دیکھا۔ وشنوداس گھبرایا ہوا تھا، اپنے عمل کا تماشا دیکھنے کے بجائے اُس نے اپنے سینے پر ہاتھ مارا اور بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی پر اتنی زور سے اپنا ناخن مارا کہ اس سے خون رسنے لگا۔ وہ چند لمحوں تک اس کے قطرے زمین پر ٹپکاتا رہا۔ خون کے قطرے زمین پر گرنے کے پہلے اور دوسرے لمحے کے درمیان کوڑیالے ناگ کی سرسراہٹ مجھے اپنے گرد و پیش محسوس ہوئی۔ انکا نے میرے سر پر ہاتھ مارا۔ میں نے اپنی پشت پر دیکھا، آگے دیکھا، بائیں دیکھا۔ ہر طرف سے کوڑیالے ناگ میری جانب لپک رہے تھے۔ میری مستعدی اور ہٹ دھرمی سے وشنوداس کسی قدر سنبھل چکا تھا، اس نے پہلے بہت ہلکا سا وار کیا تھا لیکن میں اپنی جگہ کھڑا رہا اور میں نے اپنے پیروں کی بندش پر کسی تردد کا اظہار نہیں کیا تو وہ چھوٹے موٹے منتروں کے بجائے ایک بڑا منتر پڑھنے پر مجبور ہو گیا۔ اس کا خیال تھا، اس طرح مجھے کوئی ردِّعمل ظاہر کرنے کی مہلت نہیں ملے گی۔ مجھے ان منتروں کی تفصیل کہاں تک یاد ہو گی! نہ جانے ایسے کتنے مرحلے گزر چکے تھے۔ کوڑیالے ناگوں نے میرے ارد گرد لہرانا شروع کر دیا تھا، میں نے انھیں ایک خاص فاصلے پر ٹھیرا دیا تھا۔

وشنوداس نے ناگ میرے جسم سے ایک فاصلے پر ٹھیرے دیکھ کر اپنی رستی ہوئی اُنگلی کا خون انگوٹھے کے جھٹکے سے میرے جسم پر پھینکنا شروع کیا، مجھے پہلے قطرے پر یہ محسوس ہوا جیسے کسی نے تیزاب کے چھینٹے پھینک دیے ہوں۔ یا کانٹا چبھو دیا ہو۔ خون کے چھینٹے میرے لباس پر پڑے تو وہ سلگنے لگا، قریب تھا کہ میرے جسم میں آگ لگ جاتی۔ وشنوداس غصّے سے سرتاپا لرز رہا تھا اور یکے بعد دیگرے کوئی سانس لیے بغیر اپنے پہلے منتر کا اثر دیکھے بغیر منتر پر منتر پڑھ رہا تھا اور وار پر وار کر رہا تھا۔

"تم یہ کیا کر رہے ہو؟" انکا نے متوحش نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ میرا لباس جلنے لگا تھا اور میرے چہرے، ہاتھوں اور پیروں کے کُھلے حصّوں پر داغ پڑ گئے تھے، میں نے کچھ نہیں کہا۔ میں کسی معمول کی طرح خود کو تختۂ مشق بنائے وشنوداس کے تمام ستم۔ تمام ستم ظریفیاں سہتا اور دیکھتا رہا۔ میں کوئی نیا منتر دیکھنا چاہتا تھا، جیسے سادھو شنکر نے نالکھ آشرم میں کیا تھا۔ میرے اطمینان کا سبب یہی تھا کہ اب تک کیے جانے والے منتر میری رسائی کی حد میں تھے اور میں نے ایک ذرا سی اذیت برداشت کر کے انھیں کارگر رکھا تھا تاکہ پنڈت اور پجاری مجھ سے مدبھیڑ کی دوبارہ ہمت نہ کر سکیں اور مجھ سے بخوبی واقف ہو سکیں۔ میں انھیں زندہ رکھنا چاہتا تھا۔ وشنوداس کسی نوجوان کی طرح پھرتی سے اپنی تمام شکتیاں آزماتا رہا۔ وہ کبھی اپنی مالا زمین پر پھینکتا کبھی اپنے جسم کی میلی تہہ اٹھا کر میرے جسم پر پھینکتا، خاصی دیر بعد میں نے وشنوداس کو گھورتے ہوئے کہا۔ "مہاراج! اب بھی میرے بارے میں کوئی وچار کیا؟ یہ چمتکار میں پہلے بھی کئی بار دیکھ چکا ہوں کوئی ایسا وار کرو جو یہ پاپی بھی جانے کہ ہاں وشنوداس مہاراج کی شکتی ان کی عمر کے مطابق ہے اور وشنوداس نے بیتے دنوں میں کسی دوسری اور جی نہیں لگایا سوائے تپسیا کے۔"

وشنوداس کی آنکھیں باہر نکل آئی تھیں، وہ سکتے کی حالت سے دوچار تھا۔ اس نے جھلاہٹ میں پھر پے در پے وار کیے اور اپنی کئی انگلیاں ناخن سے زخمی کر لیں۔ جب وشنوداس کی پیشانی پر پسینہ نمودار ہونے لگا تو اس کے ساتھی اور چیلے بھی آگے بڑھے۔ یہ میرے لیے کوئی اچھی صورت نہیں تھی۔ اُنھوں نے پھر وہی کیا جو پنڈتوں پجاریوں کا خاصّہ ہے۔ انھوں نے اپنے منتر کے بیروں کو حاضر ہونے کا حکم دیا۔ ان کی کثیر تعداد کے سبب بیروں کی یلغار بھی خاصی شدید ہو سکتی تھی۔ ماورائی شکتی والوں کا بڑا دار و مدار بیروں کے زیادہ سے زیادہ تصرّف پر ہوتا ہے۔ یہ بلائیں عجب عجب

مجسٹریٹ نے ایک عادی مجرم کو کئی بار سزائیں دیں، وہ سزا کاٹ کر آتا اور کسی دُوسرے جرم میں پکڑ کر پھر مجسٹریٹ کے رُوبرُو کھڑا کر دیا جاتا۔ مجسٹریٹ نے سزا کا حکم سُناتے ہوئے کہا۔ "خبردار! جو تم پھر یہاں نظر آئے۔ اب میں تمھاری شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔"

مجرم نے معصُومیت سے سوال کیا۔ "کیوں حضور؟ کیا بات ہوئی؟ کیا آپ کا کہیں اور تبادلہ ہو گیا ہے؟"

طرح شور مچاتی، قہقہے لگاتی اور چیختی، پھنکارتی دھماکے کرتی اور دل ہلاتی ہوئی نشانہ بناتی ہیں۔ بیروں کے مختلف رُوپ ہوتے ہیں اور وہ رُوپ بدلنے پر قادر بھی ہوتے ہیں۔ میں نے اپنے ارد گرد ہر طرف بیر دیکھے کوڑیالے ناگ ایک سمت لہرا رہے تھے، اُدھر میرے چہروں کے داغوں میں سوزش تھی، اِدھر میرے کپڑے جل کر راکھ بن چکے تھے۔ میں برہنہ ان کے سامنے کھڑا تھا۔ انکا کی استقامت کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا اور وہ مجھے بار بار ٹہوکے دے رہی تھی۔ میں نے اسے روکے رکھا تھا اور خود ساکت و صامت کھڑا تھا۔ خطرناک معرکہ توقع کے مطابق تھا۔ وہ سب ایک ساتھ مُنہ چلا رہے تھے اور منتر کا جاپ کر رہے تھے۔ جب وہ اپنے کسی حربے سے مجھے نقصان نہ پہنچا سکے تو دست بدست لڑائی پر اُتر آئے۔ ان کی نیّت بھانپ کر مجھے مجبوراً اپنی قوتیں یکجا کرنی پڑیں اور میں نے اپنی انگلی کو جنبش دی۔ میری نگاہ۔ وہ شعلہ بار تیز نگاہ، جو دیواروں کے آر پار ہو جاتے، جو نیزے کی انی کی طرح چبھے اور شعلے کی طرح لپکے۔ ایک ثانیے میں وہ کسی جھٹکے کے ساتھ پیچھے ہٹے، اور ایک پجاری زمین پر گر گیا، اس کے دوسرے ساتھی سہم کر اور پیچھے ہٹ گئے۔ میں اپنی نگاہوں اور انگلیوں سے انھیں اور پیچھے، اور پیچھے ہٹاتا رہا جس نے آگے بڑھنے کی کوشش کی، وہ میری نگاہ کی زد پر آ گیا اس سے پیشتر کہ وہ سنبھلتے۔ ان پر فضا سے خس و خاشاک اور پتھروں کی بارش ہوئی، انھوں نے بھاگنا چاہا لیکن کچھ دُور جا کر وشنوداس کی دھمکی نے ان کے قدم پکڑ لیے۔ وشنوداس تیزی سے پلٹا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو للکارا مگر کئی کے سر لہولہان ہو چکے تھے اور وہ ایک لمحے کے لیے وشنوداس کی دھمکی سے خوف زدہ ہوتے پھر منتشر ہو گئے۔ ان میں تین کا کام وہیں تمام ہو گیا تھا۔ اب میرے مقابلے میں صرف وشنوداس باقی رہ گیا تھا۔ مجھ پر دیوانگی طاری تھی۔ ایک بار پھر میرا وحشی گھوڑا میرے جسم میں طیش سے ہنہنانے لگا۔ میں ان سب کو جہنم رسید کرنے کی فکر میں تھا کہ وشنوداس اپنے ساتھیوں کی طرف تھوک کر میری طرف

بڑھا۔ مجھے جلال و غضب کی اس کیفیت میں بھی وشنوداس کی ضعیفی پر ترس آرہا تھا۔ میں نے اسے سخت لہجے میں مخاطب کیا۔ "سنو مہاراج! بہتر ہے کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔"

"نہیں۔" اس کی آواز میں پہلے جیسا دبدبہ نہیں رہا تھا۔ "نہیں۔ میں نے بدری نراتن کو کالی کے سامنے وچن دیا تھا کہ تجھے کلدیپ کے استھان جانے سے اوشں روک لوں گا۔"

"پاگل مت بنو مہاراج!" میں نے نرمی سے کہا۔ "میں تم پر ہاتھ اٹھانا نہیں چاہتا۔ میں کوئی بُرا آدمی نہیں ہوں۔ میرے اندر دیکھنے کی کوشش کرو۔"

میرا خیال تھا کہ وشنوداس اپنے ساتھیوں کا بھیانک انجام دیکھ کر یہاں سے فرار ہو جائے گا لیکن اپنی دُھن کا پکّا اور ارادے کا سچّا میری بات کے جواب میں اس نے دیوتاؤں کے نام کے ساتھ ایک بار پھر حملے شروع کیے، میں نے خود کو بچا لیا اور ہر ممکن کوشش کی کہ اس کے ساتھ کوئی افسوس ناک واقعہ پیش نہ آئے۔ وہ باز نہ آیا۔ وشنوداس کے منتر کے بیروں نے میرا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ میں اس کے حملوں کا توڑ کرتا ہوا تیزی سے اس کے قریب آگیا اور میں نے اس کی نحیف کلائی تھام لی۔ اس کی کلائی کا میری گرفت میں آنا تھا کہ اس کے جسم کو شدید جھٹکے لگنے شروع ہو گئے جیسے بجلی کے ننگے تاروں نے اسے جکڑ لیا ہو۔ اس نے زبان سے ایک لفظ نہیں کہا بلکہ غیر معمولی قوّتِ برداشت کا ثبوت دیا۔ میں نے اسے دو چار جھٹکے دیے پھر ایک طرف دھکیل دیا۔ اس کا جسم سیاہ پڑ گیا تھا۔ میرے پاس اُسے دوبارہ دیکھنے کی فرصت نہیں تھی اور یہ کوئی پُرلطف منظر بھی نہیں تھا، مجھے بہت افسوس تھا مگر میں کیا کرتا؟ وہ پہلے بھی اس استھان پر میرے آڑے آئے تھے اور میں اوپر چلا گیا تھا۔ ان پر جنون طاری ہو گیا تھا۔ انھوں نے ایک ٹولی وہاں بٹھا دی تھی کہ کلدیپ نیچے نہ اُتر سکے اور میں اوپر نہ جا سکوں۔ یہ پریتم لال کے استھان کا آخری معرکہ تھا۔ اس کے بعد نہ انھیں جرأت ہو گی، نہ مجھے فرصت ہو گی۔ اب جتنے پُجاری روز مر رہے تھے میرے لیے آزادی اور سکون کا سانس لینے کے مواقع بڑھ رہے تھے۔ میں پہلے ہی یہاں آکر انھیں پہاڑی کے اطراف سے ہٹا سکتا تھا مگر شاید وقت نہیں آیا تھا۔

انگا میرے سر پر بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ میں نے اوپر کی جانب دیکھا۔ پہاڑی سبزے سے ڈھکی ہوئی تھی اور پگڈنڈیاں نظر آرہی تھیں۔ ایک پگڈنڈی پر مستانہ انداز سے چلا۔ رگوں میں خون تیزی سے دوڑنے لگا تھا، کلدیپ کا آستانہ قریب تھا اور کوئی رکاوٹ سامنے نہیں تھی۔ میں لمبے لمبے قدم بڑھاتا ہوا اوپر چڑھتا گیا۔ انگا نے حسبِ عادت میرے سر پر اچھل کود شروع کر دی تھی۔ کلدیپ کی کٹیا آئی تو میرا سانس چڑھ گیا تھا لیکن دم مارنے کا یارا کسے تھا؟ انگا میرے سر سے اُتر گئی، وہ کلدیپ کی کٹیا میں جانے سے گریز کرتی تھی۔

میں اپنے اُس لمحے کے جذبات کا حال محفوظ رکھتا ہوں، یہ کلدیپ کی کُٹیا تھی اور کلدیپ کون تھی؟ میں نے دھڑکتے دل سے کلدیپ کی کٹیا کے اندر قدم رکھا۔ میری نظر سب سے پہلے نزہین پر پڑی اور دل سے ایک آہ نکل گئی۔ اس حسین لڑکی کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ چکے تھے اور گردشِ زمانہ کی سیاہ پرچھائیاں اس کے چہرے پر لرز رہی تھیں۔ میرا گلاب مُرجھا چکا تھا۔ میرے آنگن میں خزاں آگئی تھی۔ جلد کی رنگت جھلسی ہوئی تھی، چہرہ زرد، بال بکھرے ہوئے، لباس بے ترتیب، وہ کسی زندہ لاش کے مانند چٹائی پر بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی۔ میں نے کانپتی آواز میں اُسے پُکارا، وہ سہم کر ایک جھٹکے سے پلٹی۔ خلافِ توقع مجھے دیکھ کر وہ حیرت سے چیخ پڑی، پھر تیزی سے اٹھی اور دوڑ کر میرے سینے سے لگ گئی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں مجھے ایسی داستان سُنا رہی تھیں جسے سُننے کی مجھ میں تاب نہیں تھی۔ میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ میں نے اس کے خشک بالوں پر ہاتھ پھیرا اور اسے اپنے سینے میں بھینچ لیا۔ میرے آنسو اس کے بالوں میں گر رہے تھے جیسے بارش ہو رہی ہو۔ وہ میرے سینے سے لپٹی رہی، پھر اس نے ڈبڈبائی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میرا دل پاش پاش ہو گیا۔ "نزہین! میری گڑیا!" میرا گلا رندھ گیا۔ "کچھ مت کہنا۔ مجھ میں کچھ اور سننے کی سکت نہیں ہے لیکن اب دُکھ کے دِل چھوٹ چکے ہیں۔ تو نے میری خاطر بڑے مصائب جھیلے ہیں، میں تیرا گناہ گار ہوں۔ مجھے معاف کر دے میری بچّی! میری جان! میں اب تجھے اس ویرانے میں نہیں چھوڑوں گا۔ تجھے ساتھ لے چلنے آیا ہوں۔ سمجھی، اس بار میں تنہا واپس جانے کے لیے نہیں آیا۔ تیرے تمام دکھوں کی تلافی ہو جائے گی۔"

نزہین کی ہچکی بندھ گئی۔ وہ میرے سینے پر سر رکھ کے پھوٹ پڑی۔ ہم دونوں دیر تک زار و قطار روتے رہے۔ "تو بڑی بہادر رہی ہے نزہین!" میں نے کہا۔

وہ بڑی بہادر تھی۔ پریتم لال کی پہاڑی پر نیچے کا کوئی شخص اوپر آنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا، یہاں نہ روشنی تھی، نہ زندگی کی کوئی چہل پہل۔ کلدیپ ایک عرصے سے جاپ میں مصروف تھی، نزہین تنہا ان پہاڑیوں پر گھومتی رہتی، راتوں میں، سیاہ راتوں میں، دوپہروں میں، دھوپ میں، برسات میں۔ وہ خود اپنا کھانا تلاش کرتی۔ جھرنے پر بالا کی طرح نہاتی اور درختوں سے پھل توڑتی۔ جن چیزوں کی اُسے ضرورت ہوتی

وہ کٹیا میں مل جاتی تھیں۔ کٹیا میں یہ چیزیں کہاں سے آجاتی تھیں؟ اس سے اُسے کوئی غرض نہیں تھی لیکن ایک نوجوان لڑکی جس کی عمر خواب دیکھنے اور باتیں کرنے اور سنگھار کرنے اور ادھر اُدھر تھرکنے کی ہو، وہ کئی سال سے اس ویرانے میں زندگی گزار رہی تھی۔ وہ بات کرنے کو ترس جاتی ہوگی۔ کیسی اذیت تھی، کیسا جبر تھا مگر وہ بہادر لڑکی جس کی زندگی میں ہر وقت ساز بجتے تھے، رقص و نغمہ کا بازار گرم رہتا تھا۔ اس لڑکی نے حیرت انگیز صبر اور تحمل کا ثبوت دیا تھا۔

کلدیپ کٹیا میں اپنے جاپ میں مستغرق تھی۔ میں نے تزئین کو گیارہ روز تک اپنی آنکھوں کے سامنے رکھا، اپنے سینے سے قریب رکھا، اور ہم دونوں انکا کے ساتھ پہاڑی پر روزانہ سیر سپاٹے کرتے رہے۔ میری رفاقت اور نگہداشت سے تزئین کی صحت پر خوش گوار اثر پڑا تھا۔

پہاڑی پر تزئین کی اُداس آنکھیں اور کلدیپ کی مشقت دیکھ کر میرے دل میں پنڈتوں پجاریوں کے خلاف نفرت کے شعلے بھڑکنے لگے تھے۔ مجھے افسوس ہوا کہ وشنو داس کی ٹولی کے چند سیاہ دل افراد موت کے منہ میں جاتے جاتے رہ گئے۔ گیارھویں روز میں اور تزئین کٹیا سے باہر ایک درخت کے نیچے چٹائی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں تزئین کو لندن کے واقعات سنا رہا تھا کہ تزئین ایک دم مسرت سے چیخ اٹھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا، کٹیا کے دروازے سے زرد ساڑھی میں ملبوس کلدیپ ایک طویل جاپ سے فارغ ہو کر ہماری طرف آرہی تھی۔ اتنی کڑی تپسیا کے بعد بھی اس کے چہرے پر تھکن کے آثار نہیں تھے، وہ شاداب اور شگفتہ نظر آرہی تھی۔ امتدادِ زمانہ نے اس کی رعنائی چھیننے کے بجائے اسے برقرار رکھا تھا بلکہ اس میں کچھ اور اضافہ کر دیا تھا۔ وہی حسین چاند سا چہرہ۔ مگر یورپا کے کلب میں ملنے والی اس فیشن ایبل لڑکی کی نظروں میں شوخی نہیں تھی، وقار تھا، سنجیدگی تھی، ایک معنی خیز پُراسرار مسکراہٹ تھی۔ ہم دونوں کی نظریں چار ہوئیں اور ایک دوسرے سے نہ جانے کتنے کرب کہہ گئیں۔ میرے سامنے میرا مستقبل تھا، میرے سامنے میرا ماضی تھا، کلدیپ سے میری زندگی کے کتنے عجیب واقعات وابستہ تھے۔ میں اس کے ایثار کا قرض کبھی اُتار نہیں سکتا تھا۔ تزئین چٹائی سے اُٹھ کر بے تحاشا اس سے لپٹ گئی اور ایک بار پھر اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیل رواں ہو گیا۔ تزئین اسے چمٹاتے ہوئے میرے پاس آئی۔ میری حالت بھی متغیر تھی مگر میں تزئین کے سامنے اس طرح کا بے تابانہ رویّہ اختیار نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اسے ان نگاہوں سے دیکھا جن میں کرب، ندامت، مجبوری اور امید کی جھلک تھی۔ ہمارے پاس ایک دوسرے کے سامنے کچھ کہنے کے لیے الفاظ بھی نہیں

تھے، بات الفاظ کی دسترس سے نکل گئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ میرے اندر سمائی ہوئی ہے اور میں اس میں جاگزیں ہوں۔ "میں آگیا ہوں۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔" اس نے دردناک لہجے میں کہا۔ "تم آہی گئے۔"

"اور میں کیوں آیا ہوں؟" میں نے کہا اور کچھ توقف کے بعد بولا۔ "مجھ سے اب تنہا چلا نہیں جاتا۔" کلدیپ نے اداسی سے میری طرف دیکھا مگر کوئی جواب نہیں دیا۔

"میں بہت دُور سے آیا ہوں۔ تمھاری نظر سے کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔"

"ہاں۔ میں دیکھ رہی ہوں۔" اس نے غیر جذباتی انداز میں کہا۔

تزئین ہم دونوں کے درمیان کھڑی تھی اور مسرت سے کھلی جا رہی تھی۔ مجھے صرف ایک لمحے میں کلدیپ کے رویّے کی تبدیلی محسوس ہو گئی تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر کے تذکرے شروع کر دیے۔ کلدیپ خاموشی سے سنتی رہی اور ہمارے ساتھ پہاڑی کا ایک لمبا چکّر کاٹ کر واپس آگئی۔ میں بار بار اس کے چہرے کی طرف دیکھتا تھا اور اس کی نگاہوں میں کچھ تلاش کرنے کی کوشش کرتا تھا، مگر ان آنکھوں میں بڑی گہرائی تھی۔ دو روز تک تخلیے کا موقع نہیں مل سکا کیوں کہ تزئین ہر وقت سائے کی طرح ساتھ لگی رہتی تھی۔ تزئین کی شوخیوں نے کئی بار کلدیپ کے گمبھیر چہرے کو مسکرانے اور ہنسنے پر مجبور کر دیا۔ وہ کلدیپ سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔ میں اس وقت ایک دوری سی محسوس کر رہا تھا۔ آخر دو روز بعد جب تزئین آبشار پر نہانے گئی تو میں کلدیپ کی کٹیا میں جا گھسا اور میں نے جاتے ہی تیزی سے کہا۔ "کلدیپ! کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے مجھے اب اپنا تعارف کرانے کی ضرورت پڑے گی۔ میں جمیل ہوں۔"

کلدیپ چند لمحے خالی خالی نظروں سے مجھے تکتی رہی۔ "ہاں میں دیکھ رہی ہوں۔ یہ تم ہی ہو۔"

"اور تم کلدیپ ہو، وہ کلدیپ جو جمیل احمد خاں کے لیے پیدا کی گئی تھی۔ تمھیں کچھ یاد ہے؟" میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"یاد؟" وہ کھوئی کھوئی سی بولی۔ "سمے بہت گزر گیا ہے۔"

"میں تمھیں لینے آیا ہوں۔" میں نے بے چینی سے کہا۔

"کیا مجھے یہاں سے جانا چاہیے؟" اس نے اداسی سے پوچھا۔

"نہیں جاؤ گی تو میں ادھورا ہی رہوں گا، تم نے اب تک ایثار ہی کیا ہے۔ اب تم یہ ظلم کیوں کرو گی؟"

"جمیل!" کلدیپ نے ڈوبتے لہجے میں کہا۔ "مجھے یہیں رہنے دو۔ میرے جلنے سے پریتم لال مہاراج کی آتما بیاکل ہوگی۔ میں یہاں رہ کر تمھارے

من کی شانتی کے لیے برابر پرارتھنا کرتی رہوں گی۔"

میں ایک آتش فشاں تھا جو اُبل پڑا۔ میں نے قریب جا کے اس کا بازو پکڑ لیا اور اسے جب اپنی طرف کھینچا تو سوتے پھوٹ پڑے۔ اس کا سینہ تر ہو گیا تھا۔ میں کسی بچے، کسی یتیم بچّے کی طرح اسے اپنے وہ ہولناک واقعات سنا رہا تھا جو پہلے سے اس کے علم میں تھے۔ میں نے اپنے آپ کو اس کے سامنے انڈیل دیا اور اس کے سینے سے سر اٹھا کر دیکھا تو وہ چھت کی طرف تک رہی تھی، اس کی آنکھیں ٹھہر گئی تھیں۔ "میں کہاں کہاں ہوتا ہوا آخر تمھارے پاس آگیا ہوں۔ میرے عظیم گرو نندلال نے تبّت کے استھان پر مجھے ہدایت کی تھی کہ میں تمھیں پریتم لال کے استھان سے نیچے اُتار کر اپنے ساتھ لے جاؤں۔ اگر تم نے انکار کیا تو شاید میں زندہ نہیں رہوں گا۔"

"اب تم ایک قد آور شخص ہو۔" وہ دھیرے دھیرے بولی۔ "تمھیں نندلال نے بہت کچھ دیا ہے۔ تمھارے پاس انکا ہے۔ میں پریتم لال کی اچھّا پر جیون تیاگ چکی ہوں۔ میرے بھاگیہ میں جو لکھّا تھا، وہ پورا ہو چکا ہے۔ یہ کٹیا میرا سنسار ہے۔ مجھے یہاں منڈل میں تنہا بیٹھنے اور جاپ کرنے میں سکون ملتا ہے۔"

میں اس کا دردِ پنہاں محسوس کر سکتا تھا۔ "تم خود کو فریب دے رہی ہو۔ کلدیپ! تم نے میرے سوا کچھ نہیں سوچا ہے۔ تم میرے بغیر یہاں نہیں رہ سکتیں۔"

"تمھی نے میرے ساتھ یہ حسنِ سلوک کیا ہے کہ مجھے بھگتی، تپسیا اور استی کا راستہ دکھایا۔ اب تم خود مجھے پتھروں اور کانٹوں میں گھسیٹ رہے ہو۔ اصل زندگی کیا ہے؟ یہ یہاں آکر مجھ پر کھلا۔ کیا تم ایک احسان نہیں کر سکتے کہ مجھے یہیں چھوڑ جاؤ؟" کلدیپ نے ہیجانی انداز میں کہا۔

"میں تمھارے ساتھ کچھ دن زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ زندگی کا جو فلسفہ تم مجھے سمجھا رہی ہو، اسے میں بھی جانتا ہوں۔ مجھے تپسیا، مراقبے اور ارتکاز کا لطف معلوم ہے لیکن اس لطف کے باوجود میں تمھیں یہاں سے لے جانا چاہتا ہوں کیونکہ تزئین اور دوسرے بہت سے لوگ ہم سے متعلق ہیں اور میں جب تمھاری صورت دیکھتا ہوں تو میرے دل میں زندگی کی تمنا کروٹیں لینے لگتی ہے اور میرا جی چاہتا ہے کہ ہم کسی پُرسکون جگہ ایک ساتھ ایک دوسرے کی باہوں میں رہیں۔ زندگی صرف علیحدہ رہ کر، ساری دُنیا سے کنارہ کشی کر کے، اپنی ذات میں گم ہو جانے کو نہیں کہتے۔ یہ خود غرضی ہے یہ فرار ہے۔ میں جب تمھاری صورت دیکھتا ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں نے تمھارے ساتھ کتنا بڑا ظلم کیا ہے۔ تم نے مجھے میری خامیوں اور لغزشوں کے باوجود قبول کیا لیکن

میں نے تمھیں کیا دیا؟ یہ ویرانہ، یہ بھیانک خاموشی، یہ کرب ناک تنہائی — تمھارے سہانے دن میری تیرہ بختیوں کی نذر ہو گئے — میں ان دنوں کا حساب دینا چاہتا ہوں، میرے دل و دماغ پر بوجھ سوار ہے۔"

میری باتوں نے اسے مضطرب کر دیا لیکن میرے پیہم اصرار اور منّتوں کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا — میں نے اس کے دونوں شانے پکڑ کر اسے جھنجوڑ دیا۔ "تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ تم تو بالکل سرد ہو گئی ہو۔"

اس نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی۔ "جمیل! بھگوان کے لیے زیادہ باتیں نہ کرو۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔"

"میں تمھارا بھگوان ہوں۔" میں نے اس کے رُخسار چومتے ہوئے کہا۔ "میں تمھارا شوہر ہوں، میں تمھارا محبوب ہوں، میں جمیل ہوں۔ میری طرف دیکھو۔"

اس نے ایک جھٹکے سے اپنی گردن چھڑا لی۔ "نہیں — میں تو خود کو سونپ چکی ہوں۔" وہ اضطراب میں بولی۔

میں نے اسے چھوڑ دیا اور تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تزئین کے سلسلے میں ایک پیام ہے۔ تمھاری کیا رائے ہے؟"

وہ دل گرفتہ سی ایک طرف سمٹ گئی۔ "وہ ایک اچھا لڑکا ہے، تزئین اس کے ساتھ خوش رہے گی۔"

"اور تم اپنی بیٹی کی شادی میں نہیں جاؤ گی؟ اسے چوڑیاں نہیں پہناؤ گی؟ اس کی مانگ میں افشاں نہیں بھرو گی؟ تم اسے رخصت بھی نہیں کرو گی؟" میں نے جذباتی ہو کے کہا۔

"میں یہاں بیٹھ کر اس کے ساتھ رہوں گی۔" کلدیپ نے حسرت سے کہا۔

میں مزید ایک ہفتے تک کلدیپ کو ساتھ لے جانے اور اس کی ضد توڑنے کی کوششوں میں لگا رہا۔ میں نے اسے بہت حوالے دیے۔ میں ایک رات تزئین کی موجودگی میں اس کی کٹیا میں گھس گیا۔ مجھے مجبوراً تزئین کا ذہن معطل کرنا پڑا تاکہ وہ ہماری گفتگو نہ سُن سکے۔ میں نے کلدیپ کے سرد خانے میں حرارت پیدا کرنے کی بڑی جد و جہد کی۔ بدری نرائن اور پنڈتوں پجاریوں کی ایذا رسانی کا ذکر کیا — میں نے دُنیا کا ایک مثبت نقطۂ نظر پیش کیا اور زورِ بیان سے گلیوں، بازاروں، عمارتوں اور کلبوں کے رنگین مناظر اسے دکھاتے۔ میں نے اسے سوز و گداز کے قصّے سنائے لیکن وہ اپنی جگہ جمی رہی۔ اس نے میرے ساتھ کوئی بدسلوکی نہیں کی لیکن اس کا سرد رویّہ اور اجنبی انداز ہی میرے لیے سوہانِ رُوح تھا۔ کبھی اس کی مسکراہٹ سے گمان ہوتا تھا کہ اس نے اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کر لی ہے۔ میں اسے جھنجوڑ جھنجوڑ دیتا۔ تزئین

اسے ساتھ لے چلنے کے لیے مُصر تھی اور اس کے گلے میں باہیں ڈال کر بار بار اسے آمادہ کرتی تھی ــــ میں جب کٹیا سے باہر آجاتا تو انکا میرے سر پر آجاتی اور مایوسی سے سر ہلانے لگتی۔

ایک ایک دن وحشت میں گزر رہا تھا، میں کلدیپ کی رائے نہیں بدل سکتا تھا۔ وہ اب ایک ایسے مقام پر پہنچ گئی تھی جہاں سے اس کی واپسی ناممکن تھی۔ اس کے قلب میں انقلاب آچکا تھا۔ میں پہلی مرتبہ ہی مایوس ہو جاتا لیکن نیچے اترنے سے انکار کے باوجود اس نے میری پزیرائی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ یوں وہ وہی تھی، جسے میں پہلے چھوڑ گیا تھا ــ وہی انداز، وہی وارفتگی، وہی میرا خیال، وہی میرا تذکرہ۔ لیکن اگر وہ میرے ساتھ جانے پر رضامند ہو جاتی تو یہ تمام محبتیں اُس وقت اپنا اثر کھو دیتیں۔ میری بے تابیوں پر وہ مسکرا کے خاموش ہو جاتی یا مجھے دوش دینے لگتی۔ ایک دن میں قطعی مایوس ہو گیا۔ آخری بار میں نے اس سے کہا "میرا خیال ہے، اب مجھے یہاں سے جانا چاہیے۔"

"نہیں تم یہاں ٹھیرو ـــ" اس نے سادگی سے جواب دیا۔

"کیا فائدہ؟ مجھے بدری نرائن کو تلاش کرنا ہے اور اس کی موت کے بعد خود کہیں منہ چھپانا ہے۔ تزئین کی شادی ہو جائے گی تو پھر میرا پرسانِ حال کون ہوگا؟"

"میں تمھاری خبر رکھوں گی۔"

"تم!" میں نے ایک بار اور کوشش کی "کلدیپ! چلو نا۔ ذرا نیچے اُتر کے تو دیکھو۔"

"جمیل ـــ اس وقت تم یہاں سے چلے جاؤ اور تزئین کی شادی کے فرض سے جلد از جلد سبک دوش ہو جاؤ پھر تم سکونِ قلب سے کوئی فیصلہ کر سکو گے۔ تزئین کی شادی سے پہلے بدری نرائن کے تعاقب میں مت روانہ ہونا۔"

"پتہ نہیں کیا ہو؟" میں نے مایوسی سے کہا۔

میں نے کلدیپ کے ساتھ بہت سر پھوڑا پھر تھک کر اپنے ہونٹ سی لیے اور کچھ کہنا ہی چھوڑ دیا۔ میرے اس رویّے پر اُس نے کسی جذبے کا اظہار نہیں کیا۔ وہ اسی طرح میری پرستش کرتی رہی۔ پھر میں نے طے کر لیا کہ میں تزئین کا پہاڑ سر سے اتار دوں اور کلدیپ کی جدائی کا پہاڑ دل پر رکھوں۔ میں نے تزئین کو ساتھ لے کر واپس جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔

رخصت ہوتے وقت تزئین کلدیپ سے لپٹ لپٹ کے رو رہی تھی۔ میں دُور کھڑا رہا۔ میری کیفیت صرف انکا محسوس کر رہی تھی، وہ میرے شانوں پر بیٹھی رخصتی کے اس منظر سے بُری طرح متاثر تھی۔ میں نے پہلی بار مہان شکتی کی مالک، پریتم لال کے استھان کی جانشین کلدیپ کی آنکھوں میں آنسو لرزتے دیکھے، مجھے معلوم نہیں کہ اس کا پیمانۂ صبر تزئین کی جدائی پر چھلک پڑا تھا یا اُسے مجھ سے کسی ربط کا خیال آگیا تھا۔

میں نے آخری وقت اُسے نظر بھر کے دیکھا بھی نہیں۔ اب دیکھنے کو کیا رہ گیا تھا؟

بنگلور میں، میں نے ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ گلبرگہ جانے سے پہلے میں تزئین کے لباس بنانا اور اُسے دُنیا کی چہل پہل، ہنگاموں سے مانوس کرانا چاہتا تھا لیکن کچھ کام کرنے کا حوصلہ ہی نہیں تھا، ساری دنیا بے رونق اور بے مزہ نظر آتی تھی۔ میں تزئین کی موجودگی کی وجہ سے اپنی کیفیت چھپاتا پھرتا تھا۔ میں اُسے بنگلور کا لال باغ، میوزیم اور کنٹونمنٹ کا علاقہ دکھانے لے گیا۔ وہ عمارتوں، سڑکوں اور لوگوں کو اس طرح حیرت سے دیکھتی تھی جیسے اُس نے یہ سب کچھ پہلی بار دیکھا ہو۔ مگر اُس کی قربت مجھے کلدیپ کی یاد دلاتی تھی۔ کلدیپ جس نے اپنے محبوب کے لیے دُنیا چھوڑ دی تھی اور جب محبوب سے وصال کا موقع آیا تو اُس نے محبوب کو چھوڑ دیا۔

انکا نے تزئین کے ملبوسات، زیورات کا انتظام کسی طرح کروایا تھا، میں نے تو انکا کے اشاروں پر عمل کیا۔ وہ جو کہتی رہی میں کرتا رہا جہاں کا حکم ملتا رہا میں پہنچتا رہا، میرا دماغ ماؤف تھا۔ میں نے اپنی باطنی قوتوں کی طرف بھی اُن دنوں کوئی توجہ نہیں دی۔ یہاں تک کہ ارتکاز کی مشقیں بھی مجھ سے چھوٹ گئی تھیں۔ پریتم لال کے استھان پر کلدیپ کے چھوٹنے کا غم اتنا شدید نہیں تھا لیکن یہاں بازاروں اور انسانوں کے درمیان آنے کے بعد اُس کی شدت کا احساس ہوتا تھا۔

میری زندگی صدموں کا تسلسل ہے، حادثے، سانحے، ہرے کے زخم۔ اتنی ہول ناک زندگی گزارنے کے بعد اب آگے چلا نہیں جاتا تھا۔ کلدیپ کے انکار نے کمر توڑ دی تھی اور مجھ جیسی برداشت اور تحمّل کا آدمی یہ صدمہ برداشت کرنے کی قوّت نہیں پاتا تھا۔ زندگی خالی خالی، سونی سونی اور بے مقصد لگتی تھی۔ نہ ماورائی صلاحیتوں کے عرفان کی انا باقی رہ گئی تھی اور نہ دُنیا و مافیہا کا ہوش ـ تزئین اگر ساتھ نہ ہوتی تو میں کبھی گلبرگہ کا قصد نہ کرتا۔ آدمی کے متعلقین اُسے دُنیا میں گھیرے رکھتے ہیں۔ آدمی اگر تنہا تنہا ہوتے تو تنہائی کا احساس نہ ہوتا۔ بنگلور ایک بہت خوبصورت اور دلکش آب و ہوا کا شہر ہے لیکن میرا جی یہاں نہ لگا اور میں جلد سے جلد اپنی ذمّے داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے گلبرگے روانہ ہو گیا۔

گلبرگے میں رکن الدین کی حویلی تزئین کے اضافے کے بعد
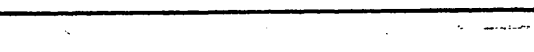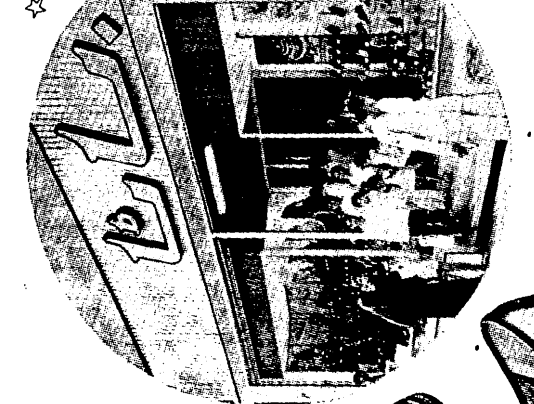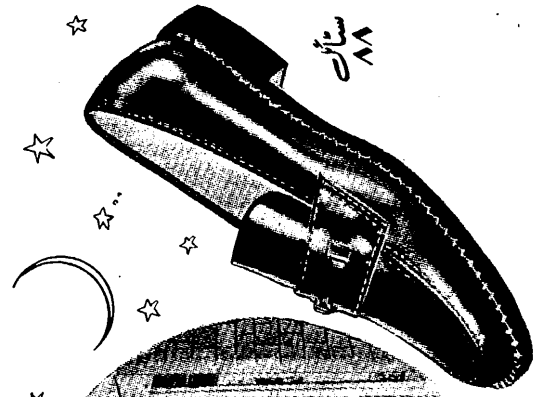
اور پُررونق بن گئی۔ تزئین نے تہذیب و شائستگی کی تعلیم وہاں سیکھی تھی جہاں ایک زمانے میں شرفا اپنی اولاد کو نشست و برخاست کے آداب سکھانے کے لیے بھیجا کرتے تھے۔ سیّد غوث کو تزئین کے حُسن و جمال کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ رکن الدین کی حویلی کی تمام لڑکیوں میں یکتا تھی۔ جب اُس نے غرارہ پہنا! جب اُس نے چھوٹی موری کا پائجامہ پہنا اور گلے میں دوبل کا دوپٹا ڈالا تو دیکھنے والے دیکھتے رہ گئے۔ ناہید، پریم، مالا اور تزئین ایک ساتھ کہیں بیٹھی ہوتیں تو اُن کی شوخیاں، شرارتیں دیکھنے کے لائق ہوتیں۔ سیّد غوث تزئین کی وجہ سے زیادہ تر مردانے میں رہتا تھا، رکن الدین کے سوا میں نے کسی کو یہ نہیں بتایا کہ سیّد غوث اور تزئین کا رشتہ میرے ذہن میں ہے۔

آنند لال کا جاپ ختم ہونے میں چند دن رہ گئے تھے، ادھر میں نے چچا جان کو تار دے دیا تھا کہ تمام بہن بھائیوں کے ساتھ گلبرگہ آجائیں۔ میں نے رکن الدین سے اجازت لے لی تھی کہ میں جہاں ناہید کا رشتہ طے کردوں گا اُسے اعتراض نہیں ہوگا۔ پھر میں نے انکا کو بمبئی میں مقیم پارسی نوجوان سہراب کے پاس بھیجا کہ وہ پریم کے بارے میں اُس کا عندیہ لے اور اگر ممکن ہو تو اُسے پریم کے لیے ہموار کرے۔ انکا کا وجود فاصلوں سے بے نیاز تھا، وہ چھلاوا تھی چنانچہ ایک ہی دن میں سہراب کے دل میں ہلچل مچا کے آگئی۔ پریم اُس سے ایک عرصے سے نہیں ملی تھی۔ گلبرگے آتے وقت بھی اُس نے سہراب کو مطلع نہیں کیا تھا۔ اسے انکا کی کرشمہ سازی کہیے کہ دوسرے دن سہراب رکن الدین کی حویلی کا پتہ پوچھتا ہوا آیا اور پریم کو وہاں دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ میں نے اس نوجوان سے بات کی۔ وہ ایک مہذّب اور آسودہ حال گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ ڈاکٹر سکینہ اور رکن الدین میری کوئی بات مسترد نہیں کرسکتے تھے۔ ڈاکٹر بھی سہراب سے پریم کی شادی کرنے پر آمادہ ہوگیا۔ تیسرے دن چچا جان بھی اپنے مختصر خاندان سمیت گلبرگہ آگئے اور میں نے اپنے چچازاد بھائی کے لیے ناہید کا رشتہ مانگ لیا۔ چچا جان نے ذرا تذبذب کا اظہار کیا لیکن وہ بھی ناہید کی صورت، عادات اور رکن الدین کی حویلی کا تزک و احتشام دیکھ کر تیار ہوگئے۔

پانچویں دن آنند لال کا جاپ ختم ہو رہا تھا، میں اور سیّد غوث اُس کے استقبال کو گلبرگہ شہر سے دور ایک نسبتہً ویران جگہ پہنچے۔ آنند لال دَم سادھے بیٹھا تھا۔ میں سورج غروب ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ سورج غروب ہوتے وقت انکا بیزاری اور اکتاہٹ کے ساتھ میرے سر سے یہ کہتی ہوئی رینگ گئی کہ "جمیل! میرا وقت آگیا ہے، مجھے یقین ہے، آنند لال مجھے فوراً تمھارے حوالے کردے گا۔ ذرا سی دیر کی جدائی ہے۔"

"جاؤ جاؤ۔" میں نے اعتماد سے کہا۔ "وہ بھی اپنا ہی سر ہے۔"

سورج کی آخری کرن کے بعد میں نے منڈل کے اندر جھانک کر دیکھا۔ آنند لال جاپ کے آخری مرحلے میں لرز کر اُٹھا اور اپنا سر ٹٹولتے ہوئے چلّایا۔ "یہ تم ہو انکا دیوی؟ جمیل احمد خاں مہاراج کیسے ہیں؟"

انکا نے میرے بارے میں بتایا ہوگا۔ آنند لال نے دفعتہً مڑ کر دیکھا اور وہیں سے سرپٹ بھاگتا ہوا میرے پاس آیا۔ "میں نے انکا حاصل کرلی ہے۔" وہ اچھل کر بولا۔ "بھگوان جانتا ہے کہ میں نے یہ جاپ تمھارے لیے کیا ہے۔"

میں اس وقت آنند لال کو یہ بتانا نہیں چاہتا تھا کہ انکا چالیس دن پہلے ہی میرے پاس آچکی تھی جب میں نے سرجین کو مار دیا تھا۔ میں نے احسان مندی کے جذبے سے اُس کی پُشت تھپتھپائی۔ پھر ہم تینوں گلبرگہ شہر کی حدود میں داخل ہوگئے۔

"میرے سر پر ایک بوجھ ہے مہاراج! آپ اس بوجھ کے عادی ہیں۔ اسے میری طرف سے اپنے سیوک کا دان سمجھیے۔ میں انکا کو آپ کے پاس بھیج رہا ہوں۔" آنند لال نے چلتے چلتے نیاز مندی سے کہا۔

"رہنے دو آنند لال! انکا تمھارے پاس ہے تو گویا میرے پاس ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"مہاراج! اسے میری طرف سے سویکار کیجیے۔ میں انکا سے دست بردار ہوتا ہوں۔" پھر اس نے انکا سے کہا۔ "میں نے تمھیں آزاد کیا اور جمیل احمد خاں کو دان کیا۔ تم آج سے ان کے اشاروں پر چلا کروگی۔"

انکا فوراً میرے سر پر آگئی، میں نے اُسے سیّد غوث کے پاس بھیج دیا کیوں کہ وہ انکا سے بہت لطف لیتا تھا۔ میں آنند لال کو بھی رکن الدین کی حویلی میں لے آیا اور وہ اُس شب ہماری محفل میں اس طرح شریک ہوا جیسے وہ کوئی گیانی دھیانی پنڈت نہیں ہے بلکہ ایک عام آدمی ہے۔ آنند لال کے جسم پر صرف ایک لنگوٹی تھی۔ میں نے رکن الدین سے کہہ کے اس کے لیے لباس منگوایا۔ رات کا کھانا ہم سب نے ساتھ کھایا۔ پارسی نوجوان سہراب بھی ہمارے ساتھ تھا۔ رکن الدین کی حویلی کسی جشن کا منظر پیش کر رہی تھی۔ جب اتنے بہت سے لوگ فرش پر کھانے کے لیے بیٹھے تو رکن الدین کے پُرمسرت چہرے کی حالت دیدنی تھی۔ وہ میرے مہمانوں کی گراں باری خندہ پیشانی سے جھیل رہا تھا۔ مجھے فکر اور تردّد کی کوئی لکیر اس کے ماتھے پر نظر نہیں آئی۔ چچا جان، میری بہنیں اور بھائی، پریم کے ڈیڈی، پریم، سہراب، سیّد غوث، مالا، آنند لال، رکن الدین کا خاندان، اچھی خاصی بستی آباد ہوگئی تھی۔ صرف میرا دل آباد نہیں تھا۔

میں اپنی داستان اور مختصر کرتا ہوں، وہ فروری کا مہینہ تھا، گلابی جاڑوں کا موسم۔ یوں بھی جنوب کے موسموں میں شدّت نہیں ہوتی۔ فروری کے وسط میں، میں نے ایک ساتھ چار شادیوں کا اعلان کیا۔ یہ مہلت صرف ایک ہفتے کی تھی۔ آنند لال میرے اعلان پر ہکّا بکّا رہ گیا، میں نے کہا کہ مالا آنند لال سے، پریم سہراب سے، تزئین سیّد غوث سے اور جمیلہ اور ناہید میرے چچازاد بھائی سے منسوب کردی گئی ہیں اور ان کی شادیاں چودھویں کی رات، ۱۵ فروری کو رکن الدّین کی حویلی میں ہوں گی۔ اور شادی کے بعد چچا جان اپنی بہو جمیلہ کو لکھنؤ لے جائیں گے، پریم سہراب کے ساتھ بمبئی چلی جائے گی، سیّد غوث کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ گلبرگہ میں رہے یا حیدر آباد میں یا پربھنی کے گھر میں۔ یا پھر آنند لال اور مالا کے گھر، دونوں گھر موجود ہیں۔

میرا اعلان سُن کے انکا نے میرے سر پر اچھل کے تالیاں بجائیں۔ میں نے تخلیے میں رکن الدین سے شادی کے اخراجات کے معاملے میں بات کرنی چاہی، مجھے حیرت ہوئی کہ رکن الدّین نے یہ بات آگے بڑھنے ہی نہیں دی۔ صاف صاف انکار کردیا۔ اس نے ناگواری سے کہا۔ "خاں صاحب! چاروں میری بچیاں ہیں، میں ہی ان کے جہیز کا انتظام کروں گا۔"

میں شادیوں میں سادگی کا قائل تھا لیکن رکن الدّین دھوم دھام سے انھیں رخصت کرنے کی فکر میں تھا۔ رکن الدّین کے اس احسانِ عظیم کا بدلہ میں نے کسی اور طرح اتارنے کا فیصلہ کرلیا اور تنگ آکر اس سے کہا۔ "بھائی جس طرح چاہو کرو۔"

دوسری صبح زور و شور سے شادیوں کی تیاریاں ہونے لگیں۔ سہراب اپنی برات لانے کے لیے بمبئی چلا گیا۔ سُنار بلوائے گئے اور ایک ساتھ تمام زیورات کے چار چار سیٹ تیار کرائے گئے، ملبوسات، فرنیچر اور خانہ داری کی ہر چیز میں رکن الدّین نے یکسانی کا خیال رکھا تھا۔ لڑکیاں اب زنان خانے میں بند رہتی تھیں۔ روزانہ کوئی نہ کوئی رسم ادا ہوتی تھی، باجے گاجے، گیت۔ میں ان رسوم اور شادی کی تیاریوں میں پوری طرح اپنا اشتیاق ظاہر کر رہا تھا لیکن کسی کو معلوم نہیں تھا کہ میرے جسم میں کیسی آگ لگ رہی تھی۔ البتہ سیّد غوث کچھ کچھ جانتا تھا۔ اور کرید کرید کر میرے زخم بھرنے کی کوشش کرتا تھا۔ ادھر کلدیپ ویرانے میں بیٹھی جاپ کر رہی ہوگی، اِدھر تزئین کے ہاتھوں پر مہندی لگ رہی ہے۔ وہ پہاڑی پر اکیلی ہے اور یہاں ہر سمت، ہر جہت ایک دنیا آباد ہے۔

آنند لال کا بھی دُنیا میں کوئی نہیں تھا۔ اس کی طرف سے تمام انتظامات رکن الدّین اور سیّد غوث کر رہے تھے۔ عجیب چہل پہل تھی۔ شادی کی تیاریوں میں روز و شب اُڑے جا رہے تھے، معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ کب صبح ہوئی، کب شام۔ بس وہ سعید ساعتیں چپکے سے آگئیں جب رکن الدین کی حویلی روشنیوں میں نہا گئی اور گہنوں کی لے میں سوز کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ مجھے اپنی زندگی کا ایک باب بند ہوتا نظر آیا۔ انکا کے لیے یہ تمام ہنگامے بے پناہ دل چسپی کا باعث تھے، وہ بار بار میرے سر سے اُتر جاتی تھی اور اِدھر اُدھر پھدکتی پھرتی تھی۔ کبھی گیت سُن رہی ہے، کبھی ملبوسات پر نظریں جمائے ہوئے ہے اور کبھی زیورات پر جھکی ہوئی ہے۔ پریم کے سر پر جاکر اس سے شوخیاں کرنا اور سیّد غوث کے سر پر ناچنا اس کا کام رہ گیا تھا۔ انکا کا پُراسرار وجود جو ہر ماہ انسانی خون کی غذا طلب کرتا تھا، انسانوں کی خوشیوں میں اس طرح شریک تھا جیسے وہ انھی میں سے ایک ہو۔

میں بھی اُن دنوں خود کو بدلا بدلا محسوس کرتا تھا۔ میں نے سیّد کی تلاش میں گلی کوچوں کا رُخ بھی نہیں کیا۔ نہ میں نے ارتکاز میں کوئی لمحہ کھپایا۔ میں ان دنوں مسلسل جاگتا رہا اور زندگی کو قریب سے دیکھتا رہا، زندگی جو مجھ سے رُوٹھ گئی تھی اور جسے بدری نرائن نے مجھ سے چھین لیا تھا۔ بس ایک ہی بوجھ اُتارنا رہ گیا تھا۔

اُس دن رکن الدّین کی حویلی میں چار دولھا اور چار دُلھنیں سجیں۔ پریم کی شادی دو طریقوں سے انجام پائی۔ پہلے ہندو طریقے سے، پھر بمبئی پہنچ کے پارسی طریقے سے۔ آنند لال اور مالا کو منڈپ میں بٹھایا گیا اور

پادری

پاگل خانے کی سیر کر رہا تھا۔ وہاں اس کا ایک ایسے پاگل سے تعارف کرایا گیا جو خدائی کا دعوے دار تھا۔ پادری کی رگِ ظرافت پھڑکی، بولا "جناب! یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے آپ کی مُلاقات کا شرف حاصل ہوگیا۔"

پاگل نے باوقار خاموش مسکراہٹ سے پادری کی بات کا جواب دیا۔

پادری نے کہا۔ "جناب! میں نے سُنا ہے کہ آپ خدا ہیں؟"

پاگل نے جواب دیا۔ "ہاں، میں خدا ہوں۔"

پادری نے ادب سے کہا۔ "جناب! آپ سے ایک سوال کا جواب چاہتا ہوں۔ آپ نے انجیل میں فرمایا ہے کہ میں نے دُنیا کی تخلیق چھ روز میں فرمائی ہے۔ اس چھ سے آپ کی مُراد کیا ہے؟ چھ سال یا چھ صدیاں؟"

پاگل نے شانِ استغنا سے پادری کی طرف دیکھا، اور درشت لہجے میں جواب دیا۔ "بندے! یہ میرا کاروباری راز ہے، میں اس سلسلے میں کچھ بتانے سے معذور ہوں۔"

ہندو پنڈتوں نے ان کے پھیرے لگوائے، پھر ناہید کا نکاح ہوا اور سب سے بعد میں تزئین کا نکاح پڑھا گیا۔ اسی شب رکن الدین نے ایک شان دار ضیافت کا اہتمام کیا اور میں نے پریم، مالا، تزئین اور جمیلہ کو گلے لگا لگا کر رخصت کیا۔ رکن الدین کی حویلی کے مختلف کمرے حجلہ ہائے عروسی کے طور پر سجا دیے گئے تھے۔ یہ ایک دلخراش اور رجاں کاہ منظر تھا۔ میں اُس رات حویلی میں نہیں سویا، باہر نکل گیا اور گلبرگہ کی گلیوں میں بے مقصد گھومتا رہا۔ حضرت گیسو دراز کی درگاہ قریب ہی تھی، دل چاہا وہاں چلا جاؤں۔ پھر سوچا کسی کا ہاتھ تھامے بغیر کیسے جاؤں؟ سستانے کے لیے ایک جگہ بیٹھ گیا۔ آج تھکن کا احساس کچھ سوا ہو گیا تھا۔

میں بیٹھے بیٹھے ماضی میں پہنچ گیا اور اُس وقت چونکا جب کسی نے میری پشت پر لاٹھی سے ضرب لگائی۔ میں کراہ کر اٹھا۔ میرے سامنے سیّد مجذوب کھڑا تھا۔ میں نے اِس بار کسی تجسّس اور تڑپ کا اظہار نہیں کیا۔ صرف سر جھکا لیا۔

”کیا سوچتا ہے دیوانے؟“ سیّد نے ہنکار بھری۔

”کچھ نہیں سوچتا ہوں، اب کیا رہ گیا ہے۔“ میں نے آہستگی سے کہا۔

”ورزش کر اور دوبارہ دوڑ لگا۔“ سیّد نے قہقہہ لگایا۔

”اب پیروں میں دم نہیں رہا۔ برف جم گئی ہے۔“

”انگیٹھی جلا اور شعلوں کے سامنے ناچا کر۔“

”مجھے پریشان کیوں کرتے ہو؟“ میں نے سرد مہری سے کہا۔ ”منزلیں کھو گئی ہیں۔ تم ملتے ہو تو اور تنگ کر دیتے ہو۔ یہ کیا مذاق ہے؟“

”ڈگڈگی بجا، جنتر منتر، چھو منتر، کوٹھے پر چڑھ جا، نیچے طغیانی ہے، مسخرے اس وقت اور مزہ آئے گا۔“ سیّد نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”جاؤ، اپنا راستہ سنبھالو۔ میرا کھیل ختم ہونے کو ہے۔“

”ابھی تو شروع ہوا ہے گندم کے محتاج! جسم کا برتن مانجھ۔“

”برتن ٹوٹ گیا ہے۔“ میں نے بے دلی سے کہا۔

”قلابازی کھا۔ ڈال ڈال، پات پات۔“ سیّد مجذوب اسی طرح کے معنی خیز جملے ادا کرتا رہا۔ آخر میں نے کچھ پوچھنا ہی بند کر دیا۔ میں سر جھکائے سیّد کے جانے کا منتظر رہا۔ آج سیّد کی باتیں بھی مجھے بری لگ رہی تھیں۔ رات ڈھل رہی تھی۔ سیّد میرے خاموش ہوتے ہی چلا گیا۔ وہ چلتے چلتے کہہ گیا تھا۔ ”مٹی میں سر دے کے اُلٹا کھڑا ہو جا۔ یا ہُو۔ یا حق۔“

اُس کے جانے کے بعد میں ڈگمگاتا ہوا اُٹھا اور زمین پر گرتے گرتے بچا۔ میری ساری توانائی جیسے زائل ہو گئی تھی۔ میں نے بہ مشکل خود کو چلایا اور لڑھکتا ہوا رکن الدین کی حویلی میں داخل ہو گیا۔ حویلی کی روشنیاں بجھ چکی تھیں۔ میں اپنے کمرے میں جا کر بے سدھ پڑ گیا۔ انکا شام ہی سے میرے سر پر نہیں تھی۔

تیسرے دن رکن الدین کی بھری پُری حویلی اجاڑ ہو گئی۔ تزئین، سیّد غوث، پریم، سہراب، آنند لال اور مالا بمبئی روانہ ہو گئے اور چچا جان اپنی بہو اور بیٹے کے ساتھ لکھنؤ چلے گئے۔ سب نے مجھے ساتھ چلنے کے لیے مجبور کیا لیکن میں رکن الدین کی حویلی ہی میں ٹھیرا رہا۔ حویلی کے در و بام رو رہے تھے۔ رکن الدین کا ہمیشہ مسکراتا ہوا چہرہ بھی اداس ہو گیا تھا۔ یہ لوگ چلے گئے تو میں اپنے کمرے میں گوشہ نشین ہو گیا۔ اب رکن الدین کی حویلی کی طرح میرا دل بھی ویران تھا۔ انکا موجود تھی لیکن میری حالت دیکھ کر وہ بھی خاموش تھی۔

میں کوئی ایک ہفتے تک کس مپرسی کے عالم میں گرفتار رہا اور پھر ایک رات رکن الدین سے کچھ کہے بغیر گلبرگہ سے روانہ ہو گیا۔ میں اگر رکن الدین سے کہتا تو وہ مجھے کبھی اجازت نہ دیتا، کسی نہ کسی طرح روک ہی لیتا۔

میری منزل کہاں تھی؟ میری کوئی منزل نہیں تھی۔ میرے سر پر انکا تھی۔ میرے ارد گرد زندگی تھی۔ میں نندا کی تربیت اور اپنی ریاضت اور اپنے ارتکاز کے سبب ایک غیر معمولی آدمی تھا۔ میں نے انکا سے پوچھا۔ ”کچھ بتاؤ تو بدری نرائن کہاں ہے؟“

”الہ آباد میں ہے۔“ اُس نے کہا۔

میں الہ آباد کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں انکا نے مجھ سے کہا۔ ”اب اُس طرف جانا بے کار ہے۔ وہ بنارس چلا گیا ہے۔“

میں بنارس کی طرف چل پڑا۔ بنارس پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ وہ پٹنے کی طرف فرار ہو گیا ہے۔ میں پٹنے کی طرف چلا گیا پھر لکھنؤ آ گیا، اور لکھنؤ آیا تو میری نظر نواب بنّن علی کی بڑی حویلی کی طرف اُٹھ گئی جہاں زر افشاں اور درخشاں رہتی تھیں۔

جمیل احمد خان کی اس حیرت انگیز پُراسرار سرگزشت کی چند کڑیاں باقی رہ گئی ہیں۔

آسمان بادلوں سے گھر گیا تھا۔ برسات کا موسم تو کب کا شروع ہو چکا تھا لیکن ہمارے ہاں بارش دیر سے شروع ہوتی ہے تقریباً جولائی کے وسط میں، وہ دن بھی آگئے ہیں۔ آج صبح سے گرمی کی کوئی حد نہیں ہے اور اس پہ بادلوں سے گھرا آسمان! میری طرح چھپرا کو بھی یہ اندیشہ ہوا کہ یقیناً ابھی بارش شروع ہو جائے گی، اسی لیے آواز دے کر اس نے کہا۔ ”کھانا کھا کر جلدی آفس پہنچ جائیے بارش ہو گئی تو

ہندوستان کی جدید کہانیوں میں سے ایک اچھوتی اور حساس کہانی ★ رسیک مہتا ★ علی حیدر ملک

بھیگتے ہوئے جانا پڑے گا۔"
میں دو لقمے جیسے تیسے کھا کر جلدی سے زینے اُتر گیا لیکن دروازے کے پاس آتے ہی میری رفتار رُک گئی۔ گھر کے چبوترے کے پاس لوگوں کا ایک چھوٹا سا مجمع اکٹھا ہو گیا تھا۔ سبھی گھیرا ڈال کر کھڑے تھے۔ میں نے دھیمے لہجے میں سوال کیا۔ "کیا ہے؟"

چوٹی کی گرہ باندھتے اور بار بار گچھا سنبھالتے ہوئے شیو شنکر نے جواب دیا۔ "اور کیا ہوگا آج کے زمانے میں؟"

"لیکن ہے کیا؟"

"کوئی اپنا پاپ چھوڑ گئی ہے چبوترے پر۔" پھر وہ فوراً بھیڑ میں اپنا سر لے جاتے ہوئے بولا۔ "ہرے ہرے ہرے ہرے! سچ مچ کل جگ آگیا ہے۔"

جیسے کل جگ چھوڑ کر اور کسی زمانے میں حرامی بچے پیدا ہی نہ ہوتے ہوں! آفس جانے کی جلدی بھول کر میں نے بھی گردن اُوپر کی۔ دیکھا تو چبوترے پر بیچوں بیچ سفید پوٹلی کی طرح کچھ پڑا ہوا ہے۔ قریب کھڑی ہوئی منّو نے جگہ بنا دی تاکہ میں گھیرے میں جا سکوں۔ اس نے ہنستے ہنستے کہا۔ "دیکھو تو سہی تارک بھائی کیسا اچھا ہے، ہے نا؟"

بچہ اُسے نہ جانے کیوں اچھا لگا حالانکہ نومولود خوبصورت ہوتے ہوئے بھی خوبصورت دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اتنے میں پاپنی ماں نے گہری نظروں سے اسے دیکھنے کے بعد اپنے تجربے کا ثبوت فراہم کیا۔ "ابھی کا نہیں ہے۔ کوئی بیس پچیس دنوں کا لگتا ہے بلکہ ایک ماہ کا بھی ہو سکتا ہے۔" مجمع میں سے کسی نے پاپنی ماں کے قیاس پر چبھتی لی۔ "پاپنی ماں! تم اکیلی ہو، لے جاؤ نا اس بچے کو......"

"نہیں رے بھیّا! پرایا پاپ سنبھال کر میں جھمیلے میں کیوں پڑوں؟" وہ اس ڈر سے پیچھے ہٹ گئی کہ شاید سچ مچ اُس پر بچہ سنبھالنے کا بوجھ آ پڑے۔

"لیکن پھر اب اِس کا کیا کیا جائے؟"

پھر سے چوٹی سنوارتے ہوئے شیو شنکر بولا۔ "ابھی پولیس آئے گی اور اسے لے جا کر کسی یتیم خانے میں چھوڑ دے گی۔ ہمیں کیا؟"

"لیکن پولیس کو کوئی خبر تو کرے، آج بادل بھی کیسے گھرے ہوئے ہیں، اگر بارش آ دھمکی تو...... بیچارا!"

"ہاں، بیچارا......" اور میری نظریں بھی ایک ٹک اسی بیچارے پر ٹھہر گئی تھیں۔

بھورے بھورے نرم بالوں والا چھوٹا سا سر، گندھے ہوئے کچے میدے کی طرح نرم اور ٹمٹماتی ہوئی دو گول آنکھیں!

جھک جھک کر دیکھتے ہوئے لوگوں میں سے کسی کا سایہ ان آنکھوں پر پڑتا تو دونوں آنکھیں کھل جاتیں لیکن سایہ ہٹ جانے پر آسمان کی روشنی برداشت نہ ہو سکنے کے باعث فوراً مُند جاتیں۔ میں نے بھی ایک آدھ بار جھک کر اُسے ٹھیک سے دیکھ لیا۔ سفید چادر کی ایک مضبوط گٹھڑی تھی، منہ چھوڑ کر کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ دو تین موٹے کپڑوں میں اچھی طرح لپیٹ کر اُسے رکھا گیا ہے اور حیرت تو اس بات پر تھی کہ بچہ روتا بھی نہیں۔

اُوپری منزل سے آئی ہوئی رتن کاکی نے بھی اس کے چھوٹے سے منہ پہ جھک جھک کر ناک نقشے کا تجزیہ کرنے کے بعد اظہارِ خیال کیا۔ "معلوم ہوتا ہے ماں نے خوب دودھ پلا کر رکھا ہے، دیکھو نا! کب سے پڑا ہے لیکن کہیں رونے کا نام لیتا ہے؟" پھر لوٹتے ہوئے اس نے ہمدردی کے لہجے میں کہا۔ "میں دودھ میں روئی بھگو کر لے آؤں، منہ میں رکھے تو سہی، بیچارا بھوکا ہوگا۔"

وہ اُوپر چلی گئی۔ میری نگاہ بھی اُوپر گئی۔ چھپرا ہاتھ پر ٹھوڑی ٹیکے کھڑکی میں کھڑی تھی۔

اتنی اُونچائی سے بھی اس کی پیاسی آنکھیں ایک ٹک ہو کر بچے پر ٹھیری ہوئی تھیں۔ اُس کے اُداس چہرے پر اُداسی کے ساتھ ساتھ ہمدردی کا چشمہ اُبل پڑا تھا۔ اچانک میری طرف دھیان آنے پر وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"ابھی یہیں کھڑے ہیں؟ دیر نہیں ہو رہی؟"

مجھے ہوش آیا۔ گھڑی کی طرف دیکھا تو ساڑھے دس بج چکے تھے۔ جلدی سے لیفٹ رائٹ کرتا ہوا مشکل سے بیس منٹ میں آفس پہنچا۔ دروازے پر قدم رکھتے ہی چپڑاسی نے کہا۔ "صاحب آپ کو بُلا رہے ہیں۔"

میں حاضری کے رجسٹر پر دستخط کرنے سے پہلے ہی جلدی سے اُوپر انٹونی صاحب کے کیبن میں داخل ہوا۔ انٹونی صاحب محکمۂ آب پاشی کے چیف انجینئر تھے، گزشتہ دس برسوں سے میں ان کے ماتحت اوورسیر کا کام کر رہا تھا۔ ڈیڑھ سو روپے سے نوکری شروع کی تھی، اب تنخواہ بھی تین سو روپے ہو گئی تھی، زیادہ تر باہر کے ترقیاتی کاموں کی دیکھ بھال کرنی ہوتی تھی۔ اس لیے آفس اٹینڈ کرنا بہت کم نصیب ہوتا تھا۔ صاحب کا بھی دوسروں کی بہ نسبت میرے ساتھ بہتر سلوک تھا۔ اس لیے ذمے داری والے خاص کام مجھی کو سپرد کیے جاتے تھے۔ آج بھی ایسا ہی کوئی خاص کام ہوگا۔ یہ سوچ کر میں چپ چاپ ٹیبل کے قریب کھڑا رہا۔ صاحب فائیل دیکھ رہے تھے۔ کسی کاغذ کی تلاش تھی۔ فائیل دیکھتے ہوئے انھوں نے کہا۔ "بیٹھو۔" کچھ دیر بعد کاغذ مل جانے پر انھوں نے باہر نکالا اور میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ارے بھئی! نانگول کے لوگوں کی طرف سے موصول ہونے والی درخواست کی بات تو ہم بھول ہی گئے۔"

ان کے ہاتھ میں وہی درخواست تھی۔ کچھ جھجک محسوس کرتے ہوئے میں نے کہا۔ "ہاں! لیکن اُسے تو ایک برس بیت گیا۔"

صاحب ہنستے ہوئے بولے۔ "ہاں لیکن ایک سال میں بھی تو جانچ کرنا ہماری ڈیوٹی ہے۔ یا نہیں؟" اتنا کہہ کر انھوں نے وہ کاغذ میرے ہاتھ میں دے دیا۔

بات یہ تھی کہ ایک آدھ سال پہلے نانگول کے پاس ایک بڑا تالاب بنایا گیا تھا۔ تالاب بن جانے کے بعد گاؤں کے لوگوں کی طرف سے درخواست آئی کہ تالاب کے تعمیری کام میں ٹھیکے دار نے گڑبڑ کی ہے اور سیمنٹ اور لوہے کی چھڑوں کی بجائے بنیاد میں مٹی بھر دی ہے اس لیے بارش ہونے پر اگر بند ٹوٹ گیا تو گاؤں پر آفت آ جائے گی۔

یہ درخواست موصول ہونے کے بعد بند کا معائنہ کرنے کے لیے صاحب نے مجھے نانگول بھیجا تھا لیکن اس سے پہلے کہ میں وہاں جا کر معائنہ کروں برسات شروع ہو گئی۔ تالاب چھلکنے سے پہلے ہی بند ٹوٹ گیا۔ بند ٹوٹنے سے یہ تو ثابت ہو ہی گیا تھا کہ تعمیر کا کام ٹھیک سے نہیں ہوا پھر بھی ٹھیکے دار نے اپنی مدافعت میں کہا۔ "تعمیر کا کام چل رہا تھا کہ اسی وقت بارش ہو جانے سے بند ٹوٹ گیا۔ ویسے بنیاد میں تو ایگریمنٹ کے مطابق سیمنٹ اور لوہے کی چھڑیں کافی بھری گئی ہیں۔"

اُس وقت ٹوٹے ہوئے بند کی بنیاد پر تقریباً پچاس فیٹ پانی تھا۔ اس لیے معائنہ کرنا ممکن نہیں تھا۔ آخر یہ طے پایا کہ پانی سوکھنے پر معائنہ کیا جائے، پانی تو کب کا سوکھ چکا ہوگا لیکن معائنے کی بات بھلائی جا چکی تھی، آج اچانک صاحب کو وہ بات یاد آ گئی تھی، وہ کھڑکی سے آسمان کی طرف دیکھ کر بولے۔ "سالا! کسی نے یاد بھی نہیں کیا۔ بارش تو آج کل میں ہونی چاہیے۔"

میں نے کہا۔ "ہاں شاید آج ہی ہو گی۔"

انٹونی صاحب ایک دم چٹکی بجا کر بولے۔ "تم ابھی نانگول جاؤ۔ ضرورت ہو تو کچھ لوگوں کو مدد کے لیے لیتے جاؤ۔ اس سے پہلے کہ پھر سے بارش ہو اور بند ڈوب جائے معائنے کی پوری رپورٹ حاضر ہونی چاہیے۔"

میں نے چونک کر کہا۔ "لیکن صاحب! آج ہی بارش ہو گئی تو؟"

"بارش ہوتے ہی تالاب نہیں بھر جائے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دو تین روز بارش نہ ہو۔ اگر ایسا ہوا تو معائنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہو گی۔"

میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "اچھا! میں ابھی گھر جا کر بیگ لے آتا ہوں۔"

صاحب! سر ہلا کر بول اُٹھے۔ "نہیں نہیں تمھیں گھر جانے کی ضرورت نہیں، ایک ایک منٹ قیمتی ہے۔ یہاں سے جیپ لے کر سیدھے بند کے لیے روانہ ہو جاؤ۔ میں تمھارے گھر آدمی بھیج رہا ہوں، وہ دوسری گاڑی سے تمھارا سامان لے کر تمھیں بند پر ملتے آئے گا۔" اور ہنستے ہنستے کہنے لگے۔ "وہاں پہنچتے ہی آج آپ کو کپڑے وغیرہ کی ضرورت تھوڑی پڑے گی؟"

زیادہ حجت کی گنجائش نہیں تھی، اسی وقت میں کچھ لوگوں کو لے کر بند کے لیے روانہ ہو گیا۔ صبح سے گھِر گھِر آنے والے بادل دوپہر تک برسے بغیر ہی بکھر گئے تھے، شام کو تو ہوا بھی ایسی چلی کہ فوراً بارش ہونے کا امکان ختم ہو گیا، لگتا ایسا ہی تھا۔

میں نے ساتھیوں کو ہدایت دی۔ "گاؤں سے مزدوروں کو بلوا کر بنیاد کھدوانے کا کام شروع کراؤ۔"

کچھ ہی دیر میں کام شروع ہو گیا۔ میں نے مزدوروں کو دُگنی مزدوری دینے کا لالچ دے کر رات کو بھی کام جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔

ویسے تو کام کی جگہ مجھے موجود رہنا چاہیے تھا لیکن آج میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی، چین نہیں پڑتا تھا۔ اس لیے معاون کو دیکھ بھال کا کام سونپ کر میں تالاب کے کنارے چلا گیا۔ ڈھلتی ہوئی شام کے دھندلکے میں سوکھا ویران تالاب کھانے کو دوڑتا تھا۔ کنارے پر جا کر میں نے کچھ دیر چہل قدمی کی۔ پھر ٹھیکے دار کے نوکروں کے لیے بنائے جانے والی ہیترے کی جھونپڑی میں جا کر ایک بوری پر لیٹ گیا۔

رہ رہ کر نوزائیدہ بچے کا وہی بن کھِلے پھول جیسا چہرہ نظروں کے سامنے تیر رہا ہے اور چھپرا کی آنکھوں کی بے چین پیاس! شادی کو سات برس بیت گئے تھے اور چھپرا کو بچہ نہیں ہوا تھا۔ اور اب ہونے کی اُمید بھی نہیں رہی تھی۔ پوری جانچ کے بعد ڈاکٹر نے کہہ دیا تھا۔ "رحم کا منہ چھوٹا ہے اگر آپریشن سے اُسے چوڑا کیا جائے تو حمل کا امکان ہے لیکن ولادت کے وقت خطرہ ہو سکتا ہے، شاید پیٹ چیر کر بچہ نکالنا پڑے اور ایسے میں زچہ کے لیے جان کا خطرہ......!" بہت مشکل سے چھپرا کو سمجھا بجھا کر آپریشن کا خیال ترک کروایا گیا۔

اس کے بعد سے چھپرا کی اولاد کی تمنا خاموشی کے پنجرے میں قید ہو گئی۔ اس کی بے چین ممتا محبت آمیز زوجیت میں تبدیل ہو گئی اور اب تو ان دونوں عناصر کے درمیان خطِ تقسیم کھینچنا بھی دشوار معلوم ہوتا ہے۔ اس نے اپنی ساری توجہ مجھ پر مرکوز کر دی ہے۔ وہ میری دیکھ بھال اس طرح کر رہی ہے جیسے میں اس کا شوہر نہیں، بچہ ہوں۔ اس نے میرے ساتھ بیوی کی محبت سے زیادہ ماں کی شفقت کا سلوک شروع کر دیا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ کچھ کھو کر کچھ حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہے اور یہی بات کبھی کبھی مجھے تکلیف پہنچاتی ہے۔ ایک بچہ اس کے ہاتھوں میں سونپ دوں، کئی بار یہ خیال بھی آیا کہ یتیم خانے سے ایک صحت مند خوبصورت بچہ لا کر......

ایک بار تو ڈرتے ڈرتے میں نے چھپرا سے یہ بات کہہ بھی دی لیکن ذرا بھی خفا ہوئے بغیر اس طرح ہنس کر جیسے میرا مذاق اُڑا رہی ہو، اس نے جواب دیا۔ "واہ! پرائے کبھی اپنے ہو سکتے ہیں؟ میری بات اور ہے،

مولانا رومی

مولانا رومی نے کسی مقام سے گزرتے ہوئے دو آدمیوں کو لڑتے دیکھا، ان میں سے ایک کہہ رہا تھا۔ "او لعین نابکار تو ایک کہے گا تو جواب میں دس سُنے گا!"
مولانا رُومی رُک گئے، کہنے لگے۔ "دوست تجھے جو کچھ کہنا ہے مجھے کہہ لے، کیونکہ تو اگر ہزار کہے گا تو مجھ سے ایک بھی نہ سُنے گا!"

چاہیے جو کچھ ہو لیکن میں عورت ہوں گود میں بچّہ دیکھ کر ماں ممتا بیدار ہوئے بغیر نہیں رہے گی لیکن آپ؟ خون کے رشتے کے بغیر آپ کی شفقت اُس کی طرف کیسے ملتفت ہو گی؟ بات بھی صحیح تھی۔ اس کے بعد میں نے یہ خیال ترک کر دیا پھر اس طرح کا خیال کبھی نہیں آیا کبھی بھول کر بھی میں نے چھپرا کو اندرونی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا لیکن نہ جانے کیوں آج ایک بے سہارا بچّہ دیکھ کر اور اس کا چہرہ تکتی ہوئی چھپرا کی ان پیاسی نظروں سے ڈھلنے والی خاموش آواز سن کر......

آفس جاتے وقت راستے میں بھی مجھے یہی خیال آ رہا تھا کہ ایک بار لوٹ کر چھپرا سے کہہ دوں "پرماتما نے تیری خالی گود بھرنے کے لیے گھر بیٹھے ہی..." لیکن ہمت نہ ہوئی۔ شاید چھپرا اسے اپنی توہین سمجھ لے شاید ممتا سے عاری عورت کی زندگی بے کار سمجھ کر......

فطرتاً وہ جتنی شفیق ہے اُتنی ہی غصّہ ور بھی اگر کوئی غلط معنی نکال لے تو کیا ہو گا؟ اسی تصور سے میں کانپ گیا۔ اس وقت بھی اسی خوف کے مارے میں نے دل ہی دل میں دُعا کی "پولیس آکر اسے اُٹھا لے گئی ہو تو اچھا ہے۔"

آسمان سے اندھیرا اُتر رہا ہے کنارے کی ٹیکری کے نیچے والی سڑک سے ٹرک کے ہارن کی آواز آئی باہر نکل کر دیکھتا ہوں تو سب سامان لے کر ٹرک آ پہنچا ہے یہاں کھانے کا انتظام ممکن نہیں تھا اس لیے آفس کی طرف سے تیار ٹفن آ چکے تھے ساتھ ہی چائے پانی کا سامان بھی تھا۔ دو تین پٹرومیکس اور میرا بیگ بستر بھی آ گیا تھا۔

ٹیکری پر آ کر ایک شخص بیگ بستر رکھ گیا۔ کچھ دیر بعد نیچے جا کر میں نے پٹرومیکس کی روشنی میں جاری کام پر نظر ڈالی۔ پھر انھی لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر وہی کھانا کھایا اور ایک لڑکے سے کہا "ایک آدھ گھنٹے بعد چائے بنا کر اُوپر دے جانا۔"

نیند آنے لگی لیکن رات بھر جاگنا ضروری تھا۔ پھر بھی کچھ دیر لیٹنے کے خیال سے میں نے بستر کھول لیا۔ بستر کھولتے ہی اُوپر رکھی ہوئی نئی شال کا قرمزی رنگ آنکھیں چکا چوند کر گیا۔ بیوی کو شوہر کی خدمت کا کتنا گہرا خیال ہے؟ گرمی میں شال کی کوئی ضرورت نہیں تھی لیکن شاید بارش ہو جائے، ٹھنڈک لگے اور......

پچھلے برس بھی میں تقریباً انھی دنوں میں یہاں آیا تھا اور میرے علم کے بغیر ہی چھپرا نے بستر میں شال رکھ دی تھی، وہ شال جس کے کنارے پر چھپرا نے خود بیل بوٹے کی ہفت رنگی کشیدہ کاری کی تھی اور وہ شال میں نے کھو دی تھی، پھر چھپرا نے نئی شال خریدی اور اس کے کنارے پر بھی ویسی ہی کشیدہ کاری شروع کی مگر یہ کشیدہ کاری ادھوری تھی، صرف سرے پر تھوڑی سی جگہ میں کشیدہ کاری ہو پائی تھی مگر اس کے ساتوں رنگ میرے سامنے نہیں رہے تھے، گمبھیر تاریکی میں ڈھیر ڈھیر کے ایک کے بعد ایک سب کچھ نگاہوں میں تیر رہا تھا۔ تقریباً یہی دن تھے ٹھیکے دار کے خلاف ناگول کے لوگوں کی شکایتی درخواست...... خود معائنہ کرنے کے لیے انڑنی صاحب کی ہدایت...... وہ گمبھیر اندھیری رات اچانک ہونے والی بارش......
اُوپری حصّے میں بارش ذرا پہلے شروع ہوئی ہو گی، اس لیے جو ندی نالاب میں موڑی گئی تھی، اُس ندی میں اچانک سیلاب آ گیا۔ کھدائی کے لیے آئے ہوئے مزدور کدال پھاوڑے لیے جان بچا کر بھاگے، صرف میں تنہا رہ گیا میں اس طرف تھا اسی ٹیکری پر اور اب اُس پار نہیں جا سکتا تھا، یہ جگہ بھی محفوظ نہیں تھی، ہر لمحے پانی بڑھ رہا تھا اور ٹیکری کے دھنسنے یا ڈوب جانے کا قوی امکان تھا اگر ٹیکری کے آس پاس پانی پھیل جاتے تو کہیں بھی نہیں جایا جا سکتا۔ بڑی دیر تک بھیگتے رہنے سے میں یہیں ٹھٹھر گیا تھا لیکن آخر ٹیکری چھوڑ کر کسی محفوظ مقام تک جانے کا فیصلہ کرنا پڑا۔

بارش کے ساتھ ساتھ سنسناتی ہوئی ٹھنڈی ہوا بھی اتنی ہی قاتل تھی، میں نے بستر سے شال نکال کر جسم پر لپیٹ لی۔ پھر بقیہ سامان یہیں چھوڑ کر ٹیکری کے دوسرے کنارے اُتر پڑا۔ زوروں سے برستی ہوئی بارش میں بھیگتا ہوا کی تیز سی سنسناہٹ میں تھر تھر کانپتا میں گھٹنوں تک پانی میں آگے بڑھا۔ پیروں تلے، پانی میں ڈوبے کھیتوں کی پھولی ہوئی مٹی والی چکنی زمین تھی اور اُوپر گھنگھور آسمان۔ بیوہ کے لباس کی طرح سیاہ بادلوں کے گھٹا ٹوپ اجتماع نے سب کچھ تاریک کر دیا تھا۔ ناگول گاؤں اور راستہ کس طرف چھوٹ گیا ہے اس کا مجھے خیال نہ تھا میں آنکھیں موندے لڑکھڑاتے قدموں سے نہ جانے کب تک چلتا رہا؟ ایک آدھ گھنٹے بعد پیر پانی سے بہ مشکل باہر نکلے، فضا میں بار بار چمکتی ہوئی بجلی کی لمحاتی مگر تیز روشنی میں میں نے اپنا تو دیکھ

لیا کہ زمین گیلی ہونے کے باوجود پانی کی مقدار زیادہ نہیں تھی، بارش کم ہو گئی تھی۔ بے ہوش ہو کر گر پڑنے میں ذرا بھی دیر نہیں تھی کہ پانی سے باہر آ جانے کے باعث مجھ میں ہمت پیدا ہوئی۔

چہرے سے پانی پونچھ کر میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی، دور کچھ اونچائی پر ایک مدھم چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ بارش کی دھار چیر کر میری بے چین آنکھوں نے اس کی روشنی پکڑ لی۔ زیادہ غور و فکر کیے بغیر میں مٹھیاں باندھ کر اس سمت میں دوڑا۔

سطح زمین سے کچھ اونچائی پر وہ بھی ٹیکری جیسی ہی جگہ تھی، بلندی پر چڑھتے ہوئے سانس پھول گئی۔ ناک تک آ جانے والے دم کے صرف باہر نکلنے کی دیر تھی کہ مجھے خیال آیا میں کسی جھونپڑی کے دروازے کے پاس کھڑا ہوں، ایک لمحے بھی رکے بغیر میں نے دروازے پر زور زور سے مکیاں ماریں۔ پترے کا دروازہ بج اٹھا۔ وہ بجتا رہا اور اندر سے کسی کی چونکی ہوئی آواز آئی "کون ہے رے؟"

آواز چونکی ہوئی ہونے پر بھی تیز تھی۔ شعور کند کر دینے والی اس جسمانی پریشانی میں بھی مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ نازک آواز کسی عورت کی ہے۔ میں لگاتار مکیاں مارتے ہوئے بے چینی سے چیخا "کھولو کھولو مسافر ہوں بارش میں راستہ بھول کر پریشان ہو گیا ہوں۔"

دو چار لمحوں بعد دروازہ کھل گیا۔ ٹمٹماتا ہوا چراغ ہاتھ میں لیے ایک دوشیزہ دروازے میں کھڑی تھی، اس کے خوبصورت چہرے پر تیرتے ہوئے اندیشے اس ٹمٹماتے چراغ کی روشنی میں بھی میری نظروں سے اوجھل نہ رہے۔ میں نے عجیب بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "گھبراؤ مت کچھ دیر کے لیے سہارا دے دو ممنون ہوں گا۔ بارش رکتے ہی چلا جاؤں گا۔"

وہ ایک لمحے تک میری طرف تکتی رہی پھر ذرا پیچھے ہٹی اور آہستہ سے کہنے لگی "آیئے!"

میں سُرعت قدموں سے اندر داخل ہو گیا۔ اس نے دروازہ بند کر دیا۔

ٹوٹے ہوئے دروازے والی کھڑکی کے قریب والی کھونٹی پر اس نے چراغ ٹانگ دیا اور پھر کمر پر ہاتھ رکھ کر میرا پانی سے شرابور جسم غور سے دیکھنے لگی۔ میں نے کھڑے کھڑے چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ جھونپڑی پترے کی تھی اور کافی بڑی تھی۔ نیچے اینٹیں رکھ کر زمین پکی کی گئی تھی لیکن بیچ میں سیمنٹ نہ ہونے کے باعث نمی اوپر آ رہی تھی۔ میں نمی کی طرف دیکھے بغیر نیچے بیٹھ گیا۔

میری خستہ حالی نے اس کے چہرے کے اندیشے بکھیر دیے تھے۔ ملائم لہجے میں وہ پوچھنے لگی "کہاں سے آ رہے ہیں؟"

میں نے جسم کے اکڑے ہوئے اعضا ہلاتے ڈلاتے ہوئے ٹوٹی آواز میں کہا "ابھی کچھ بتانے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ ذرا تکان ختم ہونے دو۔" اتنا ہی بولنے میں میری سانس پھول گئی۔

اس نے فکرمند لہجے میں کہا "بہت بھیگ گئے ہیں نا، کپڑے تبدیل کریں گے؟"

میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کھانستے ہوئے کہا "کپڑے۔ لیکن کپڑے ہیں کہاں؟"

"ٹھہریے" وہ سامنے والے کونے میں چلی گئی۔ کونے میں ایک چارپائی پڑی تھی، نیچے سے ٹوٹا پھوٹا ٹرنک کھینچ کر اس نے ایک کپڑا باہر نکالا اور اسے میری جانب بڑھاتے ہوئے بولی "گیلے کپڑے اتار کر اسے لپیٹ لیجیے۔"

بغیر بورڈر کی سفید موٹی ساڑی۔۔۔! اس وقت وہ شال دوشالے سے بھی زیادہ قیمتی تھی، اٹھنے کی ہمت نہیں تھی پھر بھی دیوار کا سہارا لے کر انتہائی کوشش کے بعد میں کھڑا ہو گیا۔ میں نے ساڑی لنگی کی مانند جسم پر لپیٹ کر کپڑے اتار دیے۔ شال، قمیص، پینٹ، بنیان سب کچھ۔ کپڑوں سے ٹپکتے ہوئے پانی سے زمین تر ہو گئی تھی، میں پھر سے نیچے بیٹھ رہا تھا کہ اس نے ہاتھ پکڑ کر کہا "ادھر آیئے۔ چارپائی پر بیٹھیے۔"

چارپائی پر میلا بستر بچھا ہوا تھا۔ میں اس پر گرنے ہی والا تھا

★☆★☆★☆★☆★☆★☆★☆★☆★☆★☆★☆★☆★☆

کر اس نے کہا "ٹھیریے!" پھر اس نے صندوق میں سے ویسی ہی دوسری ساڑھی نکال کر بستر پر بچھا دی پھر پُرسکون ہو کر کسی قدر خوشی کے لہجے میں بولی "اب آرام سے لیٹیے!"

میں لیٹ گیا۔ اس نے پھر سے دروازہ کھولا اور دروازے میں کھڑی ہو کر تمام کپڑے نچوڑ کر اندر بندھی ہوئی رسّی پر ڈال دیے، پھر گیلے ہاتھ پونچھتے ہوئے بولی "لیجیے، آپ کی پتلون کی جیب سے یہ بٹوا نکلا ہے۔"

روپے کا پرس۔ لگ بھگ دو سو روپے تھے لیکن اس وقت اسے سنبھالنے کا ہوش کہاں تھا؟ میں نے سینے کے بل لیٹے لیٹے کہا۔ "اپنے پاس رکھو، جاتے وقت لے لوں گا۔"

پرس اُس نے صندوق میں رکھ دیا اور صندوق چارپائی کے نیچے کھسکا دی کچھ دیر بعد سر اُٹھا کر دیکھتا ہوں تو وہ گیلی زمین پر ٹاٹ بچھا کر چپ چاپ بیٹھی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے منہ پھیر لیا۔ بڑھتی ہوئی سانس کے ساتھ پیدا ہونے والی کھانسی اور بہتی ہوئی ناک......

اچانک وہ بولی "معلوم ہوتا ہے آپ کو زکام ہو گیا ہے۔"

"ہاں.....!"

اس نے ہاتھ بڑھا کر میرے بال چھوتے ہوئے کہا "سر تو اب تک گیلا ہے، زکام نہ ہو گا تو کیا ہو گا۔ ٹھیریے، پونچھ دوں!"

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہوں اس نے کھونٹی سے گمچھا اُتار کر میرا سر پونچھنا شروع کر دیا۔ پھر سوکھے ہوئے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے کہا "ابھی سوکھ جائیں گے۔"

رات کی تنہائی میں اجنبی شخص کو دیکھ کر پیدا ہونے والے اندیشے مانوس ہو جانے پر ختم ہو گئے۔ وہ اپنوں کی طرح باتیں کرنے لگی۔ میں پیر سکوڑے ہوئے سینے کے بل لیٹا تھا۔ جسم میں پیوست ہو جانے والی ٹھنڈک کی وجہ سے دانت کٹکٹا رہے تھے۔ اس نے پوچھا "بہت سردی لگ رہی ہے؟"

میں نے کہا "پورے ایک گھنٹے تک بارش میں بھیگا ہوں اس لیے سردی لگ گئی ہے۔"

اس نے چارپائی کے قریب آ کر کہا "ذرا کھسکیے تو" اور بستر کے نیچے رکھا ہوا کمبل نکال کر اس نے مجھے اُڑھا دیا۔

بارش کم ہو جانے کے بعد دوبارہ جوش میں آگئی تھی، ہر لمحے خوف ناک گرج، طوفانی ہوا اور بجلی کی کڑک... ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے بجلی کی زبان کی لپلپاہٹ اندر داخل ہو جاتی اور اس کا چھوٹا سا چہرہ چمک جاتا۔ نومولود بچے کا سا معصوم چہرہ۔ وہ اتنا بھولا لگتا کہ پیار کے جذبات بیدار ہو جاتے۔ آہستہ آہستہ پیدا ہونے والی قربت کا احساس دلانے کے لیے میں نے اُسے "تو" سے مخاطب کر کے پوچھا "تو یوں ہی بیٹھی رہے گی؟ سونا نہیں ہے؟"

اس نے گومگو کے عالم میں آس پاس نظر دوڑائی، جیسے پوچھ رہی ہو "کیسے سوؤں؟ سب کچھ گیلا تھا اور شاید اس کے پاس اوڑھنے بچھانے کے لیے اور کچھ نہیں تھا۔ ذرا موضوع بدلتے ہوئے اس نے کہا "آپ کا زکام کیسا ہے، کہیے تو رائی کا تیل مل دوں؟"

"رائی کا تیل؟"

"ہاں گھر میں رکھنا پڑتا ہے، تپا جی کی طبیعت اچھی نہیں رہتی ہے۔ اُنھیں بھی اکثر زکام ہو جاتا ہے۔"

میں نے چونک کر پوچھا "تپا جی کہاں ہیں؟"

"کام پر جاتے ہیں، نانگول کے پاس تالاب کھودا جا رہا ہے نا! اب تو جسم کام نہیں کرتا پھر بھی کام تو کرنا ہی پڑتا ہے!"

"تالاب؟ تالاب میں تو پانی بھرتے ہی سب آدمی اُس پار بھاگ گئے۔"

"تب تو تپا جی بھی ان کے ساتھ ہوں گے، اب دو دنوں تک نہیں آ سکیں گے، ندی میں سیلاب آتا ہے تو بارش رکنے کے دو روز بعد تک ندی راستہ نہیں دیتی۔" وہ ذرا بھی متردد ہوئے بغیر بالکل فطری انداز میں بول رہی تھی، اس نے پوچھا "آپ بھی وہیں سے آ رہے ہیں؟"

"ہاں میں اس طرف کے کنارے پر رہ گیا تھا۔ اس لیے اسی طرف بھاگا۔" اتنا کہہ کر میں نے اپنے بارے میں تمام باتیں اسے بتا دیں۔

اس نے ہنس کر آنکھیں پھیلاتے ہوئے کچھ خوش ہو کر کہا۔ "تب تو آپ سرکاری صاحب ہیں نا؟ یہ جان کر تو تپا جی بھی خوش ہوں گے کہ آپ یہاں آئے تھے۔"

میرا درجہ جاننے کے بعد اس کے چہرے پر نمودار ہونے والے تاثرات پوشیدہ نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ فوراً اُٹھ کر تیل کی شیشی لے آئی۔ رائی کا تیل،

اور کمبل ہٹا کر پُوچھے بغیر میرے جسم پر ملنے لگی میرے پورے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ کسان کی لڑکی ہونے کے باوجود اس کے ہاتھوں میں کتنی ملائمت تھی! اس کا ہلکا ملائم ہاتھ آہستہ آہستہ جسم پر چل رہا تھا۔ پیٹھ پر، سینے پر گردن پر ایسا لگتا تھا جیسے آسمان میں لہراتی بجلی زمین پر اُتر کر میرے جسم میں سما گئی ہے اور ہر عضو میں ارتعاش پیدا کرکے ذرّے ذرّے کو ہلا رہی ہے۔

وہ چارپائی کی پٹی پر کچھ تکلیف سے بیٹھی تھی میں اس خیال سے ذرا پیچھے کھسک گیا کہ وہ آرام سے بیٹھ سکے، وہ پٹی سے نیچے کھسک آئی، پھٹے کپڑے میں ڈھکی اس کی صحت مند ران سے میرا ہاتھ دب رہا تھا اور اسے ہٹا لینے کی خواہش کی بہ نسبت اُسے وہاں رہنے دینے کی خواہش زیادہ طاقت ور ہوتی جا رہی تھی، وہ بڑی دیر تک سر جھکائے مالش کرتی رہی، میری کھانسی رُک گئی تھی، اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”دیکھا نا! راتی کا تیل بڑا اکسیر ہے۔ آپ کا زکام کیسا ہلکا پڑ گیا؟“ واقعی یہ راتی کے تیل ہی کا کرشمہ تھا یا اس کے کومل ہاتھوں کا؟ یا پھر لمس کے سبب تیز سانسوں سے پیدا ہونے والی گرمی کا؟

میں نے آنکھیں ملانے کی ہمت ہار کر آنکھیں موند لیں، اس نے ہاتھ صاف کرتے ہوئے پُوچھا۔ ”نیند آرہی ہے؟“

باہر طوفان کے شور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے کہا۔ ”اس میں نیند کیسے آسکتی ہے؟“ اور پھر رُک کر بولا۔ ”آج سارا دن پیٹ میں کچھ نہیں پڑا۔ خالی پیٹ کی وجہ سے بے چینی ہو رہی ہے۔“

ایسا لگا جیسے کھانے کے بارے میں پوچھنا بھول جانے کے سبب وہ یکایک شرما گئی ہو دوسرے ہی لمحے بے خیالی میں پوچھ بیٹھی۔ ”چائے پئیں گے؟“

”اس وقت چائے؟“

”ہاں۔ بتا جی اکثر جب دیر سے آتے ہیں تو چائے مانگتے ہیں اس لیے دودھ رکھنا پڑتا ہے تاکہ کہیں تو چائے بنا دوں دوپہر کے وقت کی باجرے کی ٹھنڈی روٹی پڑی ہے اسے بھی گرم کر دوں گی چائے اور روٹی پسند آئے گی؟“

ایک اجنبی کے لیے اس کی اتنی پُرخلوص خدمات سے متاثر ہو کر میں غور سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں چائے پینے سے انکار کروں گا تو وہ ناراض ہو جائے گی، ذرا ٹھیرے ہوئے لہجے میں میں نے کہا۔ ”سب پسند آئے گا۔“

یہ سُنتے ہی وہ انتہائی خوشی سے کودتی ہوئی سامنے والے کونے میں پہنچ گئی اور جلدی سے انگیٹھی جلا کر چائے بنا ڈالی۔

وہ دس منٹ کے اندر ہی کانسی کی رکابی اور پیالے میں چائے روٹی لے آئی۔ شاہی طعام اور مغلیہ کھانے کے بارے میں تو بہت کچھ سُنا ہے لیکن ایسی شیرینی تو شاید اس میں بھی نہ ہوتی ہو گی ذائقے سے معلوم ہوتا تھا کہ چائے میں سونٹھ ڈالا گیا ہے وہ زکام ٹھیک کرنے کی تمام کوشش کر رہی تھی، میں کھا پی کر لیٹا۔ وہ پھر اسی طرح بیٹھ گئی۔ میں نے کچھ سوچنے کے بعد ہمت کرکے کہا۔ ”تو چارپائی پر بیٹھ جا نیچے ہر طرف نمی ہے تجھے بھی زکام ہو جائے گا۔“

اس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”ہم لوگوں کو اس طرح جلدی زکام نہیں ہوتا۔“

میں نے کہا۔ ”نہیں، میں چارپائی پر لیٹوں اور تو گیلی زمین پر بیٹھی رہے، یہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔“

شاید مجھے خوش کرنے کے لیے وہ میرے پیروں کے پاس بیٹھ گئی، دونوں میں سے کسی کو نیند نہیں آرہی تھی، اس کا سبب اسے بھی معلوم تھا۔ کچھ بات کرنے کی غرض سے میں نے پوچھا۔ ”یہاں ویرانے میں جھونپڑی بنا کر کیوں رہتی ہو؟“

”یہاں ہمارا کھیت ہے دیکھ بھال تو کرنی ہی چاہیے نا۔ پہلے چار کھیت تھے لیکن ماں کے مر جانے کے بعد بتا جی سے اکیلے سنبھلتے نہ تھے۔ میں اس وقت بہت چھوٹی تھی، پھر بتا جی بیمار پڑ گئے، تمام کھیت بیچ دیے، یہی ایک بچا ہے۔۔۔۔“

مجھے اس کی باتوں میں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی، اس کا بات کرنے کا انداز بھی بے حد پیارا تھا۔ آواز میں مجبوری کا کوئی احساس نہیں تھا پھر بھی میرے دل میں آپ ہی آپ ہمدردی پیدا ہونے لگی، وہ کیا کہہ رہی ہے؟

صرف ایک ہی کھیت بچا ہے، اس میں کیسے پورا پڑ سکتا ہے؟ اسی لیے تو بوڑھے باپ کو بیمار ہونے کے باوجود مزدوری کرنے کے لیے جانا پڑتا ہے اور ندی میں سیلاب آجانے کے باعث وہ دو دنوں تک گھر نہیں آسکے گا۔ ذرا رُک کر میں نے پُوچھا۔ ”اس طرح تجھے اکیلی چھوڑ کر جانے سے بتا جی کو بڑی فکر ہوتی ہو گی؟“

”نہیں، فکر کی کیا بات ہے؟ یہاں کھیتوں کی کیاریوں پر تو ایسی کتنی جھونپڑیاں ہیں مگر بارش میں آپ کو دکھائی نہ دی ہوں گی۔“

وہ ہنس پڑی، وہ اکثر یوں ہی بے وجہ ہنس پڑتی تھی، ایسا لگتا تھا جیسے اس بھیگی بھیگی مست ہوا میں، اس گھن گرج میں وہ نہیں بلکہ ایک چمکتی ہوئی بجلی ہنس رہی ہے۔ میں بھی کمبل میں لپٹا ہوا جسم پھیلاتے ہوئے ہنس پڑا۔ پھر بولا۔ ”کچھ دیر آرام کر لوں، اُجالا ہوتے ہی چلا جاؤں گا۔“

”واہ! ابھی کیسے جائیں گے؟ دیکھیے تو بارش کا اب بھی چین کہاں ہے؟ ندی کیسے پار کریں گے؟“

بات تو ٹھیک تھی۔ میں سمجھتا تھا پھر بھی میں نے کہا۔ ”لیکن تجھے اس طرح بیکار کیوں تکلیف دیتا رہوں؟“

اُس کی آنکھوں میں حیرت کی چمک نمودار ہوئی۔ ”تکلیف! میرے لیے تو اچھا ہوا ورنہ بتا جی کے آنے تک تنہا رہنا پڑتا۔ میں تو کہتی ہوں کہ بتا جی کے آنے تک یہیں رہ جائیے۔ یہ دیکھ کر وہ بہت خوش ہوں گے کہ صاحب آئے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”ہاں! وہ تو خوش ہوں گے لیکن تب تک تیری کیا حالت ہو جائے گی؟ میں اس طرح لیٹا رہوں اور تو بیٹھی بیٹھی تپسیا کرتی رہے یہی نا؟ بھلا ایسے میں، میں کیسے آرام سے سو سکتا ہوں؟“ وہ خاموش ہو گئی۔ چراغ کی بالکل مدھم روشنی میں بھی مجھے اس کی آنکھوں کی چمک نظر آرہی تھی، جواب دینے میں اسے دشواری ہو رہی تھی، کچھ دیر بعد وہ سر جھکا کر بولی۔ ”بتا جی بھی اسی طرح کہتے ہیں، بارش ہونے پر مجھے زمین پر سونے ہی نہیں دیتے۔ ہاتھ پکڑ کر جبراً چارپائی پر سلا دیتے ہیں۔“

چونک کر میں نے پوچھا۔ ”پھر بابا کہاں سوتے ہیں؟“

”ساتھ ہی تو۔ ہم باپ بیٹی ساتھ ہی سو جاتے ہیں، جب چھوٹی تھی، اسی وقت سے مجھے بتا جی کے گلے سے لگ کر سونے کی عادت۔۔۔!“

غیر شعوری طور پر میرا ہاتھ آگے بڑھ گیا، میں اس کا ہاتھ پکڑ کر کانپتی آواز میں بولا۔ ”آ۔۔۔ سو جا۔۔۔!“ وہ چونک پڑی اور اس نے میرے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ میں ایک پل کے لیے فطری طور پر مبہوت ہو گیا لیکن فوراً انتہائی ہمت سے کہا۔ ”تو پھر میں چارپائی پر نہیں سوؤں گا۔“

”نہیں نہیں، دیکھیے ایسا نہ کیجیے گا۔“

میں نے تیز آواز میں کہا۔ ”میرے ساتھ سونے میں اگر شرم آتی ہے تو پھر مجھے تیرے لیے چارپائی خالی کر دینی چاہیے نا؟“

وہ اچانک ہنس پڑی جیسے پہلے ہنسی تھی، بھرپور اور خالص ہنسی، وہ اپنا جھکا ہوا سر پل دو پل انگلی کے ناخن سے کریدتی رہی پھر قریب آئی۔ میں نے جسم کھسکا لیا۔ اور ہچکچاہٹ دُور کرنے کے لیے خود ہی اس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اپنے پہلو میں لٹا لیا۔ اس نے آنکھیں موند لیں، وہ واقعی بہت شرما رہی تھی! وہ بے قصور تھی۔ پھر بھی اسے شرمانا آتا تھا۔۔۔۔ وہ حیا کا مفہوم سمجھتی تھی۔

میں نے انتہائی نرم لہجے میں پوچھا۔ ”سردی لگ رہی ہے؟“

اس نے ہتھیلی میں دبے منہ سے دبی آواز میں جواب دیا۔ ”ہاں!“

میں نے اپنا جسم کمبل میں لپیٹ کر اس کا بدن لپیٹ لیا۔ اس کے سینے کی دھڑکن مجھے صاف سُنائی دے رہی تھی، اور اس کی سانسوں سے پیدا ہونے والے ساتوں سُر بارش کی رم جھم کے ساتھ مل کر ایک عجیب نغمگی پیدا کر رہے تھے، مجھے کچھ ہوش نہیں تھا۔۔۔۔ اور میں اس لطیف کیفیت میں آہستہ آہستہ ڈوبتا گیا، میں سب کچھ بھول چکا تھا۔ گرجتے کڑاکے میں لرزتی جھونپڑی کا دیا۔ سائیں سائیں کرتی ہوا میں تھرتھراتی روشنی۔ شاید چراغ میں تیل ختم ہو رہا تھا۔ ایک تیز چمک کے بعد روشنی بجھ گئی۔ طویل گرج کے ساتھ بجلی کوندی، خوف کے مارے وہ میرا گلا باہوں میں کستی ہوئی مجھ سے لپٹ گئی۔

رات گئے بارش رُک گئی۔ طوفان چلا گیا تھا اور سویرا ہونے پر سہانی دھوپ نکل آئی تھی، وہ بہت متاسف تھی۔ مجھے چارپائی پر سویا چھوڑ کر اس نے جلدی جلدی گرہستی کے کام نمٹانے شروع کیے دوپہر ہوتے ہوتے میرے بھیگے کپڑے سُوکھ گئے تھے وہ انھیں تہہ کرکے مجھے دیتے ہوئے بولی۔ ”لیجیے۔ پہن لیجیے۔“ پھر شال تہہ کرتے ہوئے بیل بوٹے والی ست رنگی کشیدہ کاری پر تحسین آمیز نگاہ ڈال کر اس نے رسیلی آواز میں کہا۔ ”کیسی خوب صورت کشیدہ کاری ہے، ہے نا؟“

میں نے اچانک کہہ دیا۔ ”تجھے پسند ہے؟ ہے تو رکھ لے۔“

واقعی وہ اُسے پسند آگئی تھی، اور صرف شال ہی نہیں اگلے روز وہاں سے رخصت ہوتے ہوئے میں نے پرس بھی اس کے سامنے کر دیا۔ وہ سر ہلا کر بولی۔ ”نہیں!“

میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”یہ دان نہیں ہے، تو جانتی ہے۔ اگر تو نے مجھے سہارا نہ دیا ہوتا تو میں اس وقت زندہ نہ ہوتا۔ میں زندگی عطا

سائنسی

مصنوعات سے پوری نمائش گاہ بھری ہوئی تھی چند اخباری نمائندے بھی اِدھر اُدھر گھوم پھر رہے تھے۔ وہ ان مصنوعات سے بہت متاثر ہوئے۔ وہ کارکنانِ نمائش سے مختلف نوعیت کے سوالات کرتے اور ان کے جوابات نوٹ کر لیتے۔ ایک جگہ انہوں نے دیکھا کہ شیشے کے ایک جار میں رنگ برنگی مچھلیاں تیر رہی ہیں۔ ایک اخباری نمائندے نے حیرت سے پُوچھا۔ ”جناب! اس سائنسی مصنوعات کی نمائش میں ان مچھلیوں کی موجودگی کا کیا مطلب ہے؟“

نمائش کے کارکن نے جواب دیا۔ ”صرف یہ بتانے کے لیے کہ چند چیزیں خدا نے بھی بنائی ہیں۔“

کرنے کے بدلے میں تجھے یہ معمولی سا تحفہ دے رہا ہوں۔"
وہ پھر بھی نہ مانی۔ اس کی سیاہ اداس آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ میں نے بہت مشکلوں سے سمجھا بجھا کر آخر میں سے سو روپے کا ایک نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس کی کھلی ہتھیلی میں ایک نیلا رنگین کاغذ لیوں پھڑپھڑا اُٹھا جیسے......

اُس کا ہاتھ کانپ رہا تھا صرف ہاتھ ہی نہیں پورا بدن، پلکوں کے جھولے میں جھولتے ہوئے دو آنسو بھی۔ اُس وقت جُدائی کی اُس گھڑی میں وہ خود بھی ایک آنسو پری جیسی لگ رہی تھی بھینی، تیاں، چمکتی، جھولتی، کانپتی لیکن اب وہ ہنس نہیں رہی تھی، وہ بھولی معصوم، کھلکھلاہٹ سے بھری ہنسی بالکل اوجھل ہو گئی تھی، اس کی ہتھیلی پر نوٹ رکھ کر میں نے خود اس کی مٹھی بند کر دی اور اپنے دونوں ہاتھوں میں اسے دبا لیا۔ پھر میں نے جذبات میں اسے کھینچ لیا۔ کانٹے کے ساتھ کھینچ آنے والی مچھلی کی طرح وہ کھنچ آئی۔ اس کا گل مہر کے پھول جیسا چہرہ نہ جانے کب تک میری ہتھیلیوں میں دبا رہا گلاب کی ادھ کھلی کلی کے مانند اس کے ادھ کھلے سُرخ ہونٹوں پر میرے ہونٹ جمے رہے ہیں اس کی گھٹتی بڑھتی معطر سانسوں کا آبِ حیات نہ جانے کب تک پیتا رہا۔

چڑھتی دھوپ میں کرنوں کی باہوں سے پرچھائیاں کھسک رہی تھیں، وہ آہستہ آہستہ میرے بازوؤں سے الگ ہو رہی تھی، بہت کچھ الگ ہو رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے بہت کچھ کہنا باقی رہ گیا ہے لیکن اب وقت نہیں تھا۔ وہ رُک گئی اور میں دروازہ پار کر گیا۔ الوداع کہتے ہوئے وہ بھرائی ہوئی آواز میں پوچھنے لگی۔ "پھر آئیں گے؟"

میں نے کہا۔ "ہاں! ڈیم بن رہا ہے اس لیے اکثر و بیشتر اس طرف آنا ہوتا رہے گا۔ اب آؤں گا تو تجھ سے ملے بغیر نہیں جاؤں گا۔"
اس کی معصوم آنکھوں میں عقیدت کی روشنی جگمگا رہی تھی، مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے دن کی روشنی میں اس روشنی کی لَو برداشت کرنے کی صلاحیت مجھ میں نہیں ہے، وہ دروازے پر ہی کھڑی رہی — اور میں چلا آیا۔

گھر آیا تو چھپرا کی بے چینی کی انتہا نہ تھی، طوفان اور ندی کے سیلاب کی خبر اسے مل چکی تھی۔ مجھے بخیر دیکھ کر اس نے سکون کا سانس لیا پھر میرا سامان ٹھیک کرتے ہوئے اس نے پُوچھا۔ "اس میں آپ کی شال کہیں دکھائی نہیں دیتی؟"
کیسے جواب دوں؟ کیا جواب دوں؟ میں نے کہا۔ "دوڑ بھاگ میں شال کہیں گم ہو گئی۔"
اس نے کہا۔ "اچھا ہوا کھو گئی، جان بچی تو لاکھوں پائے، نئی خرید لیں گے۔"
اور اگلے جاڑے میں اس نے میرے لیے نئی شال خرید لی، اور جہاں پہلی شال چھوڑ آیا تھا، وہاں جانا ممکن ہی نہ ہو سکا۔

✿

یکایک میرے خیالوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ چونک کر دیکھا تو نوکر آ رہا تھا۔ "صاحب۔ چائے!"
چائے کا گلاس ہاتھ میں لے کر میں نے پوچھا۔ "بند پر کام کرنے والے مزدوروں میں کوئی کسان ہو تو اسے میرے پاس بھیج دو۔"
کچھ دیر بعد ایک کسان آیا۔ میں نے پوچھا۔ "گزشتہ سال یہاں بند پر ایک کسان کام کرتا تھا۔ نام تو یاد نہیں ہے لیکن وہ بوڑھا اور بیمار تھا۔ اُس پار کے کھیتوں میں کہیں اس کی جھونپڑی تھی۔" اور کچھ ٹھیر کر میں نے کہا۔ "ایک جوان لڑکی بھی۔"
"کس کی؟ لچھمن کی بات کر رہے ہیں نا صاحب! وہ تو مر گیا۔ چھ مہینے ہو گئے ہوں گے۔ کھیت بیچ کر لڑکی بھی کہیں چلی گئی ہے معلوم نہیں کہاں گئی۔"
آنے اور کچھ پوچھنے کی بات نہیں بچی تھی، بارش آتے آتے رُک گئی تھی، میں کسی پریشانی کے بغیر دو دنوں میں ابتدائی رپورٹ تیار کر کے لوٹ آیا لیکن گھر کے رنگ ڈھنگ دیکھتے ہی آنکھیں حیرت زدہ رہ گئیں، دیوان خانے میں ایک چھوٹا سا پالنا جھول رہا تھا اور چھپرا کھڑی جھولا جُھلا رہی تھی۔ "یہ کیا ہے چھپرا؟"
ذرا بھی خفا ہوئے بغیر اس نے نرم فطری لہجے میں کہا۔ "کیوں، اس دن آپ نے دیکھا نہیں تھا؟"
"کیا؟"
"صحن میں بچّہ پڑا ہوا تھا نا! پھر پولیس آئی لیکن اس سلسلے میں اُلجھن پیدا ہوئی کہ بچّے کو کہاں رکھا جائے۔"
"اس لیے تو نے مانگ لیا۔ یہی نا؟"
"ویسے تو نہ مانگا ہوتا لیکن۔" وہ ذرا رُک گئی۔ پھر اُس طرف کی دیوار کی جانب نظر کر کے بولی۔ "لیکن پولیس نے چادر ہٹائی اور چادر کے نیچے سے یہ شال نکل پڑی۔" اس نے کھونٹی سے کشیدہ کاری والی شال اُتار کر میری طرف پھینکتے ہوئے اپنی بات پوری کی۔ "جو شال آپ نے کھو دی تھی۔"

ہندوستان کی جدید کہانیوں میں سے منفرد ہندی افسانہ نگار مدرا راکشس کی ایک کہانی
جس کا ترجمہ دُنیا کی کئی زبانوں میں ہو چکا ہے

◐ سید سبط احمد

گوشت کی ایک عورت کی کہانی

وہ ایک بے حد خوبصورت اور نازک اندام عورت تھی اور اِس وقت تمام ہنگاموں سے بے نیاز ہو کر آئینہ ہاتھ میں لیے میک اپ کر رہی تھی۔ دفعتہً پے در پے کئی دھماکے ہوئے اور کمرے کی کھڑکیوں اور روشن دانوں کے شیشے ٹوٹ کر زمین پر آ گرے۔ اس کا شوہر کھڑکی میں کھڑا ہُوا باہر کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ سہم کے ایک دم پیچھے ہٹا اور اپنی بیوی

کے قریب ایک کرسی پر آبیٹھا۔ شیشوں کی چھوٹی بڑی بے شمار کرچیاں زمین پر بکھری ہوئی تھیں۔ وہ ابھی انھیں دیکھ ہی رہا تھا کہ دوبارہ ایک زبردست دھماکا ہوا۔ اس بار پورا مکان ہل گیا اور وہ کرسی سے نیچے گر پڑا۔ ساتھ ہی کمرے میں اتنا غبار در آیا کہ تھوڑی دیر کے لیے اردگرد کی تمام چیزیں اس میں چھُپ گئیں۔

وہ چند لمحے سانس روکے زمین پر پڑا رہا۔ پھر اُس نے گرد جھاڑی اور اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی کرسی سے نیچے گر پڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں آئینہ ابھی تک موجود تھا۔ اس کے کپڑوں، بالوں اور چہرے پر دھول کی ایک گہری تہہ جم چکی تھی۔ مرد نے بیوی کی طرف سے نظریں ہٹائیں اور کمرے سے باہر نکل گیا مگر اس کی واپسی میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہ اندر آتے ہی بیوی سے کہنے لگا۔ "سمجھ میں نہیں آتا، جب یہاں سے کوئی جواب نہیں دیا جارہا ہے تو پھر وہ اپنا بارود کیوں ضائع کررہے ہیں؟"

"ان کی مرضی"۔ بیوی نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "ممکن ہے اس طرح وہ لوگ صرف یہ بتانا چاہتے ہوں کہ ہم آرہے ہیں، پھر وہ اگر گولا باری نہیں کریں گے تو کیا باجے تاشے بجاتے ہوئے آئیں گے؟" جملے کے آخر میں طنز کا عنصر زیادہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اسے اپنے شوہر کے اس بھونڈے سوال پر غصہ آگیا ہو۔

"شاید وہ آگئے"۔ مرد نے اچانک کرسی سے اُٹھ کر کھڑکی کی طرف لپکتے ہوئے کہا۔ لیکن اس مختصر سے جملے کا بیوی کے چہرے پر غیر معمولی ردِ عمل دیکھ کر وہ پریشان ہوگیا۔ عورت کے چہرے کی رنگت ایک دم بدل گئی تھی اور اس کا سارا جسم لرزنے لگا تھا جیسے کسی خوں خوار بلّی نے اس کی پشت پر اپنے پنجے گاڑ رکھے ہوں۔ اس کی آنکھوں کی چمک ماند پڑگئی اور ان میں خوف کے سائے گہرے ہوگئے۔

"کیا تمھیں ڈر لگ رہا ہے؟" مرد نے پوچھا اور اُس کے قریب جا بیٹھا۔ بیوی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ کرسی سے اتر کر فرش پر اکڑوں بیٹھ گئی۔ شوہر نے اپنا سوال دُہرایا۔ "کیا تمھیں ڈر لگ رہا ہے؟"

وہ لرزیدہ لہجے میں بولی۔ "نہیں۔"

مرد کھڑکی کی طرف بڑھ گیا اور باہر کا جائزہ لینے لگا۔ اسے چند سائے ہاتھوں میں اسٹین گنیں لیے اسی طرف آتے دکھائی دیے۔ خوف کی وجہ سے مرد کے قدم پتھرا گئے۔ وہ بے اختیار آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا لیکن اس اثنا میں وہ سائے بہت قریب آچکے تھے اور ان کی آنکھیں کمرے کے ماحول سے کافی حد تک مانوس بھی ہوگئی تھیں۔ انھوں نے اس کی بیوی کو دیکھ لیا تھا۔ ایک جوان خوبصورت اور متناسب بدن کی عورت کو دیکھ کر اُن کے کھردرے چہروں پر مسرّت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ایک شخص خوش ہو کے زور سے چیخا لیکن سامنے کھڑے ہوئے ایک اور شخص نے جب اسے گھورا تو وہ خاموش ہوگیا۔ سامنے والا شخص آگے بڑھا اور مرد سے کہنے لگا۔ "ڈرنے یا بھاگنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" وہ ایک لمحے کے لیے رکا پھر بولا۔ "اگر تم نے ہمارے ساتھ تعاون کیا تو یقین رکھو ہم تمھیں کچھ انعام بھی دیں گے۔ لیکن بھاگنے کی صورت میں......" وہ خاموش ہوگیا اور اسٹین گن پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ وہ اس دستے کا افسر دکھائی دیتا تھا۔

سپاہیوں میں پھر ہلچل پیدا ہوئی۔ شاید کچھ اور سپاہی بھی آگئے تھے اور ان سب نے مل کر چیخنا شروع کردیا۔ "عورت عورت۔ عورت۔"

عورت عورت کی آوازیں بلند ہونے لگیں اور عورت گھبرا گئی لیکن جلد ہی سنبھل گئی اور ٹھیرے ہوئے لہجے میں سامنے والے آدمی سے کہنے لگی۔ "کیا یہ سب تمھارے ماتحت ہیں؟"

"ہاں۔" افسر نے حیرت اور تکبّر کے ملے جلے انداز میں جواب دیا۔

"کیا تم انھیں بیہودگی سے روک کے ضابطے میں نہیں رکھ سکتے؟" وہ چُبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔

اسی وقت سپاہی بے قابو ہوگئے اور زور زور سے چیخنے لگے۔ افسر نے کڑکتی ہوئی آواز میں انھیں ڈانٹا تو وہ سب ایک دم خاموش ہوگئے مگر دوسرے ہی لمحے عورت کی طرف اشارے کر کرکے پھر چیخنے لگے۔ "سر یہ مالِ غنیمت ہے۔ یہ ہم لیں گے۔"

"یہ لُوٹ کا مال ہے!"

یہ شور اور بداخلاقی افسر کو بُری لگی۔ وہ حلق پھاڑ کر دہاڑا "نکل جاؤ۔ تم سب یہاں سے نکل جاؤ۔"

سپاہی افسر اور عورت کو موٹی موٹی گالیاں دیتے ہوئے باہر نکل گئے اور چند لمحوں بعد افسر بھی باہر نکلا۔ سپاہی میدان سے دور جا چکے تھے۔ افسر پلٹ کے پھر عورت کے پاس آگیا۔ اُسے

بخوبی یہ احساس تھا کہ وہ ایک فاتح فوج کا افسر ہے اور کمرے میں ایک حسین اور نازک بدن عورت موجود ہے جس کا تعلق شکست خوردہ قوم سے ہے۔ افسر نے گہری اور بامعنی نظروں سے عورت کو دیکھا مگر عورت کے چہرے پر کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی، اس کا چہرہ پہلے کی طرح سپاٹ رہا۔ ہر قسم کے جذبے سے عاری، اس کے کپڑوں اور بالوں پر گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ پھر بھی اس کا حسن دمک رہا تھا۔ افسر آگے بڑھ کر اس کے بالوں، کپڑوں اور چہرے سے گرد جھاڑنے لگا۔ اس نے پھونک ماری تو کچھ گرد اس کی آنکھوں میں بھی جا گھسی۔ آنکھوں میں شدید چُبھن ہونے لگی۔ اسی وقت اسے عورت کا شوہر دکھائی دیا۔ وہ خاموشی سے افسر کی حرکات کا جائزہ لے رہا تھا۔ افسر کو نہ جانے کیا خیال آیا کہ وہ گرجا۔ "بیوقوف! گدھے! یہاں کھڑا میرا منہ کیا دیکھ رہا ہے۔ گھر میں کھانے کو جو کچھ بھی ہو، وہ لے کر آ۔ جلدی۔"

عورت کا شوہر اس طرح تیزی سے اندر کی طرف لپکا جیسے اگر وہ ایک لمحے بھی رُکا تو افسر اسے گولی مار دے گا۔ اسی وقت افسر کی آواز گونجی۔ "بھاگنے کی کوشش مت کرنا میرے سپاہی سارے شہر میں پھیلے ہوتے ہیں بے دریغ گولی ماردیں گے۔"

عورت کا شوہر پیچھے دیکھے بغیر باورچی خانے کی طرف چلا گیا۔ افسر عورت کی طرف مڑا۔ وہ بھاگ رہی تھی۔ افسر بجلی کی طرح لپکا اور اس نے عورت کو کمر سے دبوچ لیا۔ عورت نے بل کھا کر اپنے دانت اس کے بازو میں گاڑ دیے۔ افسر کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی۔ اس نے جھلا کر عورت کی کمر پر ایک زوردار گھونسا جڑ دیا۔ عورت کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکلی۔ لیکن اُس نے جواباً اپنے ناخنوں سے افسر کا چہرہ نوچ لیا۔ اس تمام مدافعت اور جدوجہد کے باوجود وہ فرار ہونے میں کامیاب نہیں ہوسکی۔ گرانڈیل افسر نے اسے پوری طرح قابو میں کرلیا تھا۔ وہ ہانپتی رہی اور خوں خوار نظروں سے اسے گھورتی رہی لیکن وہ قطعاً بے بس ہوچکی تھی۔ اس کی بے بسی پر افسر مسکرا دیا۔ عورت نے غصّے اور نفرت سے اس کے چہرے پر تھوک دیا۔ افسر نے تھوک صاف نہیں کیا۔ بلکہ عورت کے دونوں ہاتھ پیچھے کرکے اپنے ایک ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ لیے اور دوسرے ہاتھ سے اس نے عورت کے تمام کپڑے نوچ ڈالے۔ پھر اس نے اسے اپنے سینے سے لگانا چاہا۔ عورت نے اس کے چہرے پر ایک بار پھر تھوک دیا۔ افسر نے اس بار بھی صفائی کی ضرورت محسوس نہیں کی، وہ اسی طرح برہنہ عورت کو اٹھا کر کرسی پر جا بیٹھا۔ پھر اس نے اسے اپنے چوڑے سینے میں قید کرلیا۔ عورت

کی مزاحمت اور جدوجہد ختم ہوچکی تھی۔ اسی وقت اس نے ادھ کھلی آنکھوں سے دروازے کے قریب ایک سایہ دیکھا۔ وہ اُسے پہچان گئی، وہ اس کا شوہر تھا۔ عورت نے فوراً آنکھیں بند کرلیں۔

شوہر کے دونوں ہاتھوں میں رکابیاں تھیں وہ چند لمحے دروازے میں کھڑا رہا۔ پھر مرے مرے قدموں سے اندر آگیا۔ افسر نے اپنے سینے سے چمٹائی ہوئی برہنہ عورت کو ایک جھٹکے سے الگ کیا اور اسے کرسی سے نیچے لڑھکا دیا۔ عورت کا شوہر اب اندر آچکا تھا۔

افسر نے اسٹین گن اپنی گود میں رکھ لی اور کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ کھانے کے دوران اس کی نظریں عورت اور اس کے شوہر پر برابر جمی رہیں۔ اس کے ہاتھ کبھی کبھی عورت کے گداز بدن کا طواف بھی کرنے لگتے تھے۔ جب وہ پانی پی رہا تھا تو اچانک دروازے پر پھر شور سُنائی دیا۔ سپاہی پھر آگئے تھے۔ افسر اسٹین گن لے کر اٹھا۔ برہنہ عورت کے بدن میں حرکت پیدا ہوئی۔ وہ بھی اٹھی اور اسی حالت میں افسر سے پہلے سپاہیوں کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

افسر نے عورت کا مرمریں بازو پکڑ کر اسے کرسی کی طرف دھکیل دیا اور گرج دار آواز میں سپاہیوں سے بولا۔ "بھاگ جاؤ یہاں سے۔ ورنہ میں سب کو گولی مار دوں گا۔"

"سر!۔ سر" ایک سپاہی نے کچھ کہنا چاہا مگر افسر کے چہرے پر جلال دیکھ کر صرف ہکلا کر رہ گیا۔

"سر! یہ عورت ہمیں دے دیجیے۔"

دوسرا سپاہی بولا۔ "پھر ہم چلے جائیں گے۔" کئی آوازوں نے اس کی تائید کی۔

افسر کے چہرے پر شدید غصّے اور جھنجلاہٹ کے تاثرات اُبھرے مگر وہ خاموش رہا۔ وہ جواب دینے کے لیے شاید الفاظ تلاش کررہا تھا۔ اسی وقت خوبصورت اور برہنہ عورت آہستہ آہستہ سپاہیوں کی طرف بڑھی اور ان کے بالکل قریب جا کر کھڑی ہوگئی۔ سپاہی چند لمحوں تک اس کا کندن جیسا شفاف اور رس دار بدن دیکھتے رہے پھر جیسے ایک طوفان برپا ہوگیا۔ وہ سب ایک ساتھ عورت پر ٹوٹ پڑے۔

عورت کا سڈول گلابی بدن ان کے ہاتھوں میں ہوتا ہوا عین درمیان میں چلا گیا۔ اسی وقت چند سپاہیوں کی نظریں اس کے شوہر پر جا پڑیں۔ وہ دور کھڑا تماشا دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ نہ جانے کس جذبے کے تحت تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا کمرے کی طرف بڑھ گیا

وہ کافی دیر تک اندھیرے کمرے میں خاموش کھڑا ہوا باہر کی سُن گُن لیتا رہا۔ باہر کے طوفان میں رفتہ رفتہ کمی آ رہی تھی، ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سپاہیوں کی تعداد بھی کم ہوتی جا رہی ہے، بھونڈے اور فحش فقرے آہستہ آہستہ دم توڑ رہے تھے۔ چند لمحوں بعد مکمل خاموشی چھا گئی۔

جب اسے اچھی طرح اطمینان ہو گیا کہ تمام سپاہی جا چکے ہیں تو وہ احتیاط کے ساتھ کمرے سے باہر نکلا، باہر کوئی نہیں تھا۔ عورت کا نُچا ہوا چکنا دار بدن فرش پر پڑا تھا، وہ شاید بے ہوش تھی، مرد نے جب اس کے قریب جا کر اسے ہلایا جُلایا تو اُس نے آنکھیں کھول دیں، وہ چند لمحوں تک خالی خالی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتی رہی پھر اُٹھنے لگی۔ شوہر نے اُسے اُٹھنے میں مدد دینا چاہی مگر اس نے بُری طرح اپنے شوہر کا ہاتھ جھٹک دیا۔

وہ تھکے تھکے قدموں سے چلتی ہوئی اندر کمرے میں پہنچی اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کا بدن ڈھیلا پڑ گیا تھا اور اس پر جگہ جگہ دانتوں اور ناخنوں کے نشان نظر آ رہے تھے۔ شوہر نے اُسے غور سے اُوپر سے نیچے تک دیکھا اور تیزی سے اندر چلا گیا، واپسی پر اس کے ہاتھوں میں تولیا اور چادر موجود تھی۔ وہ یہ دونوں چیزیں عورت کی گود میں ڈال کر کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔

باہر ہر طرف ویرانی کی حکمرانی تھی، زمین پر گولا باری کی وجہ سے بڑے بڑے گڑھے اُبھر آئے تھے، درخت اکھڑ گئے تھے اور ان کی شاخوں اور تنوں پر گرد و غبار کی دبیز تہیں جم چکی تھیں، فضا میں بارود کی ایک ناگوار سی بُو رچی ہوئی تھی، وہ کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے دروازوں کے سہارے کھڑا دُور خلا میں دیکھ رہا تھا جیسے کسی کا منتظر ہو۔ ”کیوں نہ ہم یہ مکان چھوڑ دیں؟“ وہ بیوی کی طرف دیکھے بغیر بولا۔

”کیوں؟“ بیوی کی آواز کسی گہرے کنویں سے آتی ہوتی معلوم ہوئی۔

وہ اس کیوں کا کوئی جواب نہیں دے سکا۔ کمرے میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ وہ دوبارہ باہر دیکھنے لگا۔ سارا شہر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ کمرے میں بھی روشنی نہیں تھی، چند لمحوں بعد وہ کھڑکی سے ہٹ آیا۔ اس نے دیکھا کہ اب اس کی بیوی کپڑے پہن چکی ہے، کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ اس کا گورا بدن جگہ جگہ سے جھانک رہا تھا۔ گریبان بُری طرح پھٹا ہوا تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو ممکن ہے وہ بیوی پر برس پڑتا۔ بیوی کے سینے پر دانتوں اور ناخنوں کے نشان اسے اندھیرے میں بھی نظر آ رہے تھے۔ نیلی نیلی خراشوں سے خون رِس رہا تھا۔ اس نے کچھ کہنا چاہا۔ عین اسی وقت باہر سے متعدد قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ دونوں نے بیک وقت مُڑ کر دیکھا۔

وہی فوجی افسر آیا تھا۔ اس کے ساتھ چند آدمی اور تھے، اُن میں سے ایک شخص سب سے نمایاں تھا کیونکہ وہ فوجی وردی کے بجائے شہری لباس پہنے تھا۔

”ہم آپ کو ایک معمولی سی زحمت دینا چاہتے ہیں۔“ اس وقت فوجی افسر کا لہجہ اور رویّہ شریفانہ تھا۔ ”اُمید ہے آپ اس زحمت کے لیے ہمیں معاف کر دیں گی۔“ پھر وہ شہری لباس والے سے پوچھنے لگا۔ ”یہیں، یا باہر چلیں؟“

”باہر ٹھیک رہے گا۔“ شہری لباس والے نے جواب دیا۔

وہ سب باہر نکل گئے۔ دوسرے آدمیوں نے تین کرسیاں باہر نکال لیں، فوجی افسر، شہری لباس والا اور عورت کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ افسر نے ان کا تعارف کرایا۔ ”یہ ایک مشہور اخبار کے نمائندے ہیں اور آپ سے انٹرویو لینا چاہتے ہیں۔“

”مجھ سے؟“ عورت حیران رہ گئی۔

”جی ہاں آپ سے۔“ فوجی افسر نے کہا۔ ”یہ انٹرویو ہم دُنیا بھر کے اخبارات میں شائع کروائیں گے، ریڈیو اور ٹیلی وژن بھی اسے نشر کریں گے۔“ عورت اب بھی حیران تھی، فوجی افسر نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”انٹرویو میں آپ کو صرف یہ بتانا ہے کہ ہمارے آنے سے پہلے یہاں جو حکومت تھی، وہ کتنی ظالم تھی، اور اس نے آپ کے ساتھ کیا کیا ظلم کیے؟ آپ یہ بھی بتا سکتی ہیں کہ یہاں کی پولیس نے کتنی بار آپ کی آبرو ریزی کی۔“

”لیکن میں اس قسم کا کوئی بیان دینا نہیں چاہتی۔“ عورت کے لہجے میں حیرت، بے زاری اور تھکن موجود تھی۔

اخباری نمائندے نے کڑوے لہجے میں کہا۔ ”دیکھیے، میں یہاں انکار سُننے نہیں آیا ہوں، اور نہ آپ کا کوئی مشورہ سُنا جائے گا۔ یہ فوج کا معاملہ ہے، فضول باتوں سے پرہیز کیجیے اور جو کچھ کہا گیا ہے، وہی کہیے، ورنہ ہم کوئی اور ذریعہ اختیار کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔“

عورت نے چند لمحوں تک کچھ سوچنے کے بعد فوجی افسر سے پوچھا کہ کیا میں وہ باتیں بھی بتا سکتی ہوں جو کچھ دیر قبل یہاں پیش آ چکی ہیں، اور جن میں تم اور تمہارے سپاہی بھی شامل تھے؟“

فوجی افسر کا چہرہ غصّے سے سُرخ ہو گیا۔ وہ بولا۔ ”بکواس مت کرو، تمھیں صرف وہی کہنا ہے جو بتایا گیا ہے۔“

بیان شروع ہو گیا اور ایک ٹیپ پر منتقل ہوتا رہا۔ عورت نے صرف وہ باتیں کہیں جن کی اسے اچانک ہدایت دی گئی تھی، آخر میں اُس نے اپنے طور پر اتنا اضافہ ضرور کر دیا کہ فاتح فوج نے اس کے ساتھ جو سلوک کیا ہے، وہ اس کے لیے احسان مند ہے اور اسے تمام زندگی نہیں بُھلا سکے گی۔

اخباری نمائندہ اور دوسرے لوگ چلے گئے۔ فوجی افسر رُک گیا اور ایک سپاہی بھی ٹھہر گیا جو پہرا دینے کے لیے روکا گیا تھا۔ عورت کے کھڑے ہوتے ہی افسر نے مسکرا کر اس کا شکریہ ادا کیا۔ جواب میں عورت کو بھی مسکرانا پڑا۔ وہ بولی۔ ”اب آپ تشریف لے جائیں گے یا میں چلی جاؤں؟“ اس کے لہجے میں طنز کی کاٹ موجود تھی۔

”دونوں چلتے ہیں۔“ افسر نے بائیں آنکھ میچ کے کہا اور اس کا بازو پکڑ کر اندر لے گیا۔ وہ عورت کے شوہر کو کافی بنانے کا حکم دے کر خود عورت کے بچے ہوئے بدن سے کھیلنے لگا۔ اس بار عورت نے قطعاً مزاحمت نہیں کی۔ افسر کافی دیر تک سرگرم کار رہا پھر اس نے نڈھال ہو کے آنکھیں بند کر لیں، عورت لباس سمیٹے بیٹی نیازی ہی باہر نکل آئی اس کے بدن پر چند اور نشان بن گئے تھے۔ اس کا شوہر دروازے پر کھڑا تھا۔ اس نے افسر کے متعلق پوچھا۔ ”کیا وہ سو گیا؟“

”نہیں، صرف تھکن اُتار رہا ہے۔“ عورت نے میز پر پیالیاں سجاتے ہوئے کمزور آواز میں جواب دیا۔

”یہ کام میں کرتا ہوں، تم ذرا کافی دیکھو جا کے۔“

لیکن عورت بدستور پیالیاں سجانے میں مصروف رہی، اس کام سے فارغ ہو کے اس نے اپنا پھٹا ہوا لباس پھر پہن لیا۔ اس کا شوہر وہیں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ دونوں کافی دیر تک چپ رہے، آخر شوہر ہی نے چپ توڑی۔ ”میرا خیال ہے، ہماری فوجیں ضرور واپس آئیں گی، ان کے آنے پر ہی ہم اس عذاب سے نکل سکیں گے۔“ اس کا لہجہ خاصا پُرامید تھا۔

”کس عذاب سے؟“ عورت نے حیرانی سے پوچھا۔ اس کی نظریں شوہر کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

”ان بے رحم اور ظالم درندوں کے عذاب سے۔“ شوہر کے لہجے میں نفرت اور حقارت کے سوا کوئی جذبہ نہیں تھا۔

عورت کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ ”ایسی تو کوئی بات نہیں ہے، سب کچھ معمول کے مطابق ہوا ہے، آخر ان لوگوں نے ایسی کون سی ناجائز یا غیر اخلاقی حرکت کی ہے کہ . . .“

”یہ . . . . . یہ تم کہہ رہی ہو؟ . . . . تم؟“

شوہر اپنی بیوی کی باتوں سے بہت حیران ہوا تھا۔ اسی اثنا میں فوجی افسر اپنے کپڑے درست کرتا ہوا وہاں آ گیا۔ اس نے عورت کو ایک نظر دیکھا۔ عورت پُرسکون تھی، افسر اس کے قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک ایسی چمک تھی جیسے کوئی بچّہ اپنا پسندیدہ کھلونا حاصل کر لینے کے بعد مطمئن اور خوش ہو گیا ہو، وہ چند لمحوں تک اِدھر اُدھر دیکھتا رہا پھر اس نے عورت کو دوبارہ اپنی آغوش میں کھینچ لیا اور اس کی پتلی کمر سہلانے لگا۔ اس کے ہاتھ ہولے ہولے حرکت کر رہے تھے۔

چند لمحوں بعد بڑے زور کا ایک دھماکا ہوا۔ سارا مکان ہل گیا۔ عقبی کمرے کی چھت زمین پر ڈھیر ہو گئی، افسر نے جلدی سے عورت کو اُتار کر میز کے نیچے کر دیا۔ پے بہ پے دھماکے ہونے لگے، جیسے نئے حملہ آور سارا شہر کھنڈر میں تبدیل کر دینے کا تہیّہ کر چکے ہوں، افسر عورت کو چھوڑ کر تیزی سے ایک طرف بھاگ نکلا۔ عورت کا شوہر ایک طرف دبکا ہوا تھا اور عورت بدستور میز کے نیچے چھپی ہوئی تھی۔

کئی گھنٹوں تک گولا باری ہوتی رہی، اس طرف کوئی گولا نہیں آیا پھر بھی زمین برابر لرزتی رہی جیسے شدید بھونچال آ گیا ہو، میز کے نیچے بیٹھی ہوئی عورت کسی ایسے گولے کی منتظر تھی جو اسے ایک ہی دھماکے میں موت کی گہری نیند سُلا دے لیکن اس کی یہ خواہش بھی اُنھی خواہشوں میں سے ایک ثابت ہوئی جو پوری نہیں ہوتی تھیں۔ پھر جب گولا باری رُک گئی اور کافی دیر تک کوئی دھماکا نہیں ہوا تو اُس کا شوہر اس کی طرف بڑھا۔ وہ گرد و غبار میں اَٹا ہوا میز کے قریب پہنچا۔ اس کا خیال تھا کہ بھاگا ہوا افسر پھر اس کی بیوی کے پاس آ گیا ہو گا۔ اندھیرے کی ایک دبیز چادر نے کمرے کی ہر چیز اپنی لپیٹ میں لے لی تھی، اس نے میز کے پاس آ کر اِدھر اُدھر ہاتھ بڑھاتے معمولی سی جستجو کے بعد وہ اپنی بیوی کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ اب بالکل برہنہ تھی حالانکہ گولا باری شروع ہونے سے پہلے اس کے بدن پر پھٹا ہوا لباس موجود تھا، اپنی بیوی کو تلاش کر لینے کے بعد بھی اس کے ہاتھ کسی دوسرے وجود کو تلاش کرتے رہے۔

بیوی بولی۔ ”کسے ڈھونڈ رہے ہو؟ افسر کو؟“

بیوی کی آواز سُن کر وہ بوکھلا گیا۔ ”نہیں تو۔“

”یہاں اور کوئی نہیں ہے، تم بے فکر رہو۔“ عورت نے میز کے نیچے سے نکلتے ہوئے کہا۔ ”مجھے ڈر لگ رہا تھا اس لیے میں نے کپڑے اُتار دیے تھے، کتنی عجیب بات ہے کہ کپڑے اُتارتے ہی میرا ڈر ختم ہو گیا۔“

وہ واقعی بے حد پُرسکون تھی لیکن اس کا شوہر خوف زدہ تھا، وہ اپنی بیوی کے قریب کھسک آیا اور دبی دبی آواز میں کہنے لگا۔ ”اب شاید یہاں کوئی نہیں آئے گا۔“

اسی وقت باہر گولیاں چلنے لگیں، چھوٹے چھوٹے گولے بھی

پھٹ رہے تھے، اس نئی اُفتاد سے دونوں میاں بیوی گھبرا گئے۔ شوہر کہنے لگا: "یہ صورت بے حد خطرناک ہے، چلو ہم تہہ خانے میں چل کے لیٹ جائیں۔ چلو، جلدی کرو۔"

لیکن عورت وہیں کھڑی رہی: "مجھے معلوم ہے، تم ڈر رہے ہو۔" اس کا لہجہ بہت عجیب تھا۔ "اپنے کپڑے اُتار دو، تمہیں بھی ڈر نہیں لگے گا۔ میری طرح۔"

شوہر نے بادلِ ناخواستہ کپڑے اُتارنے کی غرض سے قمیص کے بٹن کھولے ہی تھے کہ یکایک آسمان پر ایک روشنی پھیل گئی جیسے بجلی چمکی ہو، ساتھ ہی ملی جلی انسانی چیخوں نے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ شوہر کھڑا نہیں رہ سکا۔ وہیں فرش پر بیٹھ گیا۔

✠

یہ ان کے اپنے فوجی تھے۔ ان کے وطن کے محافظ، وہ دشمن کو پیچھے دھکیلتے ہوئے شہر میں آ گئے تھے، چند سپاہی اس مکان میں بھی آ گئے۔ روشنی کے جھماکے میں ان کی نظریں دودھ جیسے سفید اور گداز بدن والی برہنہ عورت پر پڑیں، ایک لمحے کے لیے وہ سکتے میں آ گئے، پھر وہ سب آگے بڑھے اور اُس کے خراشوں سے بھرے ہوئے بدن پر بھوکے بھیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑے، اس کے شوہر کو ایک طرف دھکیل دیا گیا۔ سپاہی کافی دیر تک یہ کھیل کھیلتے رہے پھر اچانک ان کا ایک افسر وہاں آ گیا۔ وہ سب سہم گئے۔ افسر کے ہاتھ میں ایک ٹارچ تھی جس کی روشنی اندھیرے کا سینہ چیر رہی تھی، وہ آگے بڑھا اور نیم برہنہ سپاہیوں کو عورت سے پرے دھکیل کر اس نے خود عورت کا ہاتھ پکڑ لیا۔ سپاہی ایک ایک کر کے باہر نکلنے لگے۔

اب اسی وطن کا ایک محافظ افسر ہانپتی ہوئی برہنہ عورت سے دل بہلا رہا تھا۔ دونوں کا لباس دُور پڑا تھا۔ افسر کی ٹوپی اس کے پیروں میں پڑی تھی۔

صُبح نے ابھی اپنی کرنیں نہیں سمیٹی تھیں، ملکی فوج کا افسر چند لوگوں کے ساتھ دوبارہ آیا۔ اس کے سب ساتھی سادہ کپڑوں میں ملبوس تھے اور ان کے کندھوں پر کیمرے اور ٹیپ ریکارڈر لٹکے ہوئے تھے، عورت ابھی تک فرش پر برہنہ اور نیم بے ہوش پڑی تھی، افسر کے کہنے پر ایک سپاہی نے ایک چادر اس کے بدن کے نچلے حصّے پر ڈھانپ دی، کیمرے حرکت میں آ گئے۔ فلش گنوں کی روشنیاں آنکھیں چکا چوند کرنے لگیں، ایک شخص نے ٹیپ ریکارڈر بھی آن کر دیا تھا۔

افسر بتا رہا تھا کہ "جب ہم یہاں پہنچے تھے تو یہ بے ہوش عورت باہر سڑک پر پڑی تھی، حملہ آوروں نے اس کا مکان لوٹ لیا تھا اور کئی درجن افراد اس کی آبرو ریزی کر چکے تھے، اس مظلوم عورت کے ساتھ اس قدر بہیمانہ سلوک کیا گیا تھا کہ یہ کرب اور تکلیف کی شدت سے بے ہوش ہو گئی تھی، ہم اسے اسپتال بھیجنے کا ارادہ رکھتے تھے۔" افسر نے عورت کی مخدوش حالت دکھانے کے لیے اس کی رانوں سے چادر ہٹا دی۔

سب لوگ نظارے کے لیے آگے بڑھے پھر ڈر کر فوراً پیچھے ہٹ گئے۔ عورت کے بدن پر چادر ڈال دی گئی۔ اس کے بعد عورت کا بیان ریکارڈ کیا گیا۔

ایک غیر ملکی اخباری نمایندے نے اس کا نام پوچھا مگر عورت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے بعد اس سے کوئی سوال نہیں کیا گیا۔ بیان مکمل ہونے پر وہ لوگ چلے گئے۔

اب صرف عورت اور اس کا شوہر رہ گئے تھے، کافی دیر کے گہرے سکوت کے بعد شوہر نے دریافت کیا: "کیا تم بہت زیادہ تکلیف محسوس کر رہی ہو؟" اس کا لہجہ بے حد نرم تھا: "تم نے بتایا تھا کہ اس نے ....."

عورت نے اس کی بات پوری نہیں ہونے دی، وہ طنزیہ ہنسی کے ساتھ بولی: "تم تہہ خانے میں چل کر لیٹنے کے لیے کہہ رہے تھے نا؟"

شوہر نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

"آؤ اب وہاں چل کر لیٹتے ہیں۔" عورت بولی۔

شوہر نے تہہ خانے میں جانے سے انکار کر دیا، معلوم نہیں کیوں اب اس کا ارادہ بدل گیا تھا۔ عورت شوہر کے انکار پر حیران تھی، وہ کہنے لگی: "آخر نہ جانے کی وجہ؟"

شوہر نے کوئی جواب نہیں دیا، عورت اُٹھ کر اس کے قریب پہنچ گئی۔ بالکل قریب۔ پھر اس نے چادر رانوں سے اُتار کر پھینک دی، شوہر نے ایک نظر اسے دیکھا پھر نظریں جھکا لیں۔

"چلو اٹھو!" عورت نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اُٹھاتے ہوئے کہا۔ "تہہ خانے میں چلتے ہیں۔"

شوہر بدستور سر جھکائے بیٹھا رہا۔ عورت بھی اس کے سامنے اکڑوں بیٹھ گئی۔ پھر اس نے شوہر کا چہرہ اپنی حنائی ہتھیلیوں میں لے کر بڑے پیار سے اُوپر اُٹھایا۔ کافی دیر بعد شوہر کی نگاہیں اُوپر اُٹھ سکیں۔ ٹھیک اسی وقت عورت نے اپنے شوہر کے منہ پر تھوک دیا اور اس کا ہتھیلیوں میں تھاما ہوا چہرہ چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ شوہر نے اپنا سر جھکا لیا۔

عورت ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے دُور خلا میں گھورنے لگی جیسے تیسری بار دھماکے شروع ہونے کی منتظر ہو۔ شدید دھماکے۔

سب رنگ

تاریک براعظم کا افسوں
سب رنگ کا ایک تحیر خیز پراسرار سلسلہ
۱۸

آکسفورڈ کا تعلیم یافتہ عرب نوجوان جابر بن یوسف الباقر ایک وجیہہ، جذباتی، تندی اور شگفتہ مزاج شخص تھا۔ اُسے اپنی زندگی میں ایسے تحیر خیز واقعات سے سابقہ پڑا جنھیں عقل تسلیم کرنے سے گریزاں رہتی ہے۔ جابر اپنی حسین و جمیل انگریز محبوبہ فلورا کے ساتھ بحری سفر کر رہا تھا کہ اُن کا جہاز گہرے پانیوں میں غرق ہو گیا۔ صدہا انسان لقمۂ اجل بن گئے۔ جابر اور فلورا کے سوا صرف چند بدنصیب زندہ بچے اور ایک ڈولتی ہوئی حفاظتی کشتی میں طویل سمندری مسافت طے کر کے تورگی نامی ایک جزیرے پر جا پہنچے جہاں ننگ دھڑنگ حبشیوں کے ایک مشتعل دستے نے اُن پر نیزوں کی بارش کر دی۔ یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ جابر، فلورا، ہندی بوڑھے سرنگا، سرنگا کی لڑکی سریتا اور ڈاکٹر جواد کو چھوڑ کر تمام مسافر موقع پر ہی ہلاک ہو گئے۔ زندہ بچنے والے پانچوں سخت جان ایک جھونپڑی میں لے جا کر قید کر دیے گئے۔ ان کی حرماں نصیبی اور بے بسی کا عالم دیدنی تھا۔ اُسی رات جزیرۂ تورگی کے ایک سردار شوالا نے سفید فام فلورا کو اپنے لیے منتخب کر کے اغوا کروالیا اور چند گھنٹوں بعد اُسے عجیب و غریب ہیئت کذائی میں مبتلا کر کے واپس بھجوا دیا۔ اب وہ سر سے پاؤں تک قطعاً برہنہ تھی اور توشا اور زیری نامی دو سانولی سلونی مقامی لڑکیاں اُس کی نگرانی پر مامور تھیں۔ جابر افریقی زبان میں کچھ شُد بُد رکھتا تھا۔ اُس نے اپنے ریزہ ریزہ حواس مجتمع کیے اور بوڑھے سرنگا کے مشورے پر توشا اور زیری کو ساحرانہ اور شاعرانہ گفتگو کے ذریعے شیشے میں اُتار کر جامِ جوانی سے سیراب کیا۔ وہ سرشار ہو گئیں۔ سرشاری کے عالم میں انھوں نے جابر کو گراں بہا معلومات فراہم کیں۔ جزیرۂ تورگی مقدس آقابلا کی وسیع و عریض سلطنت کا ایک حصہ تھا اور یہاں کی آبادی دو قبیلوں میں منقسم تھی۔ ایک قبیلے کا سردار شوالا اور دوسرے قبیلے کا سردار کالاری تھا۔ جزیرۂ تورگی میں جس شخص کے پاس جادوگر کاکا کی کھوپڑی ہوتی تھی اُسے اعزاز و فضیلت کا مستحق سمجھا جاتا تھا اور نحوستیں اُس سے دُور بھاگتی تھیں۔ ذہین جابر نے یہ معلومات گرہ میں باندھ لیں۔ دوسرے روز سفاک شوالا کی طرف سے توشا اور زیری کو اجنبی جابر سے بےتکلف ہونے کا یہ انعام ملا کہ زیری بر سرِ عام زندہ جلا دی گئی اور توشا کو آدم خور چیونٹیوں سے ڈسوا کر ہلاک کر دیا گیا۔ اس دہشت گردی پر جابر کے ساتھی ڈاکٹر جواد کا دماغ اُلٹ گیا۔ حبشیوں نے ڈاکٹر جواد کا بڑی توجہ سے علاج کیا مگر علاج کا طریقہ حد درجے وحشیانہ تھا۔ سیماب صفت جابر بے بسی اور مظلومیت کی موت مرنا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ اُس نے رات کے اندھیرے میں موقع پا کر دو پہرے داروں کو انھی کے نیزوں سے ہلاک کیا اور صبا رفتاری سے بھاگتا ہوا ایک معزز طبیب کے غار میں جا گھسا۔ طبیب خوابِ خرگوش میں مبتلا تھا۔ جابر نے اُسے ہمیشہ کی نیند سُلا دیا اور اُس کی جادوگر کاکا کی کھوپڑی اپنے قبضے میں لے لی۔ یہ جزیرۂ تورگی پر جابر کی پہلی فتح تھی۔ کھوپڑی گلے میں ڈال کر جابر نے راہِ فرار اختیار کی اور جنگلوں جنگلوں بھٹکنے کے بعد ایک سرنگ میں داخل ہو گیا۔ سرنگ کے اندر وہ زیادہ دُور نہیں گیا تھا کہ دفعتاً ایک کھنک دار نسوانی قہقہہ گونجا اور تاریک سُرنگ یکایک بقعۂ نور بن گئی۔ جابر کی متحیر آنکھوں نے دیکھا کہ ایک سراپا قیامت دوشیزہ اُس کے سامنے کھڑی تھی اور اُس سے تین افراد کے قتل کے سلسلے میں جواب طلب کر رہی تھی۔ یہ مقدس آقابلا کی ایک معمولی کنیز زرولین تھی۔ جابر نے اُسے بڑے دردناک پیرائے میں اپنی داستان سُنائی اور اپنے اقدام کا جواز پیش کیا اور شعلہ گفتاری کی حدت سے شبستانِ آقابلا کی اُس شمع کو لمحوں میں موم کر لیا۔ وہ تڑپ کر جابر کے کشادہ سینے میں آ سمائی۔ عین اُسی وقت آگ کا ایک پُراسرار گولا نمودار ہوا اور جواں عمر زرولین کو راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کر کے غائب ہو گیا۔ جابر پر بے ہوشی طاری ہو گئی۔ پھر جب دوبارہ اُس کی آنکھ کھلی تو وہ اپنی جھونپڑی میں تھا۔ سرنگا نے حیرت و اشتیاق سے اُس کی داستان سُنی اور فرطِ مسرت سے اُسے گلے لگا لیا۔ اُسی رات سریتا کسی غیر مرئی قوت کے زیرِ اثر ہرنی کی طرح زقند بھر کے جھونپڑی سے بھاگ نکلی۔ جابر نے جھنجوڑ کر سرنگا کو جگایا اور حالات سے مطلع کیا۔ سرنگا ایک صاحبِ اسرار بڈھا تھا۔ اُس کی جیب میں ہر وقت ایک مورتی رکھی رہتی تھی۔ اُس نے مورتی جیب سے نکال کر سامنے رکھی اور زیرِ لب کچھ پڑھنے لگا۔ مورتی نے آناً فاناً ایک مجسم دیوی کا روپ دھار لیا اور مؤدب سرنگا سے کسی نامعلوم زبان میں کچھ باتیں کر کے رخصت ہو گئی۔ جابر ششدر رہ گیا۔ سرنگا نے وحشت و اضطراب کے عالم میں اُس سے اصرار کیا کہ مجھے زرولین کی سُرنگ میں لے چلو۔ جابر تیار ہو گیا۔ وہ دونوں بڑے ڈرامائی حالات میں وہاں سے فرار ہوئے مگر منزلِ مقصود تک نہ پہنچ سکے کیونکہ گھنے جنگلوں کے درمیان اچانک کسی ماورائی طاقت نے سرنگا کو پتھر کا بُت بنا دیا۔ زود حس جابر جان بچا کر صحرائی اونٹ کی طرح بھاگتا ہوا ایک غار میں پناہ گزیں ہو گیا۔ یہ غار جزیرۂ تورگی کے کاہنِ اعظم سمورال کی اقامت گاہ تھا۔ سمورال نے گم گشتہ راہ جابر کو اپنی پناہ میں لے لیا۔ اُس کے کم سن بیٹے جرال اور گداز بدن والی نوعمر لڑکی ترام نے جابر کی فیاضانہ مدارات کی۔ جابر نے بھی ترام کی دل داری میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ یہاں جابر نے ایک طویل عرصے بعد سکون کے کچھ دن گزارے۔ کاہنِ اعظم کے عبادت خانے میں مختلف اور گوناگوں طلسمات کے علاوہ ایک کڑھاؤ بھی تھا جس کے جلتے ہوئے تیل میں کاہن حسبِ منشا باہر کے واقعات کسی فلم کے مناظر کی طرح دیکھ لیتا تھا۔ ایک دن اُس نے جابر کی گزارش پر سرنگا اور سریتا کے حالات دیکھے۔ معلوم ہوا کہ سرنگا اپنی اصل ہیئت میں آ چکا ہے اور بیابانوں کی خاک چھانتا پھر رہا ہے۔ اور سریتا جزیرۂ تورگی کے دوسرے سردار کالاری کی تحویل میں بےکسی کے دن کاٹ رہی ہے۔ جابر نہیں چاہتا تھا کہ فلورا کے بعد سریتا بھی حبشیوں کی ہوس کا نشانہ بن جائے اس لیے ایک روز وہ موقع پا کر غار سے نکلا اور سیدھا کالاری کے سر پر جا پہنچا۔ کالاری نے مظلوم سریتا کو اُس کے لباس کی قید سے آزاد کر دیا تھا اور اب اُسے اپنی خواہشوں کے میلے غلاف میں ملبوس کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جابر ضبط نہ کر سکا۔ اُس نے نتائج سے بے پروا ہو کر سیلِ تُند کی طرح کالاری پر ہلّا بول دیا۔ کالاری معمولی طاقتوں کا حامل نہیں تھا۔ سرنگا کی دیوی نے بروقت جابر کی مدد کی اور جابر نے اس غیر متوقع رسد سے بھرپور فائدہ اُٹھاتے ہوئے کالاری کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ کالاری کا بندر کاہو اچک کر جابر کے شانے پر چڑھ گیا اور قبیلے کے لوگ شور مچاتے اپنے سردار کے قاتل کی طرف لپکے۔ جابر نے برہنہ سریتا کو اپنی پُشت پر لادا اور غیر معمولی تیز رفتاری سے دوڑتا ہوا کاہن کے غار میں پہنچ گیا۔ ترام نے سریتا کو خشمگیں نگاہوں سے دیکھا مگر زبان سے کچھ نہیں بولی۔ کاہنِ اعظم سمورال نے خلافِ توقع جابر سے کوئی باز پُرس نہیں کی بلکہ یہ انکشاف کر کے اُسے متحیر کر دیا کہ چونکہ اُس نے کالاری پر غلبہ پایا ہے اس لیے اب کالاری کا منصب اُسے سونپ دیا جائے گا۔ جابر نے فرطِ مسرت سے سمورال کے ہاتھ چوم لیے اور ایک عجیب و غریب جسارت کی۔ اُس نے کاہن سے ترام مانگ لی۔ کچھ پس و پیش کے بعد کاہن رضامند ہو گیا اور ایک سادہ مگر باوقار تقریب میں ترام زندگی بھر کے لیے جابر کی آغوش میں ڈال دی گئی۔ سریتا سہمی سہمی نظروں سے یہ تماشا دیکھتی رہی۔ جابر نے چند روز تک کاہنِ اعظم سے سرداری کے رموز کی تربیت حاصل کی پھر ترام کے پہلو بہ پہلو نہایت تزک و احتشام سے اپنے مفتوحہ قبیلے میں پہنچا۔ اُس کی تاج پوشی کا جشن نہایت دھوم سے منایا گیا۔ اُسے برہنہ کر کے جانوروں کے خون سے غسل دیا گیا۔ کالاری کی تمام بیویاں اُس کے تصرف میں آ گئیں اور کالاری کا معمر نائب ابالیش اُس کا نائب بن گیا۔ جابر نے اپنے قبیلے میں عہد آفریں اصلاحات کیں اور اپنے معاصر شوالا سے سفارتی تعلقات قائم کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اُس سے فلورا کی واپسی کا مطالبہ کر دیا۔ بد باطن شوالا نے یہ انقلاب دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ اُس نے جابر کا مطالبہ حقارت سے ٹھکرا دیا۔ یہ جابر کے وقار کا مسئلہ تھا۔ اُس نے اس سلسلے میں قوت آزمانے کا فیصلہ کر لیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی عملی قدم اُٹھاتا اُسے آقابلا کے دربار میں طلب کر لیا گیا۔ زرولین آقابلا کی پیام بر بن کر آئی۔ جابر اُسے دوبارہ زندہ دیکھ کر متعجب رہ گیا مگر یہ اسرار و افسوں کی سرزمین تھی۔ یہاں سب کچھ ممکن تھا۔ زرولین اُسے مختلف عجائب کی کہکشاں سے گزارتی ہوئی قصرِ آقابلا میں لے گئی۔ صد ہا تمثال قد پریوں نے انھیں جھک کر تعظیم دی پھر زرولین اُسے مطلق العنان ملکہ آقابلا کی مخصوص نشست گاہ میں پہنچا کر غائب ہو گئی۔ در و دیوار سے نغمے اُبل رہے تھے۔ بڑا رنگین، جذبات پرور اور خواب ناک ماحول تھا۔ چند لمحوں بعد رفیع الشان آقابلا اپنے زرنگار تخت پر نمودار ہوئی اور جابر سے کچھ فاصلے پر جلوہ فگن ہو گئی۔ وہ کرۂ ارض کا سب سے خوبصورت، سب سے پُرجلال پیکر تھا۔ جابر مبہوت رہ گیا۔ یہ پہلی باریابی تھی۔ آقابلا نے جابر سے براہِ راست تخاطب نہیں کیا۔ اُس کی پری صورت نائب اشمار جابر سے ہم کلام ہوئی اور جابر سے شوالا کے سلسلے میں حدود سے تجاوز کرنے پر جواب طلب کیا گیا۔ جابر نے جواباً فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیے۔ اُس نے تمام تر جزئیات کے ساتھ ایک دل نشیں اسلوب میں اپنی آزردہ گیں سرگزشت دہرائی اور فلورا کی واپسی کے مطالبے میں اپنے آپ کو حق بجانب ثابت کیا۔ اُس کی شیریں بیانی کارگر ہوئی۔ آقابلا نے اسے ایک خوش ذائقہ مشروب کے علاوہ اپنے لمسِ لطیف سے نوازا اور حکم جاری کیا کہ جابر اور شوالا کے درمیان ایک مقابلہ منعقد کیا جائے اور جو فریق فتح مند ثابت ہو وہ مفتوح کی کوئی ایک شے طلب کر سکتا ہے۔ قصرِ آقابلا سے واپسی جابر کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی۔ وہ مکمل طور پر زلفِ آقابلا کا اسیر ہو چکا تھا اور مقابلے کے انعقاد کا بڑی شدت سے منتظر تھا کیونکہ اُس موقع پر اُسے دوسری بار اُس کا دیدار نصیب ہونے والا تھا۔ آخر جزیرۂ تورگی کا وہ یادگار دن آ پہنچا۔ ایک بڑے میدان میں دونوں قبیلوں کے لوگ جمع ہونے لگے۔

گزشتہ قسطوں کا خلاصہ

جابر بن یوسف الباقر

مقدس اقابلا کا مرصع تخت سب سے ممتاز مقام پر فائز تھا۔ شوالا پوری طرح تیار ہو کر آیا تھا۔ جابر کے حوصلے بھی بہت بلند تھے کیونکہ اُسے بہر صورت اقابلا کی نظروں میں سُرخ رُو ہونا تھا۔ چنانچہ جیسے ہی کاہن اعظم نے مقابلے کے آغاز کا اعلان کیا، جابر بپھرے ہوئے شیر کی طرح شوالا پر جھپٹا۔ شوالا بھی غافل نہیں تھا۔ دونوں طرف سے پے در پے حملے ہونے لگے۔ جابر نے جان لڑا دی مگر چونکہ شوالا اُس سے کہیں زیادہ طاقت ور تھا اس لیے جلد ہی جابر کے قدم اُکھڑ گئے۔ قریب تھا کہ جابر ہار جاتا مگر عین موقع پر سرنگا کی پُراسرار دیوی نے دوسری بار اُس کی مدد کی اور جابر دیکھنے والوں کی توقع کے بالکل خلاف یہ بازی بھی جیت گیا۔ قوی الجثہ شوالا چاروں خانے چت پڑا تھا۔ جابر کے قبیلے نے تحسین آمیز نعروں کا غلغلہ بلند کیا اور کاہن اعظم نے جابر کو فاتح قرار دیتے ہوئے اُسے شوالا کے تصرف کی کوئی چیز طلب کرنے کا اشارہ کیا۔ جابر اقابلا کی موجودگی میں اپنی زبان سے فلورا کو مانگنے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ اُس نے فلورا پر فیصلہ چھوڑ دیا۔ فلورا نے حیرت انگیز طور پر شوالا کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ یہ ایک چونکا دینے والی بات تھی۔ جابر اپنے آپ کو شکست خوردہ محسوس کرنے لگا۔ دوسری طرف اقابلا کے حکم پر سرنگا کی دیوی کو مداخلت کی پاداش میں شیشے کے ایک قدِ آدم جار میں مقید کر دیا گیا لیکن دیوی فوراً جار توڑ کر فرار ہو گئی۔ اُسی وقت غریب سرنگا پر اقابلا کا عتاب نازل ہوا اور اُس کے نحیف و نزار جسم پر بڑے بڑے آبلے پڑ گئے۔ وہ بُری طرح تڑپنے لگا۔ چند روز بعد ایک عجیب افتاد پڑی۔ جابر کو اپنے نائب ابالیش اور بندر کامبو کی وفاداریاں مشکوک ہونے کی اطلاع ملی۔ اُس نے تحقیق کی تو یہ اطلاع صحیح ثابت ہوئی۔ دل شکستہ جابر نے ابالیش کو فوراً ہلاک کر دیا مگر کامبو اُس کی دسترس سے نکل بھاگا اور اِس سے پہلے کہ جابر اُسے تلاش کر کے کیفرِ کردار کو پہنچاتا اُس کامبو نے موقع پا کر ترام کی زندگی کا چراغ گُل کر دیا اور کہیں فرار ہو گیا۔ جابر تلملا کر رہ گیا۔ اُس کے سینے سے دل نوچ لیا گیا تھا۔ اُسے ہمدردی اور غم گساری کی شدید ضرورت تھی۔ یہ ضرورت اُس کے اقربا کاہن اعظم اور جبرال پوری کر سکتے تھے لیکن انھوں نے نامعلوم وجوہ کی بنا پر اُسے دھتکار دیا اور اُس سے تمام تعلقات منقطع کر لیے۔ ترام کی تدفین خفیہ طور پر انجام دی گئی، اُس میں بھی جابر کو شریک نہیں کیا گیا۔ یہ معمولی صدمے نہیں تھے مگر حوصلہ مند جابر نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ تمام تر نفسانی خواہشات سے کنارہ کش ہو کر محض اقابلا کے لیے وقف ہو کے رہ گیا۔ اُسے ترکِ لذت اور تجرد کی اِس روش کا انعام یہ ملا کہ مہربان اقابلا نے اپنی پری پیکر نائب اشمار اُسے بخش دی۔ اشمار اقابلا کا تحفہ تھی۔ جابر نہال ہو گیا۔ اُس نے اِس حسینہ کو گلاب کی طرح نچوڑا اور شراب کی طرح پیا۔ اشمار نے اُسے کچھ پُراسرار علوم بھی سکھائے۔ اشمار کی دل نواز قربت نے جابر کو اقابلا کے حصول کے لیے اور زیادہ بے چین کر دیا۔ اشمار نے اُسے بتایا کہ اقابلا تک رسائی حاصل کرنے کے لیے اُسے جزیرۂ بالگمان کی کٹھن تربیت سے گزرنا ہوگا۔ جابر تو جان سے گزرنے کے لیے تیار تھا۔ وہ لمحے گننے لگا۔ ابھی دونوں اس کے قبیلے میں ایک [illegible] پیش [illegible]۔ جابر کے پُرانے ساتھی ڈاکٹر جواد نے بھولی سرینا کو اغوا کر کے اُس پر مجرمانہ حملہ کرنے کی کوشش کی۔ جواد اس سے پہلے کچھ طبی خدمات کے باعث اقابلا کی طرف سے خصوصی مراعات حاصل کر چکا تھا اسی لیے ایک طاقت ور اقابلو اُس کی نگرانی پر تعینات تھا۔ اقابلو اقابلا کے خصوصی حفاظتی دستے کے سپاہیوں کا نام تھا۔ اقابلو کی موجودگی میں جزیرے کا کوئی فرد ڈاکٹر جواد کو اُس کے ناپاک ارادے سے باز رکھنے کی جسارت نہیں کر سکتا تھا لیکن ابھی سرینا کی دوشیزگی لٹنے کا وقت نہیں آیا تھا چنانچہ کسی پُراسرار قوت نے بڑے ڈرامائی انداز میں اقابلو کو ہلاک کر کے سرینا کو روپوش کر دیا۔ ساتھ ہی اشمار بھی کہیں غائب ہو گئی۔ یہ سب کچھ اس قدر اچانک ہوا تھا کہ جابر کو کوئی قدم اُٹھانے کی مہلت نہ مل سکی اور اُسے اُسی دن اقابلا کی بارگاہ سے فوراً بالگمان روانہ ہونے کا حکم مل گیا۔ جابر ایک خودکار کشتی میں طویل سمندری سفر طے کر کے بالگمان پہنچ گیا۔ بالگمان تاریک برِاعظم کی تاریک ترین بستی تھی۔ وہاں ہر وقت گہرا اندھیرا طاری رہتا تھا۔ لوکاسا نامی ایک ذلیل اور ظالم خبیث جزیرے کا سردار تھا لیکن اُسے مقدس لوریا کی ماتحتی میں کام کرنا پڑتا تھا کیونکہ لوریا اقابلا کی نمائندہ تھی۔ سب سے دلچسپ اور عجیب امر یہ تھا کہ ماتحت سردار کو لوریا کے شفاف مرمریں بدن پر تصرف حاصل رہتا تھا۔ یہ بات حسن پرست جابر کے لیے مہمیز کی حیثیت رکھتی تھی۔ بہرحال بالگمان میں جزیرۂ توری کے معزز سردار جابر بن یوسف الباقر کو اپنی اوقات معلوم ہو گئی۔ تریسا نامی ایک گداز بدن دوشیزہ نے اسے اپنے اور سانپ کے خون کا آمیزہ پلایا۔ یہ دیوتاؤں کا مشروب تھا۔ جابر نے طوعاً و کرہاً اسے حلق سے اُتارا۔ اُسی وقت بندر کامبو کہیں سے نمودار ہوا اور اُس نے جابر کو کچھ سوچنے کا موقع دیے بغیر مشروب کے بچے ہوئے قطرے چاٹ لیے۔ قطرے چاٹتے ہی اُس کی ہیئت یکسر بدل گئی۔ جابر کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ اب اُس کے سامنے کسی بندر کے بجائے ایک معتبر ترین حبشی کھڑا کہہ رہا تھا کہ وہ کسی زمانے میں جزیرۂ توری کی ایک برگزیدہ شخصیت تھی جسے مقدس اقابلا نے سزا کے طور پر بندر بنا دیا تھا۔ کامبو اب مشروب پینے کے بعد ایک نئی زندگیٔ جاوید و روح بن بیٹھا تھا اور اس عظیم تبدیلی کے لیے جابر کا تہہِ دل سے شکرگزار تھا۔ چند لمحوں بعد کامبو یکایک نظر سے اوجھل ہو گیا اور حیران و سراسیمہ جابر کو مجرموں کی طرح لوکاسا کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ لوکاسا نے لیبغو سے اس کی تواضع کی۔ لیبغو سڑے ہوئے انسانی گوشت کے لوتھڑوں کا نام تھا۔ مہذب جابر نے بڑی خندہ پیشانی سے لیبغو زہر مار کر لیا مگر لوکاسا کے اہانت آمیز رویے میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بالگمان میں ہر سال جشنِ لوریا منایا جاتا تھا جس میں مختلف کھیل کرتب، مظاہرے اور جسمانی طاقت کے مقابلے پیش کیے جاتے تھے۔ لوریا کی نظروں میں آنے کے لیے جابر جشن کے موقع پر جسمانی طاقت کے مقابلے میں بے خطر کود پڑا اور اپنی ناقابلِ شکست خود اعتمادی اور کامبو کی رُوح کے تعاون سے فتح مند قرار پایا۔ حسین لوریا نے اُسے دُزدیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنی دو ملازمائیں مرحمت کیں۔ لوکاسا کے لیے جابر کا یہ اعزاز خطرے کی گھنٹی کی حیثیت رکھتا تھا لہٰذا اُس نے نہایت عیاری سے لوریا کی اجازت لے کر جابر کو سخت ترین آزمائشوں کے لیے صحرائے زارشی بھیج دیا۔ زارشی میں جابر نے جدوجہد اور جنگ و جدل کے کئی برس گزارے۔ اُس نے سال خوردہ بوڑھوں کے ساتھ آگ کے گرد بیٹھ کر اپنی زندگی کی طویل ترین ریاضت کی اور اجر کے طور پر شپالی کا تحفہ حاصل کیا۔ شپالی مقدس آگ کا ایک دہکتا ہوا انگارا تھا جو جابر کی ہتھیلی میں آتے ہی گوہرِ آب دار بن گیا۔ اس معرکے کے بعد جابر نے دوسری مہمات بھی سر کیں۔ اُس نے [illegible] کا ایک شیر خوار بچے کا خون کیا اور [illegible] نامی ایک عجیب الخلقت اور جسیم جانور سے خطرناک جنگ کر کے اُسے ہلاک کیا اور اُس کے سینگ یادگار کے طور پر محفوظ کر لیے۔ زارشی میں اُس کی ملاقات بالگمان کے سابق سردار اسٹالا سے ہوئی۔ نیک دل اسٹالا لوکاسا کی سازشوں سے معزول ہوا تھا اور لوریا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے زارشی کے لق و دق صحراؤں میں بھٹکتا پھر رہا تھا۔ جابر بالآخر [illegible] کے ساتھ اسٹالا سے رخصت ہو کر بالگمان لوٹ آیا۔ زارشی کے قیام نے اُسے ایک قوت ور شخص بنا دیا تھا چنانچہ اُس نے وقت ضائع کیے بغیر ذی مرتبت لوریا کی ایما سے لوکاسا کو چیلنج دے دیا۔ عاقبت نااندیش لوکاسا نے چیلنج قبول کر لیا اور مقابلے کے روز بدمست ہاتھی کی طرح جابر پر ٹوٹ پڑا۔ گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ دست و بازو کی توانائی کے علاوہ پُراسرار علوم کے حربے بھی آزمائے گئے۔ خوش قسمتی جابر کا سب سے بڑا ہتھیار ثابت ہوئی اور مغرور لوکاسا کو ایک ذلیل اور عبرت ناک موت سے دوچار ہونا پڑا۔ نتیجۃً بالگمان کی سرداری کا گجرا بھی جابر کے گلے میں ڈال دیا گیا اور سیم تن لوریا کی پھڑکتی ہوئی بانہیں اُس کے گرد حمائل ہو گئیں لیکن جابر کا مطلوبِ حقیقی لوریا نہیں تھی اس لیے جابر نے اُس سے دست کش ہو کر اُس کا شیشۂ دل چور چور کر دیا۔ بالگمان میں جابر نے انقلابی اصلاحات نافذ کیں اور زارشی سے اسٹالا کو بُلا لیا۔ اسٹالا سے اُس نے بعض باطنی علوم میں مہارت حاصل کی اور کچھ مدت بعد اُسے اپنی نیابت تفویض کر کے بے شمار آنسوؤں، دعاؤں اور تحفوں کی جلو میں اپنے گھر یعنی اقابلا کے مرکز جزیرۂ توری کی طرف روانہ ہو گیا۔

بیچ سمندر میں اُس کی کشتی طوفان میں پھنس گئی اور کسی غیر مرئی قوت نے اُسے انگرو ما نامی ایک اجنبی جزیرے پر پہنچا دیا۔ یہ سلطنتِ اقابلا کے برگزیدہ ترین لوگوں کا جزیرہ تھا جو اقابلا سے باغی ہو چکے تھے اور اُس کے خلاف محاذ آرائی کا گمبھیر منصوبہ بنا رہے تھے۔ انھوں نے جابر کو بھی اپنی تحریک میں شمولیت کی دعوت دی لیکن جابر اقابلا کے مخالفین کا ساتھ کیسے دے سکتا تھا؟ اہلِ انگرو ما نے اُس کی خوب خاطریں کیں اور کیشا نامی ایک حسین اور جوان لڑکی اُس کے سپرد کر دی۔ کیشا مجسمے کی صورت میں محفوظ رکھی جاتی تھی۔ اُسے جابر کے لیے خاص طور پر متحرک کیا گیا تھا لیکن جابر اُس سے متمتع نہیں ہوا۔ وہ مسلسل چھ مہینے تک واپسی کی کوششوں میں سرگرداں رہا مگر تمام راستے مسدود تھے۔ آخر تھک کر اُس نے اپنی صلاحیتیں بڑھانے کے خیال سے اہلِ انگرو ما سے مفاہمت کر لی۔ جزیرے کے نگراں گرفتا نے اُسے ایک صاحبِ کمال شخص گوریمے کے سپرد کر دیا۔ گوریمے نے جابر پر بہت محنت کی۔ جابر بہترین شاگرد ثابت ہوا۔ اُس نے گوریمے سے مجسمے متحرک کرنے کا فن سیکھا اور اُس کے ساتھ ایک عجیب و غریب جانور ببریکا کا شکار کھیلا۔ گوریمے نے دو ببریکا مار کر اُن کی آنکھیں نکال لیں پھر دو آنکھیں اُس نے سمندر میں پھینک دیں اور دو محفوظ کر لیں۔ یہ آنکھیں سمندر میں ہونے والی نقل و حرکت سے باخبر رہنے کا حیرت انگیز ذریعہ تھیں۔ گوریمے نے جابر کو بوڑھوں کے غار کی سیر بھی کرائی۔ یہ ایک دہشت ناک تجربہ تھا۔ وہاں جا کر جابر نے پامردی اور استقلال کی ایک ناقابلِ فراموش مثال قائم کی۔ گوریمے نے خوش ہو کر اُسے لازوال حسینہ نیشا سے نوازا۔ نیشا گلستانِ اقابلا سے توڑا ہوا ایک پھول تھی اور مشروبِ حیات نوش کر چکی تھی۔ جابر نے تمام مصلحتیں بالائے طاق رکھ کر اُسے اپنی آغوش میں بھر لیا اور خوب گُل کھلائے۔ انھی ہنگاموں میں ڈھائی برس گزر گئے۔ آخر جابر کا جذبۂ صادق رنگ لایا اور ایک روز سرنگا کی دیوی اچانک اُس کی نجات دہندہ بن کر انگرو ما پہنچ گئی۔ انگرو ما کے طاقت وروں نے بروقت مجتمع ہو کر دیوی اور جابر کا راستہ مسدود کر دیا۔ زبردست کشمکش ہوئی۔ جابر کا نچلا دھڑ پتھر میں تبدیل کر دیا گیا۔ وہ موت کی آرزو کرنے لگا لیکن دیوی ایک طویل تگ و دو اور مشکلات سے لبریز آزمائش کے بعد جابر کو دوبارہ متحرک کر کے انگرو ما سے نکالنے میں کامیاب ہو گئی۔ چلتے وقت جابر نے گوریمے کا طلسم کدہ جلا ڈالا اور آٹھ آنکھوں والا نایاب پتھر اپنے قبضے میں لے لیا۔ جابر ایک لمبی مدت بعد امنگوں اور آرزوؤں کا طویل سفر کر کے اپنے وطن جزیرۂ توری پہنچا۔ اُس کا کشادہ سینہ متنوع لوازم سے آراستہ تھا۔ قبیلے کے لوگ اپنے باعظمت سردار کے حضور سجدہ ریز ہو گئے۔ جابر کی واپسی کا جشن اتنی دھوم سے منایا گیا کہ توری کی تاریخ میں پہلے کبھی نہ منایا گیا ہوگا۔ اِس عرصے میں بے شمار لڑکیاں جوان ہو گئی تھیں۔ انھیں جابر کی خدمت میں پیش کیا گیا لیکن جابر نے یہ پیش کش قبول نہیں کی کیونکہ اُس کے تصور کا محور و مرکز صرف اقابلا تھی۔ جابر پرندوں کی طرح اُڑ کر اُس تک پہنچ جانا چاہتا تھا مگر اقابلا کی طرف سے کوئی سلسلہ جنبانی نہ ہوئی۔ کاہن اعظم کی جانب سے بھی مکمل سناٹا طاری تھا۔ خاصے انتظار کے بعد جابر نے اُس کی بے نیازی ختم کرنے کے لیے ایک عجیب نسخہ سوچا۔ اُس نے اپنے معاصر شوالا کے قبیلے میں یہ خبر مشہور کروا دی کہ جزیرۂ توری کا طاقت ور اور اعزاز یافتہ سردار جابر بن یُوسف الباقر عنقریب شوالا کے علاقے پر حملہ آور ہوگا لہٰذا امن پسند لوگ اس قہر سے محفوظ رہنے کی خاطر ہجرت کر کے جابر کی حدود میں آنا چاہیں انھیں سیاسی پناہ دی جائے گی اور ان کے رہنے سہنے کا بہترین انتظام کیا جائے گا۔ شوالا کے لوگ اُس کی درندگی سے پہلے ہی عاجز تھے چنانچہ وہ جوق در جوق جابر کے علاقے میں منتقل ہونے لگے۔ چند ہی روز میں نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ شوالا کے پاس ڈاکٹر جواد، فلورا اور چند دوسرے وفاداروں کے سوا کوئی نہ رہا۔ اُن دنوں جزیرۂ سبز نار کا ایک قوی ہیکل شخص زربگا بھی اُس کا مہمان تھا جس نے جابر کی غیر موجودگی میں اُس کے قبیلے کی سرداری حاصل کرنے کا خواب دیکھا تھا۔

شوالا نے مغلوب الغضب ہو کر عیاری سے چند ہجرت کرنے والوں کو پکڑوا کر انھیں درختوں سے باندھ کر پیٹا، اُن کے بازو قلم کر دیے اور اُن کی زبانیں کاٹ لیں۔ یہ ایک اشتعال انگیز اقدام تھا۔ جواباً جابر نے بھی شوالا کے چند سربرآوردہ لوگوں کو گرفتار کر لیا۔ اُن میں زاریے بھی تھا۔ زاریے اپنی ریاضت اور مہارت کے باعث ایک ممتاز درجہ رکھتا تھا۔ جابر نے اُسے اپنا دوسرا نائب نامزد کر دیا۔ زاریے سے اُسے سلطنتِ اقابلا کے دیگر جزائر کے متعلق کچھ مخفی معلومات حاصل ہوئیں۔ جزیرہ سبز نار کے متعلق معلوم ہوا کہ وہاں زربگا کا بھائی ارمنگا حکومت کرتا ہے اور جالوش نامی ایک صد سالہ ساحر وہاں مقیم ہے۔ جابر کے لیے یہ معلومات بڑی اہمیت رکھتی تھیں مگر سب سے

سب رنگ

پہلے اُسے شوالا کا قصّہ پاک کرنا تھا۔ اُس نے کاہن اعظم کو حالات کی سنگینی کی اطلاع بھجوا کر شوالا سے مبارزت کی اجازت طلب کی۔ کچھ عرصے بعد کاہن ایک روز اچانک وارد ہوا۔ اُس نے یہ خوش خبری سنائی کہ مقدس اقابلا نے مقابلے کی اجازت دے دی ہے اور سرنگا کو معاف کر دیا ہے۔ سرنگا اُن دنوں دُور ایک غار میں معتکف تھا۔ جابر اُس سے مل چکا تھا اور وہاں سے سرینا کو اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ مقابلے کی تیاری زور و شور سے ہونے لگی۔ اسی دوران ایک دن ڈاکٹر جواد بھی آ پہنچا اور جابر کی نرم دلی سے فائدہ اُٹھا کر اُس کے قبیلے میں قیام پزیر ہو گیا۔ پھر مقابلے سے کچھ پہلے وہ بد طینت بڑی مکاری سے جابر کو زہر دے کر فرار ہو گیا مگر بروقت علاج نے جابر کی جان بچالی۔ جواد کا یہ اقدام اُس کے لیے ناقابلِ فہم اور غضب انگیز تھا۔ بہرحال مقابلے کا تاریخی دن آ پہنچا۔ یہ جزیرۂ توری کا آخری اور فیصلہ کن معرکہ تھا۔ شوالا معابد گاہ میں اکیلا تھا کیونکہ فلورا کو اُس نے زربگا کے ساتھ سبز نار بھیج دیا تھا۔ فلورا کا اس طرح بالا ہی بالا نکل جانا جابر کے لیے معمولی واقعہ نہیں تھا۔ وہ بھوکے شیر کی طرح شوالا پر ٹوٹ پڑا۔ معرکہ کڑا لڑائی ہوئی۔ آخر جابر کی شپالی اور چوبی اژدہے کے حملوں سے مغرور شوالا عبرت ناک شکست سے دوچار ہو گیا اور جابر نے اُس کا دھڑ پتھر میں تبدیل کر دیا۔ فتح کے نقارے بجنے لگے۔ جابر دونوں قبیلوں کا سردار تسلیم کر لیا گیا۔ مقدس اقابلا کی طرف سے اُسے بہشتِ اقابلا کی ایک حُور ترماز انعام کے طور پر عطا کی گئی لیکن جابر اتنی مشقت، اتنی تگ و دو کے بعد محض کنیزوں، محض کھلونوں سے بہلنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ دل برداشتہ ہو کر کاہن کی خدمت میں پہنچا۔ کاہن نے اُس کی ڈھارس بندھائی اور حقیقتِ حال کے نشیب و فراز اور سیاق و سباق سمجھا کر اُسے اور زیادہ منزلیں مارنے اور زیادہ معرکے سر کرنے کی ترغیب دی۔ جابر اپنے آپ سے بہت آگے نکل آیا تھا اس کے باوجود اقابلا ابھی اُس سے بہت دُور تھی۔ چنانچہ جابر نے کاہن کے تلمذ میں اسرار و رموز کے کچھ اور سمندر عبور کرنے کا فیصلہ کیا اور اُس کا باقاعدہ شاگرد بن گیا۔ کاہن کا تبحر جابر کی توقعات سے کہیں زیادہ ثابت ہوا۔ اُس نے جابر کو اتنے نئے اور دُور رس نکات تعلیم کیے کہ وہ حیران رہ گیا۔ جابر نے اُس سے طلسمی کرشمے اور منظر اُبھارنے کا فن اکتساب کیا اور دوسرے حیرت انگیز اعمال سیکھے۔ کاہن نے ایک عجیب الخلقت، جسیم اور خوف ناک درندے رٹ کا مغز اُسے کھلایا اور اُس کی مادہ کا توانائی بخش دودھ پلایا۔ پھر اُن دونوں نے متعدد جنگلی سانپ پکڑے اور انھیں چوبی شکلوں میں محفوظ کر لیا۔ یہ تجربات اتنے تعجب انگیز، ہول ناک اور دلچسپ تھے کہ انھوں نے جابر کی تمام تر توجہ کھینچ لی اور جابر فرائض و امورِ ریاست کو اپنی نیابت تفویض کر کے انھی مشاغل کا ہو رہا۔ کاہن نے اُسے مشورہ دیا کہ وہ تجرد کا رویہ ترک کر دے اور اقابلا کے عطیے ترماز اور دوسری تتلیوں سے جی بھر کے تمتع حاصل کرے۔ چنانچہ جابر نے اپنے دریائے جذبات کے تمام بند توڑ دیے اور ترماز کی خنک، شیریں اور شفاف سلسبیل میں غوطہ زن ہو گیا۔ ترماز اُس کے لیے ایک ناقابلِ فراموش تجربہ تھی۔ قبیلے کی دیگر قابلِ ذکر دوشیزائیں بھی جابر کی آغوشِ گرم سے محروم نہ رہیں۔ سرینا بڑے تحمل سے یہ ڈرامے دیکھتی رہی۔ ایک روز جابر نے کاہن کے [illegible] سے مفرور جواد کا سُراغ لگا کر اُسے گرفتار کروا لیا۔ وہ سامنے آیا تو جابر کے منہ سے جھاگ نکلنے لگے۔ وہ اُس کے حق میں کوئی سخت فیصلہ کرنے والا تھا کہ یکایک سرنگا اپنا طویل اور اہم عمل چھوڑ کر وہاں پہنچا اور اُس نے جواد کی جاں بخشی کرا دی کیونکہ جواد نے جابر کو زہر دینے کی مذموم حرکت فلورا کے اُکسانے پر کی تھی۔ اس ناقابلِ یقین انکشاف سے جابر کے سینے میں کوئی چیز مسمار ہو گئی۔ اُس نے بہ وقت اپنے آپ پر قابو پایا۔ چند روز بعد اُسے اچانک خبر ملی کہ ساحل پر مہذب دنیا کا کوئی قافلہ اُترا ہے۔ یہ ایک بہت بڑا [illegible] تھا۔ جابر سرپٹ دوڑتا ہوا ساحل پر گیا۔ چار سفید فام آدمی مقامی لوگوں کے نیزوں کی نذر ہو چکے تھے۔ گیارہ افراد زندہ تھے جن میں چار عورتیں تھیں۔ ایک خستہ حال اور خوبصورت لڑکی بھی تھی۔ متمدن جابر نے فی الحال انھیں قیدی بنا لیا اور اُن کے کھانے پینے کے انتظام کا حکم جاری کیا۔ اُسی وقت خوش جمال اقابلا کی جلالی بارگاہ میں اُسے طلب کر لیا گیا۔

جزیرۂ توری

میں سفید فام لوگوں کی غیر متوقع آمد نے مجھے شدید اُلجھنوں سے دوچار کر دیا۔ ایک سردار کی حیثیت سے میری ذمّے داریاں بڑی اہم تھیں۔ وقت اپنے آپ کو دہرا رہا تھا۔ کتنی دلچسپ بات تھی کہ اب فیصلہ ان کے اختیار میں تھا جن پر خود کبھی اس طرح کی مصیبت ٹوٹی تھی۔ کاش یہ قافلہ توری کے بجائے تاریک برِاعظم کے کسی اور جزیرے پر اُتر جاتا۔ میں اُن سے مہذب دنیا کے بارے میں بہت سی باتیں پوچھنا چاہتا تھا لیکن ان میں کوئی بات کرنا تو کجا، مجھے ان کا سامنا کرنے کی جرأت بھی نہیں تھی۔ میں اب اس غیر مہذب دنیا کا ایک عالی مقام شخص تھا اور مجھے معلوم تھا کہ یہ سرزمین کیسے کیسے اسرار اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ہے اور ہم نے اپنی زندگی برقرار رکھنے کے لیے کیسے کیسے صدمے اٹھائے ہیں؟ تازہ واردوں میں کوئی جابر بن یوسف جیسا جری شخص، سرنگا جیسا صاحبِ اسرار بوڑھا اور ڈاکٹر جواد جیسا کوئی طبیب نہیں تھا۔ عورتیں ہی زندہ رہ سکتی تھیں۔ اس بدقسمت قافلے کا انجام مجھے معلوم تھا۔ میں ایک بے بس سردار تھا۔

میں نے انھیں غور سے دیکھا بھی نہیں کیونکہ اس وقت میں یہ سوچ رہا تھا کہ میرا اگلا قدم کیا ہونا چاہیے؟ اپنے مکان پر واپس پہنچنے کے بعد ابھی مجھے سمورال اور سرنگا سے مشورہ کرنے کی فرصت بھی نہیں ملی تھی کہ ترماز آ گئی اور اس نے ایک خبر سنا کر میرے جسم میں سنسنی پیدا کر دی۔

جب میں نے یہ سُنا تو یہ سمجھا کہ شاید میں بے خوابی کا شکار ہوں۔ قصرِ اقابلا کی ایک محترم کنیز حشر بداماں میرے سامنے کھڑی تھی۔ میں اُچھل کر بیٹھ گیا۔ مجھے یقین کر لینا چاہیے تھا کہ یہ میرے پریشان ذہن کی کوئی کرشمہ کاری نہیں ہے۔ ایک عرصے بعد اس ماہ جمال نے مجھے اپنی بارگاہ میں طلب کیا تھا۔ ایک عرصے بعد مجھے لذتِ گوش ملی تھی لہٰذا اعتبار نہیں آتا تھا۔ اس نے جابر بن یوسف کو طلب کیا تھا؟ پہلے کی بات اور تھی۔ پہلے مجھے اپنی کوتاہ قامتی اور اس کی شمشاد قامتی کا اندازہ نہیں تھا۔ پہلے میں نے زارشی کے لق و دق صحرا کی خاک نہیں چھانی تھی اور بالگمان کے اندھیروں میں ٹھوکریں نہیں کھائی تھیں۔ پہلے میں نے انگرو ما میں جلاوطن عالموں کا جلال و کمال نہیں دیکھا تھا اور کاہنِ اعظم سمورال کی وہ فصیح تقریر نہیں سُنی تھی جو اس نے تاریک برِاعظم کی پُراسرار سلطنت اور اس کی رفیع الشان ملکہ کے بارے میں میرے سامنے کی تھی۔ پہلے میں نے اتنے دن نہیں گزارے تھے کہ مجھے اُس کی شان و شوکت، عظمت و سطوت کا عرفان ہوتا مگر اب کچھ دھندلے دھندلے نقوش واضح ہو رہے تھے۔ میری آنکھیں روز کسی انکشاف، کسی غیر متوقع واقعے کے ظہور پر حیرت سے پھیل جاتی تھیں۔ پہلے میں ایک جاہل شخص تھا۔ پہلے میں ایک بڑا بچّہ تھا جس نے غیر معمولی طور پر اپنا جسم بڑھا لیا تھا۔

"کیا تم جھوٹ بھی بول لیتی ہو؟" میں نے بے چینی سے کہا۔

ترماز نے وارفتگی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور میرے سینے پر لٹکے ہوئے چوبی اژدہے پر ہاتھ پھیر کر بولی "کیا کہہ رہے ہو؟ اس سرزمین پر کوئی اُس کے متعلق اتنا بڑا جھوٹ بولنے کی جرأت کر سکتا ہے؟"

"آہ" میں نے وفورِ مسرت سے چیخ کر کہا "اب میرے سینہ چیرنے کا وقت آیا۔ اس نے مجھے کب بلایا ہے؟"

"اسے اپنے حکم کی تعمیل میں تاخیر پسند نہیں ہے۔"

"اور تم اگر مجھے چند ساعت بھی مزید انتظار کے لیے کہتیں تو یقیناً میری روح مجھ سے جدا ہوگئی ہوتی۔ شاید اسے احساس ہے کہ اس سیم بر سے رفاقت کے دعوے دار اس کے انتظار کا حوصلہ نہیں رکھتے مگر صرف چند لمحے ـــ مجھے اپنے جسم پر خوشبوئیں تو مل لینے دو۔ کیا میں اسی طرح اس کے سامنے جاؤں گا؟ نرماز! میرے بالوں میں انگلیاں پھیر کر انھیں درست کر دو اور ذرا مجھے یہ تحائف اپنے سینے پر سجا لینے کی مہلت تو دو، ..... اور ہاں ہر بیکا کی مقدس آنکھیں بھی تو گلے میں لٹکا لینے دو۔"

اس مختصر وقت میں جنون کے کئی عالم گزر گئے۔ نرماز نے میرے بالوں میں انگلیاں پھیریں اور میں نے سلیقے سے اپنے نوادر سینے پر آراستہ کرنے شروع کر دیے، میں شوخی میں نرماز کی چٹکیاں لیتا جاتا تھا۔ پھر میں نے ایک برتن میں رکھا ہوا خوشبودار تیل اپنے جسم پر لوٹ لیا۔ نرماز نے اسے جلدی جلدی میرے جسم پر خشک کر دیا۔ میں پاؤں رکھتا کہیں تھا، پڑتے کہیں تھے۔ یہ وقت میں نے خود کو آراستہ کرنے میں لگا دیا لیکن انھی لمحوں میں اداسیاں مجھ پر غالب آگئیں۔ اقا بلا کی اس وقت طلبی کا کیا مقصد ہے؟ اپنی خوش خیالیاں اور خوش فہمیاں دُور کر کے مجھے دُوسرے معاملات پر غور کرنا چاہیے۔ میں اسے اپنی شدتوں کا ثمر سمجھوں یا کچھ اور؟ گزشتہ دنوں سے میں اپنی نظر میں ایک مشکوک شخص تھا۔ کاہنِ اعظم سمورال سے میری بڑھتی ہوئی رفاقت اور ہوائیں بند کر کے اقا بلا کے بارے میں گفتگو سے کہیں وہ آگاہ تو نہیں ہو گئی؟ ہم نے اس کے خلاف کوئی سازش نہیں کی تھی۔ مگر سرنگا؟ سرنگا کے غار میں یقیناً مہذب دُنیا کی واپسی کے منصوبوں پر کھُل کر گفتگو ہوئی تھی ـــ اگر کچھ چیزیں اُسے معلوم بھی نہیں ہیں تو یہ کیا کم ہے کہ وہ میرے شب و روز کے بعض مشاغل سے لاعلم ہے۔ اسے میرے سرکش اطوار سے کسی قسم کی وضاحت کی ضرورت تو نہیں محسوس ہوئی؟ میرے ہاتھ سُست پڑ گئے اور ماتھے پر شکنیں نمودار ہو گئیں۔ ممکن ہے وہ میری موجودہ ذہنی افتاد پر مجھے سرزنش کرے یا ہو سکتا ہے جزیرۂ اسمار جانے کے ارادے پر اپنی رضامندی کی مہر ثبت کر دے؟ مبادا مہذب دُنیا سے ایک قافلے کی آمد پر وہ میرا فیصلہ جاننا چاہتی ہو؟ کاش ان میں سے ـــــــ صرف ایک بات صحیح ہو کہ وہ اپنا دستِ شوق دراز کرے اور اپنے گلابی ہونٹ میرے سامنے کر دے اور مجھے میرے صدق کا انعام مل جائے۔ کوئی مرتبہ، کوئی اعزاز، اُس کی اس فیاضی کا بدل نہیں۔ میں شش و پنج کی حالت میں نرماز کے روبرو کھڑا ہو گیا۔ پھر میں نے نیم مایوسی اور نیم خوش دلی سے کہا۔ "نرماز! یقیناً کسی شخص کو اس حلیے میں اس کی بارگاہ میں جانے کا تصور نہیں کرنا چاہیے مگر میرے پاس جو کچھ ہے، وہ میں نے اپنے ساتھ لے لیا ہے۔ ان نوادر کے سوا جو تم میرے سینے پر دیکھ رہی ہو، میرے پاس اور بہت کچھ ہے جو کسی کو نظر نہیں آتا جس کی بنا پر میں خود کو ان نوادر سے زیادہ آسودہ سمجھتا ہوں۔ وہ کیا ہے؟ وہ ہے میرا باطن ـــ جس میں صرف اُسی کا جلوہ، صرف اسی کا نقش ہے میرا دعوا ہے کہ یہ نقش کسی کے قلب پر اتنا گہرا نہیں ہے ـــ اُس کے خیال نے مجھے زندہ رکھا ہے۔ اس کا چہرہ مجھے تاریک ترِ اعظم میں سرمستی پر اکساتا رہا ہے۔"

نرماز نے میرا ہاتھ تھام لیا اور خوش ادائی سے کہنے لگی۔ "تم اپنے بہترین لفظ یہاں کیوں ضائع کر رہے ہو؟ اپنے نطق سے کہو کہ وہ تمھارے قلب کے ساتھ تعاون کرے۔ اپنی آنکھوں سے کہو کہ وہ تمھارے باطن کی نمایندگی کریں ـــ اب تمھیں ایک مرحلۂ شوق درپیش ہے، آؤ، میں تمھیں وہاں لیے چلتی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف بلند کیے۔ ہر طرف سفید دُھواں پھیل گیا اور میرا مکان اس دُھوئیں کی اوٹ میں کہیں چھُپ گیا اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے زمین نے اپنی کشش کا وتیرہ چھوڑ دیا ہو اور آسمان نے زمین کی جگہ لے لی ہو۔ میں بلندیوں پر پرواز کر رہا تھا یا بادلوں کے دوش پر تھا۔ مجھے نہیں معلوم یہ کیا ماجرا تھا؟ یہ کیا راز تھا؟ نرماز کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا اور ہر طرف بادل تھے۔ میں نے کچھ سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کی کیونکہ اس کوشش میں مجھے اپنی ناکامی کا علم تھا۔

نرماز سے پہلے ثرولین اور اشمار اسی طرح مجھے قصرِ اقا بلا لے جا چکی تھیں، مگر اشمار اور ثرولین کے زمانے کی بات اور تھی، اب آگہی کے عذاب سے گزرنے کے بعد میرے قلب و ذہن کی حالت متغیر تھی۔ میں نے بچشمِ خود انگروما، زارشی اور ہاگمان کے طلسم خانوں میں ایسے حیران کن مناظر کا مشاہدہ کیا تھا جن پر صرف اُسی کی شخصیت کا سحر چھایا ہوا تھا۔ بادل میرے اردگرد چھائے رہے اور میں ایک غنودہ سی حالت میں سفر کرتا رہا۔

قصرِ اقا بلا کے دلکش ماحول کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔ وہ ایک پرستان تھا جس کا ذکر مہذب دُنیا کی دیومالائی کہانیوں میں کیا جاتا ہے۔ دُنیا کی حسین ترین دوشیزاؤں کا اتنا بڑا اجتماع کوئی دیکھ لے تو پاگل ہو جائے۔ میں ستونوں، ایوانوں، عجائب اور رنگوں کا حال بیان کر چکا ہوں۔ نرماز نے میرا ہاتھ دبایا تو مجھے اپنے بوجھ کا احساس ہوا۔ میں زمین پر کھڑا تھا اور بادل چھٹ رہے تھے۔ ان کے پیچھے سفید پتھر کے ستون نظر آ رہے تھے اور مرصع فرش پر سفید اور سرخ جسموں کی دوشیزائیں رقص میں منہمک تھیں۔ ایک عجب کیف آور موسیقی در و دیوار سے اُبل رہی تھی۔ درمیان میں ایک بڑا سا حوض تھا جس پر قندیلیں روشن تھیں۔ پہلے میں اس جگہ نہیں آیا تھا۔ قصرِ اقا بلا کے کون کون سے گوشے ابھی میری نظروں سے اوجھل ہوں گے۔ میں نے اس ماحول میں قدم رکھا تو میرا دل چاہا میں بھی پتھر کے ان مجسموں میں شامل ہو جاؤں جو جگہ جگہ بکھرے ہوتے ہیں اور دوشیزائیں ان کے درمیان ایک ابدی رقص میں مصروف ہیں۔ نہ معلوم یہ رقص کب ختم ہو۔ وہ زمین کی حرکت اور وقت کی رفتار سے بے نیاز ناچ رہی ہیں۔ ان کے بدن لوچ کھا رہے ہیں اور وہ کبھی نہیں تھکتے، انھوں نے کوئی ایسا مشروب پی لیا ہے جس کا نشہ جاودانی ہے۔ زندگی کی انھوں نے بس ایک سرخوشی سمجھی ہے کہ رقص کیا جائے۔ وہ ایک ایسی لازوال مسرت سے ہم کنار ہیں کہ اپنے گرد و پیش بھول گئی ہیں۔ یہ برہنہ بدن لڑکیاں ناچ رہی ہیں اور ان کے تھرکتے بدن اور خوبصورت چہرے دیکھنے والا کوئی نہیں۔ ایک میں یہاں آیا ہوں اور میں بھی ابھی ادھر سے گزر جاؤں گا۔ میں ان کی سیماب صفتی کی ایک جھلک دیکھ کر اس ایوانِ رقص سے آگے چلا آیا۔ نرماز مجھے قصرِ اقا بلا کی نئی نئی راہداریوں اور جلوہ گاہوں سے گزارتی رہی۔ ہر طرف حسن و جمال کا بازار گرم تھا۔ جس کا ذہن شاعرانہ ہو، وہ بھی ایسے خواب تک نہیں دیکھ سکتا۔ میری نگاہیں جدھر رُخ کرتی تھیں، رنگ و نور کی ایک محفل سجی ہوئی نظر آتی تھی۔ یہاں آ کر احساس ہوتا تھا کہ مہذب دنیا سے آ کر ہم نے کسی زیاں کا سودا نہیں کیا ہے۔ میں جو چیختا تھا، فریاد کرتا تھا۔ وہ کس قدر سچ تھا؟ میرا ہذیان بے سبب نہیں تھا۔ یہ اقا بلا کا قصرِ زرّیں تھا، جو مہذب دنیا کے تمام شبستانوں کو شرماتا تھا۔ ہر سمت ایک جشن برپا معلوم ہوتا تھا، ظاہر ہے یہ بزم آرائی آج اس وجہ سے نہیں تھی کہ سحر و افسوں کی سرزمین کا ایک ادنا سردار جابر بن یوسف اِدھر آیا تھا، جابر بن یوسف شہنشاہ نہیں تھا، وہ ایک غلام تھا، اس کا دل ہر وقت دھڑکتا رہتا تھا۔ وہ ایک مغلوب شخص تھا۔

قصرِ اقا بلا کے بارے میں میرے گزشتہ بیانوں کی یاد تازہ کیجیے۔ ممکن ہے اس وقت بیان کی کسی کوتاہی کا جرم مجھ سے سرزد ہو گیا ہو، مجھے اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کر لینا چاہیے۔ میں نے جو کچھ دیکھا، اسے بیان کیا جائے تو وہ یقین و اعتبار کی اُس حد سے تجاوز کر جاتا ہے جہاں تک انسانی ذہن کی رسائی ہے۔ یقیناً کوئی ایسی منزل ہو گی جہاں ذہن کی قبولیت ختم ہو جاتی ہو گی۔ میں کہتا ہوں کہ جہاں ذہن کی نفی کی منزل آتی ہے، وہاں سے آغاز کیجیے۔ اس سے آگے کچھ بیان کرنا فضول ہے۔

ان گداز ایوانوں، رنگ رنگ کے بادلوں، موسیقی کی لہروں اور اٹھلاتے ہوئے جسموں اور خوشبوؤں اور لطیف ترین احساسات سے گزر کر میں ایک ایسے ایوان میں پہنچا۔ جہاں کی دیواروں پر طلائی کام کیا گیا تھا اور جس کی فضا اب تک کے تمام ایوانوں سے زیادہ رنگین اور خواب ناک تھی۔ مجھے ایک جگہ
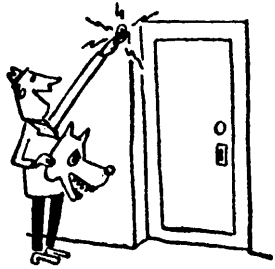
ٹھیرا کر نرماز رخصت ہو گئی۔ یہ ایک بڑا ایوان تھا، میں اس کی آرائش و زیبائش میں کھویا ہوا تھا اور آنے والے لمحوں کا منتظر تھا کہ ایک بار پھر نرماز نمودار ہوئی اور اس کے پیچھے پری جمال لڑکیوں کے ہیولے تیرتے نظر آئے۔ میں نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ایک ہوا تھی جو ادھر سے آئی تھی اُدھر کہیں گم ہو گئی ـــ اس نسبتہً سرد جگہ پر میں اپنی حیثیت کا کوئی تعین نہیں کر پایا تھا اور میں نے سوچ لیا تھا کہ میں ایک طالبِ صادق کے بجائے ایک سرافراز ایک غلام کی حیثیت سے خود کو پیش کر دوں گا۔ مبادا کوئی جسارت اس کی طبعِ نازک پر گراں گزر جائے؟

میں اپنا ذہن یکسو کر کے تمام تر اشتیاق سے کھڑا ہو گیا۔ جابر بن یوسف نے اپنے پیروں میں ارتعاش سا محسوس کیا۔ میں نے خود کو ڈانٹا "کم بخت! تمام منزلیں سر کر لیں، اب اس مرحلۂ شوق پر لرزتا ہے؟ تیرا اعتماد

کیوں ختم ہو گیا؟" میں نے خود کو سمجھایا "اے بدبخت شخص! کیا ہو گا؟ وہ سامنے آئے گی تو کیا ہو گا۔ کیا تو ان نوادر کے ساتھ دوں ہمتی کا یہ مظاہرہ کرے گا۔ اپنا خنجر اٹھا اور اگر تاب نظارہ نہیں ہے تو سینے میں اتار لے۔" میں دو اشخاص میں تقسیم ہو گیا تھا بلکہ کئی اشخاص میں ۔۔۔ اور وہ سب اپنے شوق، اپنے جذبے، اپنے وسوسوں اپنے اندیشوں کا اظہار کر رہے تھے۔ جواب دینے والا صرف ایک شخص تھا جس نے آخر سب کو شکست دے دی اور ان تمام اشخاص کے ہجوم سے وہی شخص ابھرا جس کا نام جابر بن یوسف تھا۔ وہ باگمان کا سردار، زارشی کا فاتح، وہ توری کے دونوں قبیلوں کا سردار۔۔۔ وہ ایک مضبوط اور توانا شخص جس کا لہجہ رسیلا اور جس کا انداز کٹیلا تھا۔

چند لمحوں بعد مجھے ایک مشروب پیش کیا گیا۔ وہی اقابلا کا مشروبِ خاص، جس کے پینے کے بعد آنکھ اپنے زاویے بدل دیتی ہے۔ میں نے زماز کو جام خالی کر کے واپس کر دیا اور میرا دل چاہا کہ اس وقت عرب کی کوئی دل نواز دھن چھیڑ دے۔ میرے سوچنے کی دیر تھی کہ عربی موسیقی میرے رگ پے میں سرایت کرنے لگی ۔۔۔ پھر میں نے چاہا وہ دیر سے آئے تاکہ اس ایوان میں میرے قیام کی مدت طویل ہو جائے لیکن اسی وقت سامنے کی دیوار موسیقی کے زیر و بم کے ساتھ شق ہوئی اور خلا میں رنگین روشنیاں جھلملانے لگیں۔ وہ روشنی لپکے جھپکے تھے۔ روشنیوں کا منبع کہاں تھا؟ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر اس ہالے میں ایک تخت آتا دکھائی دیا ۔۔۔ وہ آ رہی تھی ۔۔۔ وہ آ رہی تھی۔

کون آ رہا تھا؟ اقابلا آ رہی تھی ۔۔۔ ہاں اقابلا آ رہی ہے۔ کیا یہ سچ تھا؟ ہاں یہ سچ تھا۔ آنکھوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ اس کی سواری آ رہی ہے۔ حسن ایک زریں تخت پر جلوہ فگن ہے۔ وہ کاروانِ جمال آ رہا ہے، وہ رنگ و نکہت کا سیل اس طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کا تخت جگمگا رہا ہے۔ آج اس کی تمکنت کی کچھ اور شان ہے۔ میرے قدم زمین سے اکھڑنے لگے۔ میں نے انھیں اور مضبوطی سے جما لیا اور اپنا سینہ آگے کر لیا ۔۔۔ تخت دیوار کے اس طرف آنے کے بعد ایک فاصلے پر رک گیا اور اقابلا کے دائیں بائیں کھڑی ہوئی دو دوشیزائیں اتر کر فرش پر کھڑی ہو گئیں۔ ان میں زماز بھی تھی۔ میرے اور اقابلا کے درمیان بہت کم فاصلہ تھا۔ لیکن مجھے یہ فاصلہ صدیوں، سمندروں اور سیاروں کا معلوم ہوتا تھا۔ اقابلا کا بدن پھولوں اور پتوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں اور چہرہ کھلا ہوا تھا۔ اس کے دراز سرخ و سیاہ بال شانوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ اسے کسی زیور کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ آج اس کے بدن پر پتوں اور پھولوں کا لباس نسبتہً مختصر ہے۔ یہ شاید میری نظر کا فریب ہو لیکن ان پھولوں اور پتوں کے درمیان اس کے بدن کا کوئی کوئی حصہ مجھے نظر آ جاتا تھا۔ اس کے آتے ہی میں تاریک برِاعظم کی روایت کے مطابق اظہارِ عقیدت کے طور پر زمین بوس ہو گیا۔ مجھے زماز نے اپنی انگلی کے اشارے سے اٹھایا۔ پھر میں نے کھڑے ہو کر اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ نظر ٹھیرتی ہی نہیں تھی تاہم میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس کی نگاہوں میں ایک دل آویز شوخی اور اس کے لبوں پر ایک نظر فریب تبسم ہے۔ ان دونوں اشارات سے میرے حوصلے بڑھ گئے۔ وہ تیکھی نظروں سے میرے سراپا کا جائزہ لے رہی تھی اور اس کی چبھتی نظریں میرے جسم کے پار ہو رہی تھیں اور مجھے ایک نئی لذت سے آشنا کر رہی تھیں۔ میں نے اپنا تمام کرب، اپنے دنوں، اپنی راتوں کا کرب اپنے چہرے پر سمیٹ لیا تھا، میں نے کلام میں پہل نہیں کی تھی لیکن میری آنکھیں، میرے بند لب، میرا چہرہ مجھے منتقل کر رہا تھا۔ یکایک روشنیوں میں ارتعاش سا ہوا اور اقابلا نے اپنے دستِ بہار آفریں کو ایک خاص ادا سے جنبش دی میں مہر بہ لب کھڑا تھا۔ زماز نے نہایت شیریں لہجے میں ابتدا کی۔ "جزیرۂ توری اور باگمان کے سردار جابر بن یوسف الباقر! مقدس اقابلا تمہاری کامیاب واپسی اور تمہاری کامرانیاں پسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہے۔"

میں نے اپنا سر جھکا دیا۔

"تمہارا آراستہ سینہ بلاشبہ تمہاری برتری کی دلیل ہے۔" زماز نے میرے کانوں میں شہد ٹپکایا۔ میں نے جواب نہیں دیا۔ صرف حسرت بھری نگاہوں سے اقابلا کی طرف تکتا رہا۔

"مقدس اقابلا کو معلوم ہے کہ تم نے کہاں کہاں اس کا خیال تازہ رکھا اور کس کس جگہ شجاعت و ذہانت سے کام لیا۔ مقدس اقابلا تمہاری آئندہ فتوح دلچسپی کی نظر سے دیکھے گی۔" زماز نے شوخی سے کہا۔

میں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور پہلی بار لب کھولے۔ "مجھے کچھ کہنے کی اجازت عطا کی جائے۔" میں نے تاثر انگیز آواز میں کہا۔

"گو وہ تمہارے جذبات اور احساسات سے آگاہ ہے تاہم تمھیں اظہار کی اجازت ہے۔ تم سے توقع کی جاتی ہے کہ دورانِ کلام یہ احتیاط ملحوظِ خاطر رکھو گے کہ تم کہاں موجود ہو؟" زماز نے باوقار لہجے میں کہا۔

"میں جانتا ہوں۔" میں نے جذبات میں کہا۔ "اے خوش اندام زماز! میں جانتا ہوں، مجھے معلوم ہے کہ سلطنتِ اقابلا میں کوئی بھی جگہ اس کی نظرِ فرحت اثر سے دور نہیں۔ میں اپنے شعور میں ہوں کہ میں کس حریمِ ناز کی جلوہ گاہ میں زمین پر ایستادہ ہوں۔ مجھے احساس ہے کہ پہلے مجھ سے سنگین گستاخیاں سرزد ہو گئی تھیں۔ اس نے میرے لیے اپنی سرزمین کے مختلف طلسم خانوں کے مشاہدے کا اہتمام کر کے مجھے اپنی طاقت و حشمت سے متنبہ کر دیا ہے ۔۔۔ میں نے یہاں آنے کے سفر کے دوران میں سوچا تھا کہ میں کس حیثیت سے جا رہا ہوں۔ پھر میں نے فیصلہ کیا کہ میں تین قبیلوں کے سردار کے سوا اور کیا حیثیت رکھتا ہوں؟ میں آسمان میں نہیں اڑ سکتا کیونکہ میرے جسم پر پر نہیں ہیں اور میں زمینوں پر انقلاب برپا نہیں کر سکتا کیونکہ میرے علم و فضل کا دائرہ بہت مختصر ہے۔ میں نے خود کو سمجھایا کہ اس کی قربت کی طلب مجھ ایسے ناتواں شخص سے مناسبت نہیں رکھتی۔ مجھے ابھی سنگی دیواریں شق کرنا اور اشارے سے درخت اکھاڑنا نہیں آتا اور مجھ پر میری قدیم روایتیں تسلط جما لیتی ہیں ۔۔۔ وہ میرا محبوب تھی۔ میں نے اس میں اضافہ کر دیا۔ وہ میری محبوب ملکہ ہے۔ میں نے اپنی شوریدہ سر خواہشیں زخمی کر دیں تاکہ وہ سر نہ اٹھا سکیں۔ میں نے اپنے آپ کو یہ باور کرایا کہ مجھ سے باعظمت وہ تخت ہے جس پر وہ جلوہ فگن ہے۔ وہ جام ہیں جو اس کے لب چھوتے ہیں، وہ پھول ہیں جو اس کا بدن ڈھانپتے ہیں، وہ پتے ہیں جو اس کے بدن کی چاندنی روکے رہتے ہیں۔ میں نے چاہا تھا کہ مجھے اس کا غلام بنا لیا جائے لیکن مجھے معلوم ہوا کہ اس کی غلامی بھی کتنی بڑی فضیلتوں کے بعد ممکن ہوتی ہے؛ میں نے اپنی طلب سے کنارہ کشی نہیں کی ہے۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ مجھے سرکشی کی اجازت دی جائے۔ اگر اسے طاقت کے تماشے پسند ہیں تو مجھے اپنی طاقتوں کی افزائش اور ان کے مظاہرے کی اجازت دی جائے اور میں اپنے طور پر یہ آرزو دل سے پیوستہ کر لیتا ہوں کہ ایک دن وہ مجھے اپنے قریب جگہ دے گی۔"

میں نے جذبات سے لبریز پیرائے میں وہ تمام باتیں کہہ دیں جو میرے ذہن پر محیط تھی۔ پھر میں نے اس کا ردِ عمل دیکھنے کے لیے اس کے چہرے پر نگاہیں جما دیں۔ وہ پوری توجہ اور دلچسپی سے میری باتیں سن رہی تھی۔ اس کی نگاہوں میں تجسس تھا اور اس کے چہرے پر کرب کے آثار نمودار تھے۔ اس کا انہماک دیکھ کر میں نے اپنے اظہار میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ میں بولتا رہا جب تک زماز نے مجھے روک نہ دیا۔

"آہ، اے جزیرۂ توری اور باگمان کے معزز سردار! تمہاری باتیں شیریں اور تمہارا کلام پُراثر ہے۔ اس سرزمین پر تمھیں نواز اگیا ہے۔ جارا کاکا کی مقدس روح تم پر سایہ گستر ہے اور مقدس اقابلا تمہاری کامرانیوں کی نوید سے متاثر ہوتی ہے۔ تم نے اس سرزمین پر سربلند و سرخ رُو افراد دیکھے ہیں۔ مقدس اقابلا کے وسیع نظامِ سلطنت میں ان لوگوں کے نمایاں ہونے کی گنجائش موجود ہے جو نمایاں ہونا چاہتے ہیں۔" زماز نے شگفتگی سے کہا۔

"اور مجھے یقین ہے کہ وہ کسی مقام پر کسی کی گرمیٔ جذبات سے ضرور پگھل جائے گی۔ میں اس بلندی پر پہنچنے کا خواہاں ہوں جہاں سے اس کا چہرہ مجھے نظر آ سکے اور وہ مجھے براہِ راست تخاطب کی سعادت بخشے ۔۔۔ اسے اس کا احساس ہو گا کہ جابر بن یوسف کو عورتوں، غلاموں

اور زمینوں پر حکمرانی میں لذت نہیں ملتی۔ اس کی انا ایسی طاقت و بلندی سے آسودہ نہیں ہوتی جہاں اُس کا جلوہ نظر نہ آتا ہو۔"

"ٹھیرو جابر بن یوسف!" نرماز نے حکیمہ انداز میں کہا۔ "تم ایسی گفتگو کر رہے ہو جو قبل از وقت ہے۔ تمھارے لہجے سے شکوک اور عدم اعتماد کی بُو آتی ہے۔ تم ابھی تک اپنے مشتعل جذبات کے توسط سے بول رہے ہو۔ آہ۔ تم چاہتے ہو کہ وہ تمھارے سامنے وضاحتیں کرے، یہ تمھاری کیسی نادانی ہے۔ تمھارا علم خام اور تمھارا شعور نا پختہ معلوم ہوتا ہے۔ تم نے اس کے جاہ و جلال کا تخمینہ لگانے میں اب بھی کوتاہی کی ہے۔ بہتر ہے تم اسمار جاؤ اور وہاں اپنا نفس اتنا سیراب کر لو کہ پھر تمھاری طلب میں کوئی آلودگی نہ رہے اور تم اس سرزمینِ سحر و اسرار کے رازہائے سربستہ کے متعلق از خود نتیجے اخذ کرنے کے قابل ہو جاؤ۔ تم شوالا اور کالاری، اسٹالا اور لوکاسا کے معیار کے ایک شخص ہو۔"

میں نے حیرت سے نرماز اور اقابلا کو دیکھا اور نرماز سے پوچھا، "کیا تمھارے متعلق میں قطعی طور پر یہ سمجھوں کہ تم مقدس اقابلا کی ترجمانی کے فرائض بہ کمال و تمام انجام دے رہی ہو؟"

"میری حیثیت ایک ترجمان کے سوا کچھ نہیں۔" نرماز نے جواب دیا۔

"میں اس کے بعد کوئی بات نہیں کروں گا — میں اپنی زبان پر زنجیر ڈالتا ہوں۔ اب جو کچھ ہوگا وہ عظیم دیوتاؤں کی منشا کے مطابق ہوگا۔" میں نے اپنی افسردگی چھپانے کی کوشش کی۔ "مقدس اقابلا نے مجھے اپنی بارگاہ میں طلب کر کے میری عزت بڑھائی ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں اس کا بہترین جانور ثابت ہوں گا۔ میری درخواست ہے کہ مجھے تمام شکوک و شبہات سے بالا سمجھ کے اپنا راستہ بنانے کی اجازت دی جائے۔ میں اس کی نشست کے قریب آنے کے لیے اپنے باقی دن بھی صرف کر دوں گا۔ میں مشروبِ حیات پینے کی لذت سے بہرہ ور ہوں گا اور تا ابد اس کے فراق میں جلنے اور تڑپنے کی سعادت سے ہم کنار ہوں گا۔" میں نے جوشیلے انداز میں کہا۔ "میری رہنمائی کی جائے اور اس جانور کو جنگل میں تنہا چھوڑا جائے۔ مجھے بتایا جائے کہ سمندر پار سے ایک نئے قافلے کی آمد پر مجھے کس قسم کے فیصلے صادر کرنے چاہئیں۔"

"جابر بن یوسف!" نرماز حاکمانہ انداز میں بولی۔ "تمھارے عزائم یقیناً سلطنتِ اقابلا میں تمھارا درجہ اور رتبہ متعین کریں گے اور تمھاری طلب جو اُس کے سلسلے میں ہے، وہی تمھارے عزائم کے لیے مہمیز کا کام دے گی اور آنے والے وقتوں کے بارے میں دیوتا جانتے ہیں، مقدس اقابلا جانتی ہے جو جارا کاکا کی نمائندہ ہے جس کی نظر ہر سمت ہے اور جو اپنے علاقے کے افراد، درختوں، زمینوں اور سمندروں پر تسلط رکھتی ہے

مقدس اقابلا کی نوازشیں تمھارے کارناموں پر منحصر ہیں۔ جزیرۂ توری میں اجنبیوں کی آمد کے متعلق تم توری کے ایک سردار کی حیثیت سے جو بھی فیصلہ کرو گے وہ تمھاری ذہانت کے اوصاف میں شمار کیا جائے گا — "جابر بن یوسف الباقر!" پھر نرماز شاید گفتگو کے اختتام کے ارادے سے بولی۔ "تم اپنے لیے رعایتیں خود حاصل کرو گے اور اپنا سر بلاؤں سے محفوظ رکھنے کے لیے اُسے اپنے جسم پر مضبوطی سے جمائے رکھو گے — مقدس اقابلا عظیم ہے۔"

"ہاں وہ عظیم ہے۔" میں نے دُہرایا اور اپنے برہم جذبات کی پردہ پوشی کی سعی کی لیکن میری کیفیتیں خود بخود منکشف ہونے لگیں۔ جب گفتگو ایسے مرحلے میں داخل ہو گئی۔ جہاں مجھے اپنے کسی سوال کے جواب کی اُمید نہیں رہی تو میں نے دوبارہ اس کے حسن کا ذکر چھیڑ دیا اور اس کے سامنے اپنی وارفتگی و شیفتگی کے دریا بہائے۔ میں اس غنیمت موقع پر کہ وہ میرے رُوبرو تھی۔ کوئی منفی تاثر قائم کرنے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ اتنے عرصے کی آرزوؤں کے بعد کہیں جا کر مجھے اس کے قصر میں اس کی تجلّی دیکھنی نصیب ہوئی تھی۔ اس وقت جب میں نے اسے ایک حسین دوشیزہ کے تصوّر میں دیکھا ہوگا تو میں نے کیا کہا ہوگا؟ میں نے کیا نہ کہا ہوگا؟ میں نے سوچا کاش یہ رنگین ماحول پتھروں میں اسی طرح منجمد ہو جائے۔ میں انسانوں کو پتھروں میں منتقل کرنے کا عمل جانتا تھا — میں نے والہانہ انداز سے اسے دیکھا — آہ اور کچھ نہیں تو یہی بہت ہے کہ وہ میرے سامنے ہے اور اس کے بدن سے نکلتی ہوئی شعاعیں مجھے جھلسا رہی ہیں۔ یہ آگ کتنی فرحت بخش ہے۔ ایک لطیف خوشبو سارے ماحول میں رچی بسی ہے اور میرے اعصاب پر ایک لطیف نشہ طاری ہے۔ میں نے تمام ذکر چھوڑ دیے۔ صرف اس کے لازوال حُسن کا ماجرا بیان کیا۔ میں کہتا رہا، وہ سنتی رہی۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوتی ہے، پھر وہ یکایک سخت اور سرد ہو جاتی ہیں۔ اس کی ذہین آنکھیں، اس کا تیز و طرار بدن کسمساتا ہے اور فوراً ساکت ہو جاتا ہے۔ اقابلا کی نظروں میں وہ تابانی تھی جو ہمیشہ مردوں کو فتوحات کرنے پر اُکساتی ہے۔ میرا بیان ختم نہیں ہوتا تھا، لفظ نہ جانے کہاں سے ادا ہو رہے تھے۔ وہ رنگ رنگ فضا، عطر بیز، موسیقی ریز — مگر میں مستقل طور پر یہاں اقامت گزیں نہیں ہوا تھا۔ کسی وقت بھی نرماز واپسی کا حکم صادر کر سکتی تھی۔ اس لیے میں نے اس سے درخواست کی کہ مجھے اس کی دست بوسی اور قدم بوسی کی اجازت دی جائے۔ میری درخواست ایک عجب شانِ بے نیازی سے قبول کر لی گئی پھر میرے قدم زمین پر نہیں ٹکے۔ میں برق رفتاری

سے آگے بڑھا اور وفورِ شوق میں بے تحاشا، بے محابا اس کے مرمریں گداز پیروں کو بوسہ دینے لگا۔

اس نے اپنا پاؤں آگے بڑھا دیا، مجھے اس کا چہرہ دیکھنے کی فرصت نہیں تھی لیکن میں نے اس کا پاؤں سینے سے لگا لیا اور اپنا کرب ناک چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے کر دیا۔ میں نے اُسے بہت نزدیک سے دیکھا۔ قریب تھا کہ میں اپنا دامنِ ہوش جلا بیٹھتا کہ میں نے بے حد درد انگیز لہجے میں کہا۔ "مقدس اقابلا، اپنے ہاتھ سے میرا گلا گھونٹ دے۔"

اس نے اپنا چہرہ منقش چھت کی طرف کر لیا۔ میں نے اس کے پیروں پر آنکھیں رکھ دیں۔ ایسا سکون، ایسی نشاط، ایسی لذت — الاماں — اس نے اچانک اپنی کلائی کو ایک دل رُبا انداز سے جنبش دی۔ چشم زدن میں نرماز اور اس کے ساتھ کھڑی ہوئی دوشیزہ اس منظر سے غائب ہو گئیں پھر اچانک دیوار کا وہ خلا از سرِ نو تعمیر ہو گیا جو اس کی سواری کے وقت پیدا ہو گیا تھا۔ میں نے ایوان کے چاروں طرف دیکھا، وہاں کوئی دروازہ نہیں تھا۔ بس رنگ تھے، روشنیاں تھیں اور موسیقی تھی اور ہم دونوں تھے۔ کئی خیال در آئے کہ یہ کیوں ہو رہا ہے؟ شاید اس نے میرے باطن کا حال پڑھ لیا ہے؟ شاید یہ میرے بیان کا اعجاز ہے کہ مجھے یہ خلوت نصیب ہوئی ہے — میں نے سوچا۔ زندگی کا اختتام کتنے خوبصورت طریقے سے ہو رہا ہے — اس وقت میں دنیا کا سب سے آسودہ آدمی تھا۔ میں نے اقابلا کو دیکھا، اس کا چہرہ روشنیوں میں جذبات زدہ نظر آیا۔ پھر میں نے اس کا پاؤں پکڑ لیا اور اس کے ساتھ اپنا چہرہ وحشت سے رگڑتا رہا۔ وہ خاموش رہی۔ اس کے چہرے پر تاثر ڈھونڈنے کے لیے میں نے دوبارہ اپنا چہرہ بلند کیا جو اس کی زلفوں میں چھپا ہوا تھا۔ وہ التفات پر آمادہ تھی۔ پتھر پگھل رہا تھا۔ تاریک ترین عظیم کی مقتدر ملکہ ایک عورت کے رُوپ میں جلوہ گر ہو رہی تھی۔ یہ میرا گمان تھا مگر کس قدر حسین گمان تھا۔ میں کچھ اور سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اس اعزاز و کرم سے سیر ہونے کی ٹھان لی اور اپنا ہاتھ بڑھایا اور اس کے پیروں کے اوپر کے پھول اور پتّے وحشت میں نوچنے شروع کر دیے۔ مجھے اپنے حلق میں کانٹے چبھتے محسوس ہوئے، میں تپ رہا تھا۔ اس کی پنڈلی، وہ ساقِ سیمیں، پھولوں اور پتّوں سے لدی پھندی وہ شاخِ گداز۔ میں نے عالمِ سرمستی و بے خودی میں اس کے پھول نوچ لیے اور اپنا چہرہ اس سے مس کر دیا۔ "اقابلا، مقدس اقابلا — اپنے غلام جابر بن یوسف کو صرف ایک بار وحشتوں کا اظہار کرنے دو۔" میں نے کہا۔ لیکن ابھی چند ہی پھول گرے ہوں گے کہ وہ تخت سے اٹھی۔ میں نے اس کی پنڈلی زور سے تھام لی۔ "نہیں نہیں۔" میں نے ہذیان بکا۔ "نہیں نہیں۔"

ایوان کی موسیقی ایک شور میں تبدیل ہو گئی۔ چنگھاڑتی اور چیختی ناقابلِ فہم آوازوں کا شور — میں نے اقابلا کا قد دیکھا۔ اس کا ترشا ہوا ڈھلا ہوا بدن — میرا فریب ہے کہ میں نے اس کا مضطرب چہرہ دیکھا اور کوشش کی کہ اچک کر اس کے بدن کے سارے پھول نوچ لوں۔ اس کے بعد موت بھی نصیب ہوتی مگر ایک آسودہ موت — میں نے جسارت کرنا چاہی لیکن اقابلا نے بے چینی سے اپنا پاؤں میری دسترس

◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆

ایک شخص نے مرغیوں کے بیوپاری کو خط لکھا کہ مجھے چند مرغیاں درکار ہیں، روانہ کر دیجیے۔"

مرغیوں کا بیوپاری مرغیاں لے کر جب اُس پتے پر پہنچا تو مکان مقفل تھا، اس نے مکان سے ملحقہ باغ میں مرغیاں چھوڑ دیں اور ایک کاغذ پر "میں مرغیاں چھوڑے جا رہا ہوں، شام تک دوبارہ آؤں گا" لکھ کر باغ کے مقفل گیٹ سے پھنسا دیا۔

کچھ دیر بعد مکان کا مالک واپس آیا اور گیٹ میں پھنسے ہوئے پرچے کو پڑھنے لگا، اس عرصے میں مرغیاں اِدھر اُدھر بھاگ گئی تھیں۔ اس نے مکان کے آس پاس گلیوں میں مرغیاں تلاش کرنا شروع کر دیں اور بڑی مشکلوں سے پکڑ کر انھیں یکجا کیا۔

شام کو مرغیوں کا بیوپاری ان کی قیمت لینے آیا، تو صاحبِ خانہ نے اس سے شکایت کی۔ بولا!

"صاحب! آپ کی مرغیوں نے مجھے بہت پریشان کیا آپ نے میری عدم موجودگی میں باغ میں مرغیاں چھوڑ کر بڑی غیر ذمّے داری کا ثبوت دیا!"

مرغیوں کے بیوپاری نے پوچھا "کیوں جناب! خیریت؟ کیا ہوا کیا؟"

صاحبِ خانہ نے کہا "آپ کی مرغیاں بھاگ گئی تھیں مجھے اُن کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھاگنا پڑا اور بڑی مشکل سے گیارہ مرغیاں ہاتھ آئیں۔"

مرغیوں کا بیوپاری ہنسنے لگا، بولا "جناب آپ فائدے میں رہے۔ مجھے تو اپنی چھ مرغیوں کی قیمت درکار ہے۔"

◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆

سے آزاد کرالیا اور آخر وقت میں۔ میں نے اتنا سُنا کہ شور ناقابلِ برداشت ہوگیا ہے اور اڑتے ہوئے بادلوں کی گھڑگھڑاہٹ نے ایوان کا سارا ماحول بدل دیا ہے۔ میں نے اپنے اِرد گرد منڈلاتے ہوئے مرغولے دیکھے۔ ساری روشنیاں بند ہوگئیں اور ایوان تاریکی میں ڈوب گیا۔ میری نبضیں ڈوبنے لگیں۔ میں نے لرزتے ہوئے دَر و دیوار دیکھے، جیسے وہ سب مجھ پر گر رہے ہوں۔ اس کے بعد مجھے یاد رکھنے کا ہوش نہ رہا، میں فرش پر پھسل گیا اور میری سماعت و بصارت کچھ دیکھنے، کچھ سننے کی استطاعت کھو بیٹھی۔

یہ سب کیا ہوگیا تھا؟

میرے سینے میں جلن ہو رہی تھی اور اعصاب پر تشنج کی کیفیت طاری تھی۔ جب تاریکی کا طلسم ٹوٹا اور میرے ذہن کی صبح ہوئی تو مجھے اپنے نیچے بدلی ہوئی زمین کا احساس ہوا۔ میں اپنے جھونپڑی نما مکان میں پیال کے بستر پر بے ترتیب حالت میں پڑا ہوا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے رنگ و نور کا ایک سیل رواں تھا۔ اب نہ وہ منقش دیواریں تھیں نہ وہ رنگ برنگے بادل۔ میں اپنی تمام حرماں نصیبیوں کے ساتھ توری کے سخت فرش پر موجود تھا۔ وہ منظر ایک خواب کی طرح گزر گیا لیکن میں نے کوئی خواب نہیں دیکھا تھا۔ میرے ہاتھ میں گلاب کا ایک تر و تازہ پھول تھا۔ ایک گلابی پھول جسے اقابلا کے بدن کی زینت بننے کا شرف حاصل ہوچکا تھا۔ میں نے کسی دیوانے کی مانند اسے آنکھوں سے لگایا۔ اس کی پتیاں اِدھر اُدھر بکھر گئیں۔ میں انھیں جمع کرنے کے لیے فرش پر لوٹتا رہا۔ ایک مدت کی جستجو اور طلب کا صلہ گلاب کی یہ پتیاں تھیں۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ آناً فاناً وہ پری وش اضطراب میں کھڑی ہوئی۔ ایوان کی روشنیاں معدوم ہوئیں اور بادلوں نے گرجنا شروع کردیا۔ پھر سب کچھ بکھر گیا۔ وہ رنگین نقشہ پلٹ گیا۔ اُس لمحے کون عقل و شعور کی پاس داری کرسکتا تھا؟ یقیناً میں نے اپنی حدود کا خیال نہیں رکھا تھا۔ میری حدیں ایک سردار کی حیثیت سے متعین ہوتی تھیں۔ اس کا ہوش رُبا سراپا دیکھ کر کون صرف ایک سردار رہ سکتا تھا؟ میں نے تو اس کے جمال کو خراج پیش کرنے کے لیے اپنے جنون کی ابھی ابتدا ہی کی تھی ــــ

مگر اچانک یہ سب کیوں رونما ہوگیا؟ کیا تاریک برِاعظم کے برگزیدہ لوگوں کو یہ قربت شاق گزری؟ کیا انھیں خبر ہوگئی کہ اقابلا ان سے بے وفائی کی مرتکب ہو رہی ہے اور صرف تین زمینوں کے سردار کو غیر معمولی عنایات سے نواز رہی ہے؟ کیا جارا کاکا کی مقدس رُوح اقابلا کے صاف و شفاف بدن پر کوئی داغ دیکھنا پسند نہیں کرتی؟

آہ اگر میں اس کے لمسِ لطیف اور نظارۂ جہاں سوز ہی پر قناعت کر لیتا اور انگروما اور باگمان کی طرح قصرِ اقابلا میں بھی اپنا نفس مطیع رکھتا تو مجھے اس طرح واپس نہ کیا گیا ہوتا۔ اب سامنے خلا ہی خلا نظر آتا ہے۔ جتنا قریب جایئے، اُس بتِ طناز کا دامن اتنا ہی دُور ہو جاتا ہے۔ تاریک برِاعظم کے ایک سرفراز اجنبی کا انجام قریب تھا کیونکہ اس نے ہوش کھو دیا تھا۔ مجھے دوبارہ یہاں بھیج کر معلق کردیا گیا تھا۔ میں نے اس کے حسن کی توصیف میں بیان کیے جانے والے لفظ ضائع کردیے۔ میرے کلام نے جو اثر کیا تھا، میرے ہاتھوں نے اسے تباہ کردیا۔ میرے عجز نے جو گنجائش پیدا کی تھی، میری وحشت نے اسے تاراج کردیا۔ میرے بستر پر کانٹے بچھے ہوئے تھے اور ذہن سلگ رہا تھا۔ جابر بن یوسف! یہ کیا ہوگیا؟ اب فیصلے کا انتظار کرو۔ تم اس کی مرضی کے بغیر مر بھی نہیں سکتے۔ تذبذب اور کشمکش دُور کرنے کے لیے میں نے زور سے آنکھیں بھینچ لیں اور اپنا منہ بند کرلیا لیکن اس سے نزاع و فشار دُور نہیں ہوا۔

اس وقت میری آہیں اور کرب ناک آوازیں سن کر دوسرے کمرے سے ہندی بوڑھے سرنگا کی لڑکی سریتا آئی۔ میرا بدن اینٹھا ہوا تھا اور میں بستر پر اضطراب میں کروٹیں بدل رہا تھا۔ سریتا نے چیخ چیخ کر اپنی خادماؤں کو آوازیں دیں اور مجھے اپنے پہلو میں بٹھا کر حلق میں کوئی مشروب انڈیلنے کی کوشش کرنے لگی۔ مشروب کا ذائقہ بے مزہ نہیں تھا لیکن سریتا کا پہلو نرم و گداز تھا۔ مجھے کچھ سکون سا ملا۔ میں نے بے تابانہ اپنا سر اس کی آغوش میں دھر دیا۔ اپنا چہرہ چھپانے کے لیے میں نے اس کی آغوش میں پناہیں ڈھونڈیں۔ سریتا میرا سر تھام کر اسے دبانے لگی۔ میں اس کے پہلو میں زار و قطار رونا چاہتا تھا لیکن میری آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک قطرہ بھی نہیں نکلا۔

"سیدی! تمھیں کیا ہوگیا ہے؟" وہ میرے شانے جھنجوڑ کر بولی۔

"میں مر رہا ہوں۔" میں نے اُکھڑی سانسوں سے کہا۔

اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اُسے اپنے چہرے کے تاثرات کے اظہار میں مشاقی حاصل تھی۔ "سیدی! شاید تم حوصلہ کھو بیٹھے۔ تمھارے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے جو تم اتنے دل شکستہ اور درماندہ نظر آتے ہو؟ یہ سیاہ رات ڈھل جائے گی۔ تمھارے لبوں کو ایسی باتیں زیب نہیں دیتیں۔"

"سریتا! ہم یہاں ہمیشہ اجنبی رہیں گے کیونکہ طویل زمانوں کا علم ہماری مختصر عمر میں ہم تک منتقل نہیں ہوسکتا۔ ہماری جہالت کسی دن ہمیں ایک بڑی تباہی سے دوچار کرے گی۔ ہم ہمیشہ اذیتوں میں زندگی بسر کرتے رہیں گے ــــ کیا تم میرا ایک کام کردو گی؟"

"کہو سیدی!" اس نے تشویش سے کہا۔ "مجھے حکم کیوں نہیں دیتے؟"

"میں اب اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ فرد کا زمانی و مکانی رشتہ اُس سے کبھی منقطع نہیں ہوتا۔ شاید میری بات تمھاری عقل میں آجائے۔ ہم کسی دوسرے عہد اور دوسری زمین میں آگئے ہیں۔ ممکن ہے ہم کسی قبرستان میں مقیم ہوں۔ میں تم سے کہتا ہوں کہ میرے شعور سے میرا رشتہ منقطع کردو۔ میرے ہاتھ خود یہ کام انجام نہیں دے سکتے۔"

"سیدی!" سریتا نے حیرت زدہ نظروں سے مجھے دیکھا اور میری گردن سے لٹکا ہوا خنجر پکڑ لیا۔ "سیدی جابر! تمھارے اعصاب آرام کے مقروض ہیں۔ غالباً تم شدید تنہائی محسوس کر رہے ہو۔" پھر وہ افسردگی سے بولی۔ "مگر تم نے خود کو تنہا کیوں سمجھ رکھا ہے؟ تمھارے بلند تر مقام سے کچھ اور زندگیاں بھی وابستہ ہیں۔ تم نے کبھی ان کی طرف بھی غور سے دیکھا ہے؟"

میں نے سریتا کی ٹھوڑی پکڑ لی۔ اس کے چہرے پر آنسو رقصاں تھے۔ سریتا نے اس سے پہلے ایسی گفتگو کبھی نہیں کی تھی۔ "سریتا! تم اپنے باپ کی طرح ایثار پیشہ ہو۔ تم رو رہی ہو؟" میں نے دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھام لیا۔ اقابلا کے گلاب کی پتیاں پھر بکھر گئیں۔

"تم اس سیاہ خانے میں ایک کرن ہو۔ جب یہاں سے تمام مرد اُٹھ جائیں گے تو میری پناہ گاہ غیر مہذب وحشیوں کی آغوش ہوگی جس سے خود تم نے کئی بار مجھے بچایا ہے۔ سیدی جابر! تم اتنے خود غرض ہو کہ تنہا مرنا چاہتے ہو؟ تم کہتے ہو کہ ماضی سے تمھارا تعلق نہیں ٹوٹا مگر تمھاری غیرت کہاں گئی؟"

اس کم سخن نازک اندام لڑکی نے پہلی بار ایسے دلکش اور گداز پیرائے میں مجھ سے باتیں کیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں اسے فراموش کرنے کا جرم کرتا رہا ہوں۔ میں نے زور سے اس کے ہاتھ پکڑ لیے اور انھیں بوسہ دیا۔

ذہن سے قصرِ اقابلا کے واقعے کا تاثر دُور نہیں ہوا تھا لیکن سریتا نے ایک بکھرے ہوئے شخص کو سمیٹ دیا۔ وہ جابر بن یوسف میں دوبارہ زندگی کی حرارت پیدا کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ اس نے مجھے بستر سے اٹھایا۔ میں نے گلاب کا پھول ایک پتے میں محفوظ کرکے اس کے حوالے کردیا۔ پھر توری کی حسین خادماؤں نے سرعت کے ساتھ میرا جسم معطر پانی سے دھویا۔

آج غسل کے بعد ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ میرے ساتھ کوئی سلوک کر رہی ہوں۔ سریتا نے میرے بال درست کیے۔ میں نے جارا کاکا کی کھوپڑی ہاتھ میں لے کر توری کی دوشیزاؤں اور سریتا کے ساتھ اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کیا اور اس سے رہنمائی کی درخواست کی۔ پھر میرے سامنے بھنا ہوا گوشت پیش کیا گیا۔ دل غذا کی طرف مائل نہیں تھا مگر میں سریتا کے ہاتھوں سے بھنے ہوئے گوشت کے لقمے حلق میں اتارنے پر مجبور تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ طبیعت اعتدال کی طرف آرہی تھی۔ سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ نرماز غائب تھی جو قصرِ اقابلا کی طرف سے مجھے فرحتِ دیدہ و راحتِ دل کے لیے عطیے کے طور پر سونپی گئی تھی۔ میں نے اسے متعدد بار پکارا مگر میری آواز خلاؤں میں گم ہوگئی۔ ایک رات تمار بھی اسی طرح غائب ہوگئی تھی۔ شاید اقابلا نے اپنا عطیہ واپس لے لیا تھا۔ کسے معلوم تھا کہ اقابلا اور کیا واپس لے گی؟ کاہنِ اعظم سموال اور سرنگا کے پاس جا کر میں اُن سے قصرِ اقابلا میں پیش آنے والے واقعے کی توجیہہ و تشریح کا خواہاں تھا لیکن اس مقصد کے لیے یہ مناسب موقع نہیں تھا۔ رات بھر سریتا اور خادمائیں میری دل جوئی کرتی رہیں اور میرا اغبار دُور کرنے میں منہمک رہیں۔ وہ میرے قریب بیٹھی رہیں اور میں فیصلے سوچتا اور مسترد کرتا رہا تا آں کہ میں ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔

صبح ہونے سے پہلے میں توری کے سبزہ زار کی طرح تر و تازگی محسوس کر رہا تھا۔ ہاں ذہن کے کسی گوشے میں ایک اجنبی خوف چھپا ہوا تھا۔ رات کی تاریکی بے بس اور دل گرفتہ لوگوں کے لیے بڑی گراں ہوتی ہے۔ پنجرے میں دن کا اجالا بُرا نہیں لگتا۔ تاریک برِاعظم ایک بڑا پنجرا

تھا جو رات کو اور خوف ناک ہو جاتا تھا۔ صیاد سے گداز کی توقع عبث تھی۔ دن کی روشنی پھیلی تو میں نے عزم کیا ۔۔۔ جابر بن یوسف! یاد رکھ کہ تو ایک درخت ہے، خود کو تسلیم کرنے پر آمادہ کر کہ تو ایک بے پر پرندہ ہے۔ تیرے لیے مفر کی کوئی صورت نہیں۔ تیرا ہر سہارا بے بنیاد ہو گا۔ زمین پکڑنے کے لیے اپنی شاخیں دُور دُور تک پھیلا۔ آسمان پر اُڑنے کے لیے اپنے بازوؤں میں دوبارہ پَر بڑھا اور وقت کا انتظار کر۔ وقت یوں نہ گنوا۔ دیوتاؤں کا جو بھی ردِ عمل ہو گا وہ تیری مضبوطی اور تیرے علم کی دیانت کی بنیاد پر ہو گا۔ سرنگا کی عظیم دیوی بھی اس سرزمین پر بے بسی محسوس کرتی ہے ورنہ اب تک وہ ہم تیرہ بختوں کو یہاں سے نکال لے جاتی۔ تیرے لیے اطمینان کا یہی ایک ذریعہ ہے کہ تو خود کو ان سیاہیوں کا عادی بنا لے۔ آہ کیا تو نے پہلے غور نہیں کیا؟ کیا تو نے پہلے کچھ نہیں دیکھا؟ تو نے خود سے کہا تھا کہ اس کا حصول مشکوک ہے لیکن ہاتھ پر ہاتھ دھرے رہنے سے بہتر کسی امکان کی تلاش ہے۔ تیرا انتشار انقلاب میں تبدیل ہو کر پھر اپنی راہ کیوں بھٹک جاتا ہے؟ چل حرکت کر ۔۔۔ چل کہ سوچتے سوچتے تیرا دماغ پھٹ جائے گا اور بیٹھے بیٹھے تیرے جسم پر زنگ لگ جائے گا ۔۔۔ اُٹھ اور آسمان کی طرف مت دیکھ۔

مجھے یاد آیا کہ میں ایک راست سمت میں چل رہا تھا کہ اقا بلا کی دید نے سارا سلسلہ درہم برہم کر دیا۔ مجھے پھر وہیں سے ابتدا کرنی چاہیے۔ اقا بلا کی بارگاہ میں جانے سے پہلے میں نے جزیرۂ توری میں اُبھرنے والے خطروں کا سر کچل دیا تھا۔ میں نے نوجوانوں کو ہاتھ پاؤں پھیلانے سے پہلے اپنے احکام کی زنجیروں میں باندھ لیا تھا ۔۔۔ میں توری کا سب سے بڑا شخص تھا۔ اس زمرے سے وہ لوگ خارج کر دیے جائیں جو اقتدار میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے اور جنگلوں، غاروں میں آبادیوں سے دُور دیوتاؤں کی خدمت میں مصروف ہیں ۔۔۔ توری کا یہ سب سے بڑا شخص سب سے غم زدہ شخص تھا کیونکہ اسے غم کا عرفان حاصل تھا۔ اس کے احساسات نے اس ماحول میں پرورش نہیں پائی تھی۔ سارا قبیلہ سو رہا تھا ۔۔۔ بے سدھ پڑے ہوئے لوگ ۔۔۔ عورتیں اور مرد ایک دوسرے کے جسموں پر تکیہ کیے ہوئے تھے۔ سکون اور اطمینان کی نیند ۔۔۔ انھیں دیکھ کر مجھے رشک آیا اور میں ان کے قدموں اور سروں سے بچتا ہوا گھنے جنگل میں پہنچ گیا۔ جنگل میں صبح کا منظر بڑا دلکش معلوم ہوتا ہے۔ پرندوں کے چہچہوں اور درندوں کی گونج نے مجھے زندگی کا سبق سکھایا اور میں نے خود کو سمجھایا کہ میں یقیناً ان درندوں سے افضل ہوں۔ میں بول سکتا ہوں، سوچ سکتا ہوں ۔۔۔ لیکن یہی تو ایک نقص ہے۔ اس بولنے اور سوچنے کی وجہ سے انسان کائنات کی سب سے نحیف اور سب سے قوی مخلوق ہے۔ جنگل میں گزرتے وقت میں نے اب تک سیکھے ہوئے توری کے ظاہری و باطنی علوم سے اپنے لیے ایسا غار تلاش کرنا شروع کر دیا جسے میں سمورال کی طرح اپنی عبادت گاہ یا سحر خانہ بناؤں۔ سمورال کی تربیت سے مجھے ماورائی علوم پر دسترس حاصل ہو گئی تھی، میرے پاس نادر تحائف تھے ۔۔۔ جارا کاکا کی کھوپڑی گرفت میں لے کر میں نے چوبی اژدھا متحرک کیا اور اسے زمین پر چھوڑ دیا۔ وہ زمین سونگھتا پھر رہا تھا۔ آخر میں نے اپنا موجودہ راستہ ترک کر کے اُونچے درختوں کے درمیان چلنا شروع کر دیا۔ ایک جگہ اژدہا ٹھیر گیا۔ میں نے وہ دیوار جیسی اونچی زمین نرمی سختی کا اندازہ کرنے کے لیے ڈگی کے سینگوں سے کُرید ی۔ اُوپر کی مٹی ہٹی تو اندر پتھر کا ایک دیو قامت ٹکڑا نظر آیا۔ معلوم ہوتا تھا عرصے سے کسی نے اس غار کو نہیں چھیڑا ہے۔ جزیرۂ توری میں ایسے غاروں کی کثرت تھی۔ ان میں ایک غار قصرِ اقا بلا کو بھی جاتا تھا جہاں سب سے پہلے مجھے تدولین ملی تھی اور جو لمبی سرنگ کے بعد ایک عظیم الشان زمین دوز محل میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ باگمان میں لویما کے قصر تک پہنچنے کے لیے بھی مجھے ایک غار سے گزرنا پڑا تھا۔ میں نے پتھر کی جسامت ٹٹولنے کے لیے اپنے جسم کا سارا زور لگایا۔ میں اسے ہلا بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے اُوپر مٹی کی دبیز تہہ تھی۔ جس پر جھاڑ جھنکاڑ تھے اور جسے چھوٹے درختوں نے اپنا مسکن بنا لیا تھا۔ سب سے پہلے میں نے جھاڑ جھنکاڑ صاف کیے۔ پھر دُور جا کر پتھر پر شپالی کا نشانہ بنایا اور احتیاط کے طور پر جارا کاکا کا عمل دُہرایا جو مجھے سمورال نے سکھایا تھا۔ اندر رُوحوں کی موجودگی بھی ممکن تھی۔ جیسا کہ مجھے انگردما میں سابقہ پڑا تھا۔ شپالی کے زور اور جارا کاکا کے عمل سے پتھر ٹکڑوں میں منقسم ہو گیا۔ میں نے اندر کی بھیانک روشنی میں جھانک کر دیکھا۔ بدبو کا ایک جھونکا میرے نتھنے زخمی کر گیا۔ میں ایک لمحے سوچتا رہا پھر چوبی اژدہا آگے کر کے میں نے غار کے اندر قدم رکھا۔ شپالی کی روشنی میں غار کے اندر کا حصہ عریاں ہو گیا تھا۔ اندر کی فضا بڑی مسموم تھی۔ میں حفظِ ماتقدم کے طور پر زارشی کے صحرا میں بوڑھے عبادت گزاروں کا عمل یاد کر رہا تھا جسے میں زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ ابھی میں غار کے اندر زیادہ دُور نہیں پہنچا ہوں گا کہ اژدہا میری ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ یہ خطرے کی علامت تھی۔ میں نے جارا کاکا کی کھوپڑی زور سے پکڑ لی۔ غار کی دیواریں ہموار نہیں تھیں۔ کہیں وہ تنگ اور کہیں فراخ تھیں اور اندر درختوں کے تنے نظر آتے

تھے۔ طرح طرح کے جالے اور گرد۔ ان چیزوں سے اس کی کہنگی ثابت تھی۔

دفعتۃً اندر سے خرخراہٹ سے مشابہہ کچھ ناقابلِ فہم آوازیں آنی شروع ہوئیں۔ میں اپنی جگہ جم کر کھڑا ہو گیا۔ پھر میں نے ایک ہیولا اپنی طرف خاصا تیز بھاگتے ہوئے دیکھا۔ ہیولے کے قریب آنے پر شپالی کی روشنی میں اس کا چہرہ میری نظر کے دائرے میں نمایاں ہو گیا۔ وہ آنکھیں پٹ پٹا رہا تھا۔ نظروں میں حیرانی مترشح تھی۔ شپالی کی چمک اس کی آنکھیں خیرہ کر رہی تھی۔ اس کے سارے جسم پر بال اُگے ہوئے تھے اور وہ اتنا نحیف و نزار تھا کہ اس کے زندہ رہنے پر شبہ ہوتا تھا مگر اس کی اندر دھنسی ہوئی آنکھوں میں زندگی کی رمق موجود تھی۔ کیونکہ وہ شپالی کی روشنی میں ہیرے کی مانند چمک رہی تھیں۔ یوں کہنا چاہیے کہ وہ ایک سیاہ منحنی گوریلا یا کوئی سیاہ ریچھ تھا۔ میں نے تاریک برِاعظم میں ایسے حلیے اور قد و قامت کا شخص کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ بات اس کے چہرے اور غار کی شکستہ حالت سے صاف تھی کہ وہ عرصے سے باہر نہیں نکلا ہے اور اس اندھیرے غار میں لامحدود مدت سے مقیم ہے۔ وہ مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا، میں فوراً کوئی رائے قائم نہ کر سکا۔ البتہ میں نے سوچا، اس میں شبہ نہیں ہے کہ یہ اس سرزمین کے ان عبادت گزاروں میں شامل ہے جو اس طلسماتی دُنیا کی رُوح ہیں چنانچہ یہ ایک غیر معمولی ساحر بھی ہوگا۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا لیکن یوں واپس ہونے کا اب کوئی امکان نہیں تھا۔ اس کے سکون، استغراق اور ریاضت میں میرے مخل ہونے پر اس کے مزاج کا برہم ہونا فطری امر تھا۔ میں نے متوازن رویہ اختیار کرنے میں پہل کی اور نہایت احترام اور عزت سے اُس ریچھ کو مخاطب کیا۔ ان حالات میں یہی کیا جا سکتا تھا؟ میں اس کے آگے جھک گیا اور عجز و انکسار سے اپنا تعارف کراتے ہوئے میں نے اس سے معذرت چاہی۔ وہ میرا اندازِ تخاطب حیرت سے آنکھیں پٹ پٹاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے مجھے کوئی جواب دیے بغیر اشارہ کیا کہ میں اس کے پیچھے چلوں۔ انکار کا موقع نہیں تھا۔ میں اس کے پیچھے چلنے لگا لیکن اسی وقت سمورال کی مالا کے دانتے مجھے اپنے سینے پر چبھتے ہوئے محسوس ہوئے۔ سمورال کی مالا پہلے بھی کئی خطرناک موقعوں پر مجھے اس قسم کی تنبیہہ کر چکی تھی۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ اس بوڑھے کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔ میں نے شپالی ہتھیلی پر رکھ دی۔ دُور اندر جا کر غار ایک چوکور کشادہ جگہ میں تبدیل ہو گیا۔ دیواریں میلی کچیلی اور سیاہ تھیں۔ کوئی قندیل روشن نہیں تھی۔ کوئی مشعل بھی نہیں تھی۔ ایسی خوف ناک تاریکی میں وہ شخص نہ جانے کب سے اس غار میں محبوس تھا۔

بڑے دائرے والی جگہ ٹھیر کر اس نے مجھے بڑے برتن سے ایک جام پیش کیا۔ میں نے شپالی اپنی مٹھی میں بند کر لی۔ غار میں پھر تاریکی چھا گئی۔ جام پینے کے بجائے میں نے اُسے زمین پر لوٹ دیا تھا۔ دوبارہ شپالی کی روشنی میں میں نے خالی جام اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ایک ثانیے بعد وہ میرے نزدیک آیا اور اس نے بالکل غیر متوقع طور پر ہاتھ بڑھا کر میرے گلے سے چوبی اژدہا چھین لیا۔ سمورال کی مالا کے دانوں کے انتباہ سے میں پہلے ہی محتاط ہو گیا تھا لہٰذا میں نے چوبی اژدہا اس سے اسی طرح فوراً چھین لیا، جیسے اس نے چھینا تھا۔ میری اس جسارت پر اس کی آنکھیں قہر و غضب کی علامت بن کر دہکیں اور اس نے جھنجلا کر وہیں کھڑے کھڑے اپنا ہاتھ پشت کی طرف دراز کیا۔ دیوار دُور تھی مگر اس کا چھوٹا سا ہاتھ وہاں پہنچ گیا۔ میں دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اچانک مجھے اپنے دائیں گال پر بیک وقت متعدد کیلیں سی چبھتی محسوس ہوئیں۔ کیلوں کی نوکیں اتنی سخت اور شدید تھیں کہ میری چیخیں نکل گئیں اور میں شدتِ درد سے زمین پر پیر پٹخنے لگا۔ مجھے بوڑھے شخص کا ہنستا ہوا چہرہ نظر آیا۔ اس بدہیئت کے دانت اس کے حلیے کے تمسخر اور مضحکہ خیزی میں اضافہ کر رہے تھے اور وہ کوئی شیطان معلوم ہو رہا تھا۔ میرے اوسان خطا ہو چکے تھے۔ بے شمار پیروں والا یہ زہریلا بچھو میرے گال میں پیوست ہو گیا تھا اور جیسے کوئی میری رُوح کھینچ رہا تھا۔

درد و کرب میں لڑھکتے پڑھکتے میں نے ایک بار پھر صحرائے زارشی کا عمل دُہرا کے شپالی اپنے جلتے ہوئے گال سے مس کی جہاں کچھ پیوست تھا۔ بچھو نے اپنے پیر اچانک ڈھیلے چھوڑ دیے۔ دوبارہ جب اس نے میرے زخمی گال پر یہی عمل کیا تو میں اذیت سے بُری طرح تڑپنے لگا۔ میں نے شپالی سمیت اپنا ہاتھ گال پر طمانچے کے انداز میں مارا اور تمام طاقت یک جا کر کے اپنے گوشت سے بچھو علیحدہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ گوشت کا مچا، بچھو اور شپالی، یہ تینوں چیزیں میں نے زمین پر پھینک دیں اور اس وقت مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ شپالی زمین پر گرتے ہی بوڑھا ساحر بندر کی طرح پھرتی سے زمین کی طرف لپکا۔ مجھے آنے والے خوف ناک لمحوں کا اندازہ ہو گیا تھا چنانچہ میں نے نتائج سے بے پروا ہو کر اپنے تحائف پشت پر ڈال کر ساحر پر ایک زقند لگائی اور اس کا نحیف و نزار جسم دبوچ کے شپالی سے دُور کر دیا، اس کے لکڑی جیسے جسم میں شیر جیسی طاقت تھی۔ تاریک برِاعظم میں اس وقت میری موت اور زندگی کا سوال تھا۔ میں اس کے جسم کے اوپر تھا اور میں نے کوئی مہلت

دیے بغیر اور کوئی توقف کے بغیر اس کا سر زمین سے مارنا شروع کر دیا۔ میں کوئی پاگل تھا یا کوئی بھوکا درندہ تھا۔ اس نے بڑی شدید مزاحمت کی اور مجھے اپنی ٹانگوں کے زور سے دیوار پر دھکیل دیا۔ وہ پھر شپالی کی طرف لپکا مجھے اتنی فرصت نہیں تھی کہ اپنا چوبی اژدہا زمین پر ڈال دیتا۔ اس بار میں نے زور سے چیخ ماری، بوڑھے نے حیران نظروں سے پلٹ کر دیکھا، اس کا میری طرف متوجہ ہونا تھا کہ میں نے اُچک کر اسے دبوچ لیا اور اسے لیے لیے زمین پر لوٹ گیا۔ اس مصروف اور مشکل لمحے میں میں نے کسی طرح یہ لمحہ بھی حاصل کر لیا کہ میں اپنے محسن اژدہے کو اشارہ کر سکوں، وہ شپالی کے حصول کے لیے زمین پر رینگنے لگا۔ بوڑھا شخص میرے جسم کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا اور میں اس کا سر زمین سے پاش پاش کر رہا تھا۔ اب کی بار میں نے اس کی دبلی پتلی مگر مضبوط ٹانگیں دبائی ہوئی تھیں۔ اژدہے نے شپالی نگل لی تھی۔ یہ اطمینان کرنے کے بعد میں کھڑا ہوا اور میں نے بہ عجلت تمام ڈبی کے سینگ گلے سے اتار کر بوڑھے ساحر کے سینے میں پیوست کر دیے، اژدہا میری ٹانگوں کے سہارے اوپر چڑھ رہا تھا مجھے یقین تھا بوڑھا ساحر بہ مشکل سے مزاحمت کرے گا لیکن میں نے اس گدھ کو کوئی موقع نہیں دیا اور شپالی اس کے جسم پر دے ماری، اس کی ہول ناک چیخ سے سارا غار گونج گیا۔ وہ آخری چیخ تھی جس نے غار میں ایک گرج چمک سی پیدا کر دی تھی۔

اس کے بے دم ہوتے ہی مجھے احساس ہوا کہ میرا دم بھی نکل رہا ہے۔ میں نے غار سے بھاگنے کا ارادہ کیا لیکن میرے قدم ڈگمگانے لگے اور میں ایک مقام پہ بے سدھ گر گیا۔ وہ صبح تھی یا شام یا کئی دن گزر گئے۔ مستقل تاریکی اور مستقل روشنی میں وقت گزرتا محسوس نہیں ہوتا۔ وقت تو روشنی اور تاریکی کے نشیب و فراز سے عبارت ہے۔ جب میرے حواس خارجی اثر سے آزاد ہو گئے اور دوبارہ میرے جسم سے وابستہ ہوئے تو میں نے دیکھا کہ میں غار کی نم زمین پر پڑا کراہ رہا ہوں اور میرا رفیق اژدہا میرا گال چاٹ رہا ہے۔ دفعتۃً میرے ذہن میں سارا واقعہ کوند گیا، میں نے اپنے گال پر ہاتھ رکھ کے دیکھا۔ وہ حصہ زخمی ہو چکا تھا اور اژدہے کی رطوبت اور خون سے لتھڑا ہوا تھا۔ میں نے اژدہے کو وہاں سے ہٹا کے اُسے ایک بوسہ دیا اور کراہتا ہوا اُٹھا۔ نقاہت سی محسوس ہو رہی تھی جیسے کسی نے سارے جسم کا رس نچوڑ لیا ہو۔ پھر غار سے باہر جانے کے بجائے میں اندر کی طرف بڑھا، چوکور دائرے کے قریب بوڑھے ساحر کی لاش جلی ہوئی پڑی تھی اور سارا غار شپالی کی وجہ سے منور ہو گیا تھا۔ میں نے ہر چیز کا تفصیل سے جائزہ لیا۔ دیواروں پر ٹنگے ہوئے نوادر مردہ جانوروں کی کھوپڑیاں اور طلسمی آلات دیکھ کر میری حیرت دو چند ہو گئی۔ دیواریں

کا جھگڑا اتنا بڑھا کہ شوہر نے زچ ہو کر گھر چھوڑ دیا اور دل بہلانے کہیں چلا گیا۔ شام کو جب بھوک نے ستایا تو گھر واپس آیا اور بیوی کی طرف دوستی اور مفاہمت کا ہاتھ بڑھاتے ہوئے پوچھا "کھانے کے لیے کیا تیار ہے؟"

بیوی نے ترش رُوئی سے جواب دیا "زہر۔"

شوہر نے نرمی سے کہا "میری تو ایک دوست کے ہاں دعوت ہے، تو بچے اپنی والدہ کو بھیج دینا۔"

ٹھونک کے میں نے اندر کے راستے دیکھے، پتھر کی دیواریں میرے نوادر کی وجہ سے کھل گئیں اور میں کھوہ نما کمروں کے ایک سلسلے سے گزرا۔ ایک بہت بڑی زمین دوز عمارت تھی۔ بہت بڑا طلسم خانہ۔ ہر کمرے میں نوادر کی ایک دنیا آباد تھی۔ عجیب عجیب شکل کی چیزیں۔ میں ان میں سے چند کا استعمال سیکھ چکا تھا اور ان کی اہمیت سے واقف تھا۔ میں مختلف کمروں کا جائزہ لیتا ہوا سرنگ پار کر کے غار سے باہر آ گیا۔ باہر بھی تاریکی تھی، اس کا مطلب یہ تھا کہ ایک سمو چار دن یا کئی دن مجھے اس غار میں گزر گئے تھے۔ سرد ہوا کے جھونکے نے رخسار کے زخم میں اور زیادہ ٹیس پیدا کر دی لیکن اتنا بڑا اثاثہ پا کر خوف اور مسرت کے ملے جلے جذبات مجھ پہ غالب آ گئے تھے میں اپنا تکدر بھول چکا تھا۔ نقاہت کی وجہ سے غار کا دہانہ بند کرنا مشکل تھا کیونکہ بڑا پتھر پہلے ہی کئی حصوں میں منقسم ہو چکا تھا۔ دیر تک میں اِدھر اُدھر سے پتھر اور جھاڑ جھنکار جمع کر کے غار کے دہانے پر رکھتا رہا۔ میں اسے اس طرح تو نہیں چھوڑ سکتا تھا، جب دہانہ عام آدمیوں کی نظروں سے اوجھل ہونے کے لائق ہو گیا تو میں اپنا زخمی گال سہلاتا ہوا کچھ فتح مندی، کچھ سرشاری کچھ شک اور کچھ خوف کے احساسات کے ساتھ جنگل سے واپس چلا۔ جگہ کی شناخت میرے لیے مشکل نہیں تھی اس لیے کہ پتھر اس ترتیب سے رکھے گئے تھے کہ میں اسے بڑی آسانی سے شناخت کر سکتا تھا۔ میں تھکا تھکا آبادی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

تورّی میں رات کا شباب نمایاں تھا۔ میں اُن سے چھپتا چھپاتا اپنی جھونپڑی میں واپس آ گیا، سرتیا میرا زخم دیکھ کر چیخ پڑتی۔ مجھے گہری نیند آ رہی تھی۔ مجھے معلوم نہیں کون جھونپڑی میں آیا، فزارد، زارمے، سرتیا قبیلے کے اور معمر لوگ۔ طبیب جواد۔ میں گہری نیند سو گیا اس لیے کہ یہ ایک محفوظ

جگہ تھی۔ یہ میرا ٹھکانا تھا۔

دوسرے دن صبح میرے مکان کے باہر قبیلے کے لوگوں کا اژدہام تھا جو اپنے سردار کی خیریت معلوم کرنے آیا تھا۔ فزارو اور زارمے ایک طرف مؤدب کھڑے تھے اور سرتیا خادماؤں کو احکام دے رہی تھی۔ باہر کے زبردست شور اور اندر کی سرگوشیوں سے میری آنکھ کھل گئی۔ سرتیا کا اُداس چہرہ کھل اٹھا۔ زارمے نے باہر جاکر اعلان کیا کہ ان کا سردار خیریت سے ہے۔ میں رات بھر بے ہوش رہا تھا اور رات بھر توری کے اطبّا میرے زخمی گال پر مشق ستم کرتے رہے تھے۔ زخم پر لیپ لگا ہوا تھا اور ہلکی سوزش ہو رہی تھی۔ میرے جاگتے ہی سرتیا نے طرح طرح کے سوال شروع کر دیے اور ناراض ہونے لگی کہ میں خطروں میں دانستہ کودپڑتا ہوں اور اتنے بہت سے غلام ہونے کے باوجود تنہا جنگل میں سفر کرتا ہوں۔ میں نے سرتیا کی بات سُنی ان سُنی کر دی۔ میں اسی وقت اُٹھ کر سمورال کے پاس جانا چاہتا تھا تاکہ اسے کل کی مہم کا حیرت انگیز واقعہ سناؤں اور وہ نوادر دکھاؤں جو اب جزیرۂ توری کی روایت کے مطابق میری ملکیت تھے۔ سمورال سے معلومات حاصل کیے بغیر میں ان نوادر کی اہمیت وافادیت سے پوری طرح واقف نہیں ہو سکتا تھا، ہرچند سمورال کو وہاں لے جانے میں پس وپیش بھی تھا مگر سمورال کو شریکِ راز کیے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ سرنگا بھی اس غار کی دریافت وبازیافت پر غیر معمولی ردِّعمل کا اظہار کرے گا۔ پھر مجھے خیال آیا، اس معاملے کے انکشاف میں کسی عجلت کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ ممکن ہے سمورال نے اپنے طلسمی کڑھاؤ میں خود میری کامیابی کا نظارہ دیکھ لیا ہو اور سرنگا کو بھی اپنی دیوی کی اعانت سے اس کی خبر ہوگئی ہو۔

اصل میں سب سے پہلا کام جزیرۂ توری پر آتے ہوئے اجنبیوں کی قسمت کا فیصلہ کرنا تھا جو ابھی تک قید میں تھے، دیوتاؤں اور افابلا کو لازماً اس امر سے دل چسپی ہوگی کہ مہذب دنیا کا ایک شخص اپنے لوگوں کے ساتھ کیا برتاؤ کرتا ہے؟ یہ ایک تکلیف دہ مرحلہ تھا مگر یہاں مردم آزاری، دل آزاری جیسے رُوح فرسا رِیتوں کا کوئی احساس نہیں تھا۔ اِدھر مہذّب دُنیا کے لوگوں سے ملنے، باز پرس کرنے اور ان کی دردناک سرگزشت سُننے کا اشتیاق دبانا اپنے آپ پر جبر کرنے کے برابر تھا۔ میں جلد از جلد ان کا فیصلہ کرکے اپنا اعتماد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ جتنی دیر ان کے فیصلے میں تاخیر ہوتی، میرے سینے پر ایک بوجھ رہتا۔ تنہا جانے کے بجائے میں نے فزارو اور زارمے کو ساتھ لے لیا۔ مجھے بستر سے اُٹھتے دیکھ کر انھوں نے روکنا چاہا لیکن میں نے انھیں دھتکار دیا اور ایک خادمہ کو راستے سے ہٹانے کے لیے ضرب لگائی، وہ تڑپ کر ایک طرف ڈھیر ہوگئی، فزارو، زارمے اور سرتیا نے اس کے بعد کوئی لفظ ادا نہیں کیا۔ میرے باہر نکلتے ہی ڈاکٹر جوّاد سمیت قبیلے کے سارے لوگ زمیں بوس ہوگئے۔ دُور تک انسانوں کی پشتیں نظر آتی تھیں۔ پھر فزارو کے حکم پر وہ اُٹھ گئے اور میں نے اپنے قریب کھڑا ہوا درخت ایک جھٹکے سے گرا دیا۔ مجمع میں نعرہ ہائے تحسین کا شور بلند ہوا، میں فزارو اور زارمے کے ساتھ ان کے درمیان گزرتا ہوا اس سمت جانے لگا جہاں اجنبی لوگ سب سے الگ تھلگ قید رکھے گئے تھے۔ انھیں دوبارہ دیکھنے کے لیے میرے قدم خود بخود تیزی سے آگے بڑھنے لگے، پہلی بار میں نے انھیں سرسری طور پر دیکھا تھا لیکن اب میں اُن سے آنکھیں ملا سکتا تھا کیونکہ میں یہاں کا سردار تھا اور مہذب دنیا سے میرا تعلق ختم ہوچکا تھا۔ فزارو اور زارمے کے اشارے پر سارا مجمع منتشر ہوگیا۔ ڈاکٹر جوّاد نے میرے ساتھ آنا چاہا، میں نے اُسے روک دیا، سرتیا بھاگ کر میرے پاس آگئی، میں اسے روک نہیں سکتا تھا۔ وہ میرے پہلو سے لگی لگی چل رہی تھی۔

اجنبیوں کی جھونپڑیوں پر نیزہ بردار حبشی تعینات تھے۔ اپنے سردار کے سامنے وہ سربسجود ہوگئے۔ میں نے سرتیا کو منع کیا کہ وہ اجنبیوں کے سامنے ان کی زبان میں گفتگو نہ کرے بلکہ خاموش رہے۔ قیدیوں کو باہر نکالنے کا حکم دیا گیا۔ اندر سے بڑی شکستہ حالت میں قیدی یکے بعد دیگرے برآمد ہوئے۔ ان کے لباس تار تار تھے اور چہروں پر غم واندوہ، امید وبیم کی کیفیتیں نمایاں تھیں۔ زارمے نے پھنکار کر کہا۔ ”ہمارا سردار جابر بن یوسف!“

انھوں نے مضمحل گردنیں اُٹھائیں اور چونک کر میری طرف دیکھا۔ میں زارمے، فزارو اور دوسرے حبشیوں سے بہت مختلف تھا۔ سرتیا کا چہرہ بھی توری کی لڑکیوں سے الگ تھا۔ وہ حیرت میں ڈوبے ہوئے تھے لیکن میرا حلیہ اتنا مقامی اور انداز اتنا وحشی تھا کہ وہ میرے اور سرتیا کے بارے میں کوئی قطعی رائے قائم نہیں کر سکتے تھے۔ میرے نام کی ساخت بھی ان کے لیے چونکا دینے والی بات تھی۔ ہم سب بے لباس تھے، ہمارے جسم رنگے ہوئے تھے اور گلے میں متعدد قسم کے کڑے، کنٹھے اور کھوپڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ قیدیوں میں سات مرد اور چار عورتیں تھیں۔ مردوں میں دو نوجوانوں کے سوا سب ادھیڑ عمر کے تھے۔ عورتوں میں تین نوجوان لڑکیاں تھیں اور ایک کوئی تیس سالہ صحت مند بدن اور دلکش خدوخال کی عورت تھی۔ میں ان کی وحشت زدہ چہروں سے جھانکتی ہوئی قومیتیں کسی حد تک جان سکتا تھا، یونانی، اسپینی، مصری، امریکی اور ایرانی تینوں نوجوان لڑکیاں نہایت حسین تھیں۔ ایرانی اور امریکی نقش ونگار کی لڑکیاں ان میں سب سے زیادہ حسین تھیں۔ میرے بارے میں زارمے کا تعارف سن کر وہ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ان کی ٹانگیں لرزنے لگیں، عورتیں مردوں سے لپٹ گئیں۔ ان میں کوئی شخص تاریک برِّاعظم کی زبان سے واقف معلوم نہیں ہوتا تھا وہ آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے۔ میرے خط وخال کے بارے میں ان کی رائے دلچسپ اور متضاد تھی۔ میں خاموشی سے ان کی گفتگو سننے لگا۔ ”یہ وحشی سردار تو اس سرزمین کا شخص نہیں لگتا۔“ ان میں سے ایک نے سرگوشی کی۔

”نہیں تمھارا خیال غلط ہے۔“ دوسرے نے رائے دی۔ ”مہذّب دنیا کا کوئی آدمی ایسا حلیہ اختیار نہیں کرسکتا۔“

”یہ تو بالکل وحشی ہے۔ حبشیوں کی کسی اعلا نسل سے اس کا تعلق ہے۔ مگر اس کا نام؟“

”اور یہ لڑکی؟“ انھوں نے کنکھیوں سے سرتیا کی طرف دیکھا۔

”یہ لڑکی؟“ ادھیڑ عمر کا اسپینی کچھ سوچ کر بولا۔ ”اس کے نقوش آرین ہیں مگر یہ تو برہنہ ہے۔ بہر حال بڑی خوبصورت لڑکی ہے۔“

”ہمیں آزادانہ گفتگو نہیں کرنی چاہیے۔ ان کے تیور اچھے معلوم نہیں ہوتے۔ ممکن ہے یہ ہماری زبان سے واقف ہوں۔“

”پاگل۔ یہ کس طرح ممکن ہے؟ کیا تمھارے خیال میں یہ شخص کیمبرج اور آکسفورڈ میں گیا ہوگا؟“

”خدا ہم پر رحم کرے۔ ہم کس مصیبت میں گرفتار ہوگئے ہیں؟ پتہ نہیں یہ ہمارے بارے میں کیا فیصلہ کریں؟“

”مجھے تو یہ زمین پُراسرار معلوم ہوتی ہے۔“ ایرانی لڑکی نے کہا۔

”اور ہوسکتا ہے یہ لوگ مردم خور ہوں۔“

”خاموش۔ ہمیں بہتر حالات کی توقع کرنی چاہیے۔ اُنھوں نے ہمارے چار ساتھی مار دیے ہیں، ہماری ذراسی لغزش سے کچھ اور ساتھی بھی ہم سے جُدا ہوسکتے ہیں۔“

”کاش ہم ان کی زبان جانتے۔“

”کاش وہ ہماری زبان جانتے۔“

”ہمیں ان سے رحم کی بھیک مانگنی چاہیے۔“

میں ان کی سرگوشیاں پورے انہماک اور دل چسپی سے سُن رہا تھا۔ میں نے زارمے کو مزید گفتگو کرنے سے منع کر دیا تھا۔ ان کے خوف اور اندیشوں نے میرے دل ودماغ پر گہرا اثر کیا اور مجھے اپنے فیصلے میں ہچکچاہٹ ہونے لگی۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں تھی، میں نے زارمے کو اشارہ کیا اور اس نے امریکی لڑکی کی لال قمیص پھاڑ دی پھر وہ اس کے سینہ پوش کی طرف بڑھا۔ امریکی لڑکی چیختی ہوئی پیچھے ہٹ گئی۔ ”خدا ہم پر رحم کرے۔ ہم درندوں میں گھر گئے ہیں۔ آہ شاید میں اپنی بیمار ماں کو اب کبھی نہ دیکھ سکوں گی۔“
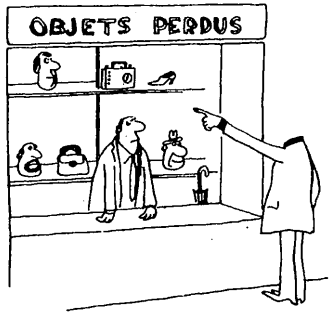
”میرے بچے میرا انتظار کرتے رہیں گے۔“ اسپینی نے کہا۔

”انھوں نے کبھی تہذیب کی روشنی نہیں دیکھی۔ وہ گھور کر ہمارے لباس دیکھ رہے ہیں۔ ان کی نظروں میں خون ہے۔“

”کیا تمھارا کوئی شخص مقدّس زبان سے واقف ہے؟“ زارمے نے گرج دار آواز میں کہا، میں نے محسوس کیا اس کی نظریں سفید فام لڑکیوں کے بدن ٹٹول رہی ہیں۔

انھوں نے ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا، ایک تنومند نوجوان آگے بڑھ کر آیا اور اس نے مؤدبانہ ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں اٹک اٹک کر کہا۔ ”ہم بدنصیب لوگ تمھاری زبان نہیں جانتے۔“

”تم کہاں سے آئے ہو؟“ زارمے نے درشتی سے پوچھا۔

”ہم ڈربن جارہے تھے کہ ہمارا جہاز ڈوب گیا۔ ایک کشتی میں جان بچاکر ہم یہاں پہنچے ہیں۔ ہم بالکل بے ضرر لوگ ہیں، ہمارے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے۔“ نوجوان نے آدھی انگریزی آدھی مقامی زبان میں بہ مشکل یہ جملے ادا کیے۔

”جزیرۂ توری مقدّس افابلا کی قلمرو میں شامل ہے اور افابلا جارا کاکا کی مقدّس روح کی نمائندہ ہے اور جزیرے کا سردار جابر بن یوسف ہے۔ جزیرۂ توری کی روایت کے مطابق یہاں اجنبی منحوس مردود سمجھے جاتے ہیں۔ تمھارے سر جارا کاکا کی کھوپڑی کی نذر کر دیے جائیں گے اور تمھاری عورتیں ہمارے سردار کی خدمت کریں گی۔“ میں نے زارمے سے کہا۔ اس نے میرا حکم دہرا دیا۔ اسی لمحے سرتیا نے میرا بازو کھینچ کر مجھے مشتعل نظروں سے گھور کر دیکھا۔

OBJETS PERDUS

نوجوان نے انگریزی میں زارمے کا مطلب، جس حد تک وہ سمجھ پایا تھا، دوسروں کو سمجھایا۔ ان کے چہرے خوف سے زرد پڑ گئے۔ "ہم یہاں آنا نہیں چاہتے تھے۔ ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ یقیناً کوئی جہاز ادھر سے گزرے گا۔ ہماری کشتی خود بخود ادھر لگ گئی تھی۔" نوجوان نے فریاد کے انداز میں کہا اور آہ و زاری کرنے لگا۔ دوسرے قیدی بھی رقت میں اس کے شریک ہو گئے۔ زارمے نے ہاتھ اُٹھا کر انھیں خاموش کیا۔

"ان کا سامان چھین لو اور ان کے کپڑے اُتار دو۔" میں نے حکم دیا۔

زارمے نے سب سے پہلے امریکی لڑکی کے سینہ پوش پر ہاتھ ڈال دیا اور اسے کھینچ کر توڑ دیا۔ امریکی لڑکی زمین پر گردن جھکا کر بیٹھ گئی اور بین کرنے لگی۔ زارمے سینہ پوش کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے سرتیا کی طرف پھینک دیا۔ اُس نے غصے سے سینہ پوش امریکی لڑکی کو واپس کر دیا۔

"سیدی جابر! کیا تم اتنی دُور جا چکے ہو؟" وہ مقامی زبان میں بولی۔

زارمے نے اب ایک مرد کی قمیص پھاڑ دی اور اس کی پتلون کے تمام بٹن توڑ دیے۔

"نہیں نہیں۔" سرتیا چیخنے لگی۔ "ٹھہرو زارمے! ٹھہرو۔" زارمے میری وجہ سے سرتیا کا احترام کرتا تھا اس لیے ٹھہر گیا۔

"یہ سردار بڑا ظالم اور وحشی ہے۔ اس سے ہمدردی کی اُمید کرنا بے کار ہے۔" امریکی لڑکی روتی ہوئی میرے پاس آئی اور میرے ہاتھ پکڑ کر کھینچنے لگی۔ "رحم اے معزز درندے رحم!"

میں نے اُسے دھکا دے دیا، وہ لڑھکتی ہوئی زمین پر دُور تک چلی گئی، اس کے منہ سے خون بہنے لگا۔ سرتیا نے پھر زور سے میرا ہاتھ دبایا۔ میرے اس وحشیانہ اقدام سے تمام اجنبی قیدی فریاد کرنے لگے۔ سرتیا بھی ان میں شامل تھی۔

میں ایک مجسمے کے مانند بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ "تم نے اگر کوئی فیصلہ کر لیا ہے تو اتنے شقی القلب نہ بنو۔" سرتیا نے نفرت سے کہا۔

"یہ لڑکی بڑی نیک اور رحم دل ہے۔ شاید وہ ہماری سفارش کر رہی ہے۔ خوف زدہ عورت نے کہا۔" اور یہ شیطان اس سے متاثر بھی معلوم ہوتا ہے ہمیں لڑکی کے توسط سے دوبارہ رحم کی درخواست کرنی چاہیے۔ تھوڑی دیر میں آہ و زاری اور فریاد و فغاں کا ناقابلِ اختتام سلسلہ شروع ہو گیا۔ امریکی لڑکی کا بدن جاذب نظر تھا۔ میں نے اسے قریب آنے کا اشارہ کیا اور اس کی کلائی میں بندھی ہوئی گھڑی اتار لی۔

"لے لو۔ لے لو۔ یہ تمہاری ہے۔" وہ مسرت سے چلائی "مگر ہماری جان بخش دو۔" اس کے ساتھ ہی سات آٹھ مردانہ اور نسوانی گھڑیاں میرے

قدموں میں ڈال دی گئیں جو سمندر کی طوفانی لہروں سے محفوظ رہ گئی تھیں۔ میں نے ایک مدت بعد گھڑی دیکھی تھی۔ زارمے اور فزارو یہ عجوبہ دیکھ کر کِھل کِھلانے لگے اور ان کی توجہ تھوڑی دیر کے لیے اجنبیوں کی طرف سے ہٹ گئی۔

"معزز سردار یہ کیا ہے؟" زارمے نے اشتیاق سے کہا۔

"یہ تماشا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "وقت کا تماشا۔"

"وقت؟" زارمے حیرت سے بولا۔ "کیا یہ کوئی سحر کار شے ہے؟ یہ بہت خوبصورت ہے۔"

"ہاں زارمے۔ یہ مہذب دنیا کا سحر ہے۔" میں نے افسردگی سے کہا۔ "یہ جزیرۂ توری اور یہاں کے مکینوں اور یہاں کی عظیم الشان ملکہ سے زیادہ خوب صورت نہیں ہے۔" میں نے گھڑی کی ساخت پر نظریں جما دیں۔ "یہ ایک احساس ہے۔ صبح و شام کا احساس۔" زارمے نے اثبات میں گردن ہلائی۔ نوجوان بھی کچھ کچھ سمجھ رہا تھا، وہ اپنے ساتھیوں سے بولا۔ "بلاشبہ یہ شخص ان میں سب سے مختلف ہے۔ اس میں سنجیدگی، متانت اور فکر کی جھلک نظر آتی ہے۔ ساتھیو! یہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ ہمیں صرف اس کے سامنے گڑگڑانا اور زندگی کی درخواست کرنا چاہیے۔"

"یہ بہت ظالم اور کمینہ شخص ہے۔ دیکھو اس کے چہرے پر کتنا بڑا زخم ہے۔ مگر اسے کوئی پروا نہیں۔" ایرانی لڑکی نے کہا۔ میں نے سوچا وہ یہ باتیں کس جوانِ رعنا، کس طاقت ور شخص کے سامنے کہہ رہی ہے؟ کیا میں اتنا بدہیئت ہو گیا ہوں؟ کیا میری جلد اتنی کھردری اور خد و خال اتنے سخت ہو گئے ہیں؟ مگر یہ سب تو اُس رنگ کا کرشمہ ہے جو میرے جسم اور چہرے پر لپا ہوا ہے۔

"ان سے کہہ دو۔ تمہاری عورتیں ہمارے جسم کی راحت کے لیے ہیں اور تمہارے مرد دیوتاؤں کی خوشنودی کے لیے قربان کر دیے جائیں گے۔ ان مردوں کا فیصلہ جزیرۂ توری میں برپا ہونے والے ایک بڑے جشن میں کیا جائے گا اور انھیں بتا دو کہ اجنبیوں کے لیے یہ زمین تنگ ہے کیونکہ وہ نحوست اور بربادی کی علامت ہیں۔ ان سے کہو کہ تاریک برِاعظم میں طاقت اور علم کو عظمت حاصل ہے چنانچہ فرار کی کوشش محض بے سود ہو گی۔" زارمے نے میرے احکام حرف بحرف دُہرا دیے۔

پھر میں وہاں سے چلنے لگا۔ انھوں نے میری ٹانگیں پکڑ لیں اور رونے لرزنے لگے۔ میرے خصوصی محافظوں نے انھیں درندگی اور سفاکی کے ساتھ میرے جسم سے علیحدہ کیا اور روتی، بین کرتی ہوئی عورتوں کو دھکے دے دے کے آگے بڑھانے لگے۔ میں نے اپنے مکان کے قریب ایک علیحدہ جھونپڑی میں عورتوں کے قیام کے انتظام کا حکم دیا اور ان کی

آرائش اور حفاظت کے لیے توری کی خادمائیں تعینات کر دی گئیں۔ سرتیا میرے رویّے سے اتنی سخت ناراض تھی کہ مکان آ کر اس نے مجھ سے بات تک نہیں کی۔

میرے ہاتھ میں کئی گھڑیاں تھیں، صبح کے گیارہ بجے تھے۔ کیسا عجیب احساس تھا، میرے سامنے وقت گردش کر رہا تھا۔ گھڑیوں نے مجھے اپنی دُنیا کے بہت سے مناظر یاد دلا دیے، وہ بڑی گھڑیاں جو بلوں اور جدید ترین شہروں کے چوکوں میں نصب تھیں۔ وہ سڑکیں، موٹریں، بھیڑ۔ دکانیں، ریستوراں، کلب، بھاگتی ہوئی زندگی، مسکراتی ہوئی زندگی۔ گھڑی کی سوئی چل رہی تھی۔ ٹک ٹک ٹک اور میرے دل پر ہتھوڑے لگ رہے تھے۔ کبھی کبھی آدمی اپنے متعلق بھی اذیت ناک فیصلے کر لیتا ہے۔ آدمی اذیت پسند بھی تو ہوتا ہے! اجنبی لوگوں کے بارے میں اگر میں کوئی شدید رویّہ اختیار نہ کرتا تو تاریک برِاعظم کے نادیدہ دیوتا یہ فیصلہ کر دیتے۔ جارا کاکا کی مقدس روح کر دیتی اور حبشیوں کے تیز نیزے کر دیتے۔ میں نے کیا کیا تھا۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ تاریک برِاعظم کیا ہے؟ میں نے اس کا مزہ چکھا تھا اور میں ہی جانتا تھا کہ اس سرزمین کی کتنی آنکھیں ہیں؟ کیسے دانت ہیں؟ کیا مجھے ان کی جاں بخشی کر کے خود بھی اُن کے ساتھ موت کا جام پی لینا چاہیے تھا؟ ایسی صورت میں یہ چار پانچ آدمی بھی ختم ہو جاتے جن کی زندگی مجھ سے وابستہ تھی اور تاریک برِاعظم کے شب و روز میں کوئی فرق واقع نہ ہوتا۔ میں سرد ہو جاتا تو کسی تبدیلی، کسی سرگرمی کے سارے سوراخ بند ہو جاتے۔ میں کوئی دلیل نہیں دے رہا ہوں۔ میں کوئی جواز تلاش نہیں کر رہا ہوں۔ میں نے اس موضوع پر بہت سوچا تھا اور میں وہ تلخ حقائق بیان کر رہا ہوں جن سے مجھے محسوس کرنے والے بھی کبھی دوچار ہو سکتے ہیں۔

اس دن بارہ بجے۔ آہ، وقت پہ میری نگاہ تھی۔ وقت میرے ہاتھ میں تھا۔ بارہ بجے میں نے اعلان کیا کہ "دو روز بعد جزیرۂ توری میں جارا کاکا کی مشترکہ عبادت کے جشن میں اجنبی لوگوں کی قسمت کا فیصلہ کیا جائے گا۔"

وقت گزر رہا تھا۔ میرے سامنے گزر رہا تھا۔ ٹک ٹک ٹک۔ یکساں رفتار سے۔ میں نے دیکھا سوئی نے ایک "چکر" کاٹ لیا ہے، پھر دوسرا چکر، تیسرا چکر۔ میں نے مشروبِ حیات نوش نہیں کیا تھا جو میں وقت کا یہ اشتباہ پاؤں سے کچل دیتا۔ میں نے نظرِ ثانی کی اور سمورال کی اقامت گاہ کی طرف روانہ ہوا، میں اس کی خدمت میں یہ گھڑی پیش کرنا چاہتا تھا۔ جب میں اس کی عبادت گاہ میں داخل ہوا تو وہ میری جانب لپکا۔ میں نے اسے اپنی

دودھ فروش

نے اپنے پہلے گاہک کا دروازہ کھٹکھٹا کے آواز بلند کی۔ "دودھ۔"

صاحبِ خانہ برتن لے کر باہر نکلا، دُودھ فروش نے اَدھ سیری سے دُودھ نکالا تو اس میں پانی ہی پانی تھا۔ گاہک نے حیرت سے سوال کیا "یہ کیا؟ دُودھ کہاں ہے؟"

دُودھ والے نے شرمندگی سے جواب دیا "صاحب معاف کیجیے گا، میں ابھی دُودھ لے کر دوبارہ آتا ہُوں۔" پھر اپنے لڑکے کو گالیاں دیتا ہُوا بولا "کمبخت ہر کام لاپروائی سے انجام دیتا ہے، آج اس میں دُودھ ڈالنا ہی بھول گیا۔"

آواز میں محصور کرنے کے لیے اشارہ کیا، سمورال نے بھڑکتی ہوئی آگ پر سفوف جھونک دیا اور جب دھواں ہمارے چاروں طرف پھیل گیا تو میں نے اس کی خدمت میں مہذّب دُنیا کا تحفہ پیش کیا۔ وہ اُسے اُلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ میں نے اُسے وقت کا گورکھ دھندا سمجھایا، سمورال کے چہرے پر اضطراب طاری تھا۔ وہ کچھ اور باتیں کرنا چاہتا تھا، اس نے گھڑی ایک طرف رکھ دی۔ میں نے قصرِ اقابلا میں پیش آنے والے واقعے سے اُسے آگاہ کیا۔ وہ حیرت میں پڑ گیا اور اس نے میرے قریب آ کر میری آنکھیں اس طرح دیکھنی شروع کیں جیسے ان میں کوئی کنکر پڑ گیا ہو۔ پھر وہ میرے ماتھے پر ہاتھ پھیرنے لگا اور ایک طرف بیٹھ کر کچھ سوچنے لگا۔ "جابر بن یوسف!" وہ غنودگی کے عالم میں بولا۔ "تم جانتے ہو کہ میں تمہارا اتالیق ہوں اور تمھیں میری تربیت اور تعلیم کی اشد ضرورت ہے۔"

"میں اس حقیقت سے واقف ہوں اور اپنے محسن کا دل سے احترام کرتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"میری بات سنو۔ تمہارا اتالیق ہونے کی حیثیت سے میں تم سے وفاداری اور اطاعت شعاری کا عہد لینا چاہتا ہوں۔"

"میں کئی بار اس کا اظہار کر چکا ہوں کہ میں اس سرزمین میں تم سے کتنا قریب ہوں۔ میں نے کہا تھا کہ تم مجھے جمرال کی جگہ سمجھو۔ تمہاری بیٹی ترام کی شادی مجھ سے ہوئی تھی، سب سے پہلے تمھی نے مجھے اس جزیرے پر پناہ دی تھی۔ کیا میرے گزشتہ عہد کی تجدید کی پھر ضرورت پڑ گئی؟"

"میں جارا کاکا کی مقدس روح کو درمیان میں لانا چاہتا ہوں۔ کیا تم آمادہ ہو؟" اس نے زور دے کر کہا۔

"کیا کاہنِ اعظم کو مجھ پر کوئی شبہ ہے؟" میں نے ناراضی سے کہا۔

"اے مقدس کاہن اب مجھے حکم دے کر دیکھو۔"

"میں ایک رسمی عہد چاہتا ہوں۔" کاہن نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

"تم جس طرح چاہو، اپنا اطمینان کرلو لیکن کیا یہ کام اس وقت ضروری ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ تم شاید کچھ اور سنانا چاہتے ہو۔"

"ہاں۔ شاید کاہنِ اعظم کے علم میں ہو، یا شاید اس نے گزشتہ دن عبادت میں گزار دیا ہو۔ میں تمھیں بتاؤں۔" میں نے کل دریافت ہونے والے غار کی پوری رُوداد اُسے سنادی، وہ بیٹھا ہوا تھا۔ یکایک کھڑا ہوگیا۔ اور کوئی ردِ عمل ظاہر کیے بغیر اس نے کہا۔ "کیا تم وہ غار مجھے دکھا سکتے ہو؟"

"کیوں نہیں۔ میرا خیال ہے مقدس کاہن اسے دیکھ کر خوش ہوگا۔"

کاہنِ اعظم کا تجسس ناقابلِ فہم تھا۔ ہم دونوں اسی وقت گھنے جنگل کی طرف روانہ ہوگئے۔ ابھی دھوپ تھی۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ چار بج رہے تھے۔ رات ہونے میں صرف چند گھنٹے باقی تھے، میرے ذہن میں اس وقت اجنبی لڑکیاں تھیں۔ میں انھیں قریب بٹھا کر باتیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ ایرانی اور امریکی لڑکیاں میرے حواس پر چھائی ہوئی تھیں۔ بہت دنوں بعد ایک رات آئی تھی جس کا مجھے انتظار تھا۔ غار کی تلاش میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ کاہن کی متجسس نگاہیں دہانے پر لگی ہوئی تھیں۔ ہم دونوں نے مل کر دہانہ صاف کیا اور اندر داخل ہوگئے۔ میں نے مشعل سامنے کرلی۔ کاہنِ اعظم دیر تک غار کے ایک ایک کمرے اور نوادر کا جائزہ لیتا رہا اور پھر جب اُس نے بوڑھے شخص کی لاش دیکھی تو وہ جھک گیا۔ پھر کاہنِ اعظم کسی ایسے کمرے میں گھس گیا جو میں نے نہیں دیکھا تھا۔ ہم دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہورہی تھی۔ غار اچھی طرح دیکھ کر ہم پھر باہر آگئے اور میں نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر تردّد صاف نظر آرہا تھا۔

"تم نے اسے کیسے مارا؟" اس نے سوال کیا۔

میں نے پھر پورا واقعہ دُہرا دیا۔ وہ توجہ سے سنتا رہا۔ "کیا میں نے کوئی غلطی کی؟ مگر میں اُسے مارنا نہیں چاہتا تھا۔"

"یہ اس برگزیدہ شخص نے کیا کیا۔ وہ صحرائے زارشی جانے کے لیے تڑپتا رہا تھا؟ اُسے انتظار کرنا چاہیے تھا۔" وہ بڑبڑایا۔

"تم کیا کہہ رہے ہو؟" میرے سوال پر کاہنِ اعظم سنبھل گیا۔

"کچھ نہیں۔ جابر بن یوسف! ضروری نہیں کہ ہر سوال کا جواب دیا جائے۔" وہ جھُنجلا کر بولا۔

میں سمجھ گیا، وہ کھُلی فضا میں گفتگو سے گریز کررہا ہے۔ "کیا تم مجھے ان نوادر کی تربیت دو گے؟ کیا یہ چیزیں اب میری ملکیت ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے مختصراً کہا اور جنگل کے کنارے مجھ سے جُدا ہونے لگا۔ میں نے چلتے چلتے اس سے اجنبی لوگوں کے مستقبل کے بارے میں رائے پوچھی تو اس نے بھی وہی کہا جو آقا بلا نے کہا تھا۔ کاہنِ اعظم غار کے ملاحظے کے بعد کچھ حواس باختہ سا نظر آرہا تھا اور مجھے اس کی حواس باختگی پر لطف آرہا تھا۔

جنگل میں اُسے چھوڑ کر میں اپنے ہندی دوست سرنگا کے پاس گیا۔ سرنگا میری آمد کا منتظر تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اُس نے دہانے پر دیوی کا پہرا لگوادیا اور مجھ سے کہا۔ "تم چند خبریں لے کر آتے ہو مگر میں مختصر کلامی پسند کروں گا۔" میں ایک طویل گفتگو کے لیے اس کے پاس آیا تھا لیکن سرنگا نے مجھے بحث ومباحثہ سے منع کیا۔ میں نے مختصراً اسے قصر آقا بلا کی رُوداد سنائی اس نے بھی سرزنش کی اور مشورہ دیا کہ مجھے توری کی وہ جڑی بوٹیاں استعمال کرنی چاہئیں جن سے جذبات کی آتش فشانی سرد کی جاسکتی ہے۔ اس نے ایک سردار، ایک مقتدر شخص کے اوصاف پیدا کرنے پر زور دیا اور کہا کہ مجھے اپنا اعتماد بحال کرنے کے لیے غیر معمولی قربانیاں پیش کرنی چاہئیں۔ میں نے اس سے جزیرۂ توری میں آنے والے لوگوں کے بارے میں رائے طلب کی تو وہ افسردگی اور اضمحلال سے بولا۔ "جابر بن یوسف! تمھیں معلوم ہے میں نے ڈاکٹر جوّاد کی جاں بخشی کی منت کی تھی مگر تم نے جو سوچ رکھا ہے وہی ایک صحیح اور راست اقدام ہے۔" اُس نے ایک جھرجھری لی۔ "میں ضرور اس خونیں تماشے میں شریک ہوں گا۔"

پھر میں نے غار کی دریافت کا واقعہ اس کے گوش گزار کیا۔ سموراں کی طرح سرنگا نے بھی اس واقعے میں گہری دل چسپی لی اور اس نے مجھ سے اُسی وقت اُس غار میں جانے کی خواہش ظاہر کی۔ میں بہت تھکا ہوا تھا میں نے گھڑی دیکھی۔ رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ ایک گھڑی میں نے سرنگا کو دے دی۔ اس نے اسے ایک طرف ڈال دیا اور کہنے لگا۔ "بیدی جابر! تم پر ایک بہت بڑی ذمّے داری آپڑی ہے۔ متمدن دنیا کے لوگوں سے نمٹ کر تمھیں اس غار کی طرف توجہ دینی ہے۔ تمھیں شاید اس کا اندازہ نہیں ہے کہ تم نے کتنی بڑی مہم سرانجام دی ہے۔ آہ اگر وہ بوڑھا ریچھ اتنی کڑی ریاضت کے بعد ایک غلطی نہ کر بیٹھتا تو مجھے تمھاری صورت

دوبارہ دیکھنی نصیب نہ ہوتی۔ کون جانے پھر کیا ہوتا۔“

”اس نے کیا غلطی کی ہے؟“ میں نے تشویش سے پوچھا۔

”وہ تمہارے نوادر، خصوصاً شیالی دیکھ کر اپنا منصب بھول گیا ہوگا۔ اس نے حرص کی، اور اپنے آپ کو کھو دیا۔“

سرنگا نے اپنی دیوی کو اشارہ کیا، غار کا دہانہ خالی ہوگیا۔ سرنگا حسبِ معمول اقابلا کی تعریف و توصیف میں مصروف ہوگیا۔ میں بھی اقابلا کے حسن و جمال اور اس کی نوازشوں کا ذکر کرتا ہوا وہاں سے رخصت ہوا۔ توری کی آبادی میں داخل ہوتے ہی مجھے فزارو اور زارمے نے گھیر لیا۔ رات شروع ہوچکی تھی۔ رات کا ہنگامہ گرم ہوگیا تھا۔ میں نے اپنے مکان جانے کے بجائے اس جھونپڑی کا رُخ کیا جہاں میرے حکم کے مطابق جزیرۂ توری پر آنے والی لڑکیاں قید کی گئی تھیں۔ پہرے دار نے مجھے راستہ دیا اور میں اس کے ہاتھ سے مشعل لے کر اندر داخل ہوگیا۔ یہ جھونپڑی عام جھونپڑیوں سے بڑی تھی، اس میں پہلے ہی سے مشعلیں روشن تھیں۔ اندر میں نے ایک ہوش رُبا نظارہ دیکھا۔ توری کی عورتیں ایک طرف ہٹ گئیں۔ مجھے دیکھتے ہی مہذب دُنیا کی عریاں بدن عورتوں نے اپنے ہاتھوں سے ستر پوشی کی کوشش کی۔ ”وہ جنگلی پھر آگیا۔“ ایرانی لڑکی سہم کر بولی

”ہمیں اس کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔“ تیس سالہ عورت نے کہا۔

”میں اس کے منہ پر تھوکتی ہوں۔“ امریکی لڑکی تیزی سے بولی۔

”اب نہ جانے وہ ہمارے ساتھ کیا برتاؤ کرے؟“

”وہی جو درندے اپنے شکار کے ساتھ کرتے ہیں۔“

”اس کی ہوس ناک نظریں بڑی بے رحم ہیں، اے خدا مجھے موت دے دے۔“

ایرانی لڑکی کی طرف اشارہ کرکے اس سے میں نے مقامی زبان میں نرمی سے پوچھا ”تمہارا نام کیا ہے؟“ میں نے جان بوجھ کر ایسا لہجہ اختیار کیا کہ وہ نام پوچھنے کا مطلب سمجھ لے۔ اس نے کچھ سمجھنے نہ سمجھنے کے انداز میں اپنی ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ میں نے سوال دہرایا۔ امریکی لڑکی نے کہا ”شاید وہ نام پوچھ رہا ہے“ اس وحشی کی سمجھ میں تمہارا نام آجائے گا؟“ اس نے طنز کیا۔ ”بتا دو میری مظلوم لڑکی۔ بتا دو۔ ممکن ہے وہ یہی پوچھ رہا ہو۔“

”فردزیں۔“ ایرانی لڑکی نے سہم کر کہا۔

میں نے باری باری سب کی طرف اشارہ کیا۔

عورت نے اپنا نام جولیا اور اس کے برابر بیٹھی ہوئی جرمن رعنا (لڑکی) نے اپنا نام مارشا بتایا۔

میں نے امریکی کی طرف ہاتھ اُٹھایا۔ ”جینا۔“ وہ برہمی سے بولی۔

فردزیں، جولیا، مارشا، جینا، میں نے دانستہ تلفظ بگاڑ دیا۔

”اس نے نام کتنی جلدی یاد کرلیے۔“ جولیا نے کہا۔

میں نے توری کی لڑکیوں سے کہا کہ وہ ان کے لیے اعلا غذاؤں کا اہتمام کرے۔ انھوں نے شکایت کی کہ ان لڑکیوں نے کپڑے اتارنے اور اپنے جسم کی مالش کرنے سے انکار کردیا تھا۔ میرے حکم پر فوراً عمل کیا گیا۔ ان کے سامنے بُھنا ہوا گوشت پیش کردیا گیا۔ انھوں نے میری طرف تشکر اور حیرت کی نگاہوں سے دیکھا۔ پہلی مرتبہ ممنونیت کے آنسو ان کے چہروں پر رقص کرنے لگے۔ میں ان کے حسن کا تذکرہ کسی اور وقت کے لیے اُٹھا رکھتا ہوں، صُبح کی اُن لڑکیوں اور اس وقت کی لڑکیوں میں نمایاں فرق ہوگیا تھا۔ ان کے بدن چمک رہے تھے۔ ان کی جلد صاف تھی اور خدوخال بےحد دلکش اور تیکھے تھے۔ میں فردزیں کو ساتھ لے جانا چاہتا تھا لیکن پھر میں نے یہ خیال ترک کردیا۔ ان کی سہمی ہوئی نگاہوں نے میرے اندر کے سوتے ہوئے آدمی کو متاثر کردیا تھا۔ میں اُس وقت وہاں سے چلا آیا اور میں نے اپنے قبیلے کے لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر رقص و سرود میں آدھی رات گزار دی۔ میں سرتیا کے سونے کا انتظار کررہا تھا۔

علی الصباح جب سرتیا سو رہی تھی، میں اپنے مکان سے جنگل کی صبح کا نظارہ کرنے کے لیے چل پڑا۔ اصل میں میرا مقصد یہ تھا کہ سرتیا میرے سامنے اُس وقت تک نہ آئے جب تک اجنبیوں کے سلسلے میں ہونے والا جشن ختم نہ ہوجائے —— توری قبیلہ سویا پڑا تھا —— میں آگے نکل گیا لیکن اس صبح مجھے جنگل کے پرندوں، درندوں کے ساتھ وقت گزاری کا دلچسپ مشغلہ ادھورا چھوڑنا پڑا، اس لیے کہ زارمے اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ مجھے تلاش کرتا ہوا وہاں پہنچ گیا اور اس نے یہ دلچسپ خبر سنائی کہ تھوڑی دیر پہلے، گویا صبح کاذب کے وقت اجنبیوں نے اپنے پہرے داروں پر حملہ کردیا اور دو کو موقع پر ختم کرکے جنگل میں گم ہوگئے۔ ان میں پانچ آدمی دوبارہ گرفتار کرلیے گئے ہیں، باقی دو گھنٹے جنگل میں کہیں روپوش ہوگئے ہیں۔ زارمے اپنے سردار کے سامنے بہت خفیف تھا۔ یہ خبر سُن کر میرا قہقہہ نکل گیا ”فرار“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”فرار —— تاریک برِاعظم کی سرزمین سے؟“

”ہاں معزز سردار، لیکن ہم انھیں جلد پکڑلیں گے۔“

”نہیں وہ خود تمہارے پاس آجائیں گے اور اگر وہ کل تک نہ آئے تو ایک اور جشن برپا ہوگا۔ زارمے! تم اطمینان سے اپنے قبیلے میں جاؤ اور کل منعقد ہونے والے جشن کی تیاری کرو۔ یہ جشن قربانی اتنے تزک و احتشام سے منایا جائے کہ جاراکاکا کی مقدس رُوح نہال ہوجائے۔“

زارمے کے ساتھ میں بھی آبادی میں واپس آگیا اور زارمے

کی زمین کی طرف چل پڑا جو کبھی شوالا کے زیرِ نگیں تھی۔ میں دن بھر وہاں رہا اور دن بھر زارمے کی عورتیں اور جوانانِ رعنا میری خدمت میں مستعد رہے۔ میں نے سمورال کو کل کے جشن میں شریک ہونے کے لیے ایک پیغام بھیجا۔ رات کو میں فزارو کی زمین پر چلا آیا جہاں میرا مکان تھا — اجنبی اسیر ابھی تک مفرور تھے —— میری حالت عجیب تھی۔ میں خود فرار ہو رہا تھا —— اِدھر اُدھر، خالی خالی —— میں اپنے اندر مفرور تھا —— مجھے کل کا انتظار تھا۔

اور کل آگئی، توری کے وسیع میدان میں ہنگامہ برپا تھا۔ دونوں قبیلے کی عورتیں اور مرد یک جا تھے اور اُن اسیروں کو دیکھ دیکھ کر شور مچا رہے تھے جو میدان کے درمیان درختوں کے تنوں سے بندھے بےبس کھڑے تھے۔ میری نشست کے لیے ایک اُونچے پتھر کا اہتمام کیا گیا تھا۔ توری کے دوسرے معززین نے آج اپنے جسم نئے انداز سے رنگے تھے۔ قربانی کی رسموں میں حصہ لینے والے جوانوں کی ٹولی بڑی چاق و چوبند نظر آرہی تھی۔ ان کے سیاہ جسم دُھوپ میں چمک رہے تھے۔ انھوں نے اپنے نیزے بلند کر رکھے تھے اور دائرے کی صورت میں ناچ رہے تھے۔ میں مقررہ وقت پر اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ سرنگا وہاں پہلے سے موجود تھا۔ پھر کاہنِ اعظم سمورال کی آمد کا غلغلہ ہوا اور ہجوم مؤدب کھڑا ہوگیا۔ سمورال نے بھی ایک اُونچی نشست پر جگہ سنبھال لی۔ فزارو اور زارمے میرے دائیں بائیں کھڑے تھے۔ سمورال کے بیٹھتے ہی نقاروں کا زور بڑھ گیا۔ ننگ دھڑنگ وحشی دیوتاؤں کی خوشنودی کے لیے گا رہے تھے اور اپنی زمینوں کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ وہ میری بلند اقبالی اور سرفرازی کے لیے بار بار میرا نام لیتے تھے اور مجھے توری کے قوانین کی پیروی کے لیے تلقین کررہے تھے۔

اور میرے سامنے وہ اسیر تھے جن کا جرم یہ تھا کہ وہ موت سے جدوجہد کرتے ہوئے سمندر کی آدم خور لہریں پھاڑ کر ادھر توری کی پُراسرار زمین پر زندگی کی تلاش میں آنکلے تھے۔ یہ محض اتفاق تھا کہ میں توری کا سردار تھا۔ میں ایک سردار تھا چنانچہ مجھے توری کی روایتوں کے مطابق ان کا خون دیوتاؤں کی خدمت میں پیش کرنا تھا —— ہماری بات دوسری تھی۔ جب ہم یہاں آئے تھے تو ہمارے بیشتر رفقا مارے گئے تھے۔ مردوں میں صرف ڈاکٹر جواد، میں اور سرنگا بچے تھے۔ سرنگا اپنے علم و فضل اور دیوی کی مدد سے، میں اپنی شجاعت و ذہانت کے بل پر اور ڈاکٹر جواد نے طبیب ہونے کے باعث امان پائی تھی۔ اتنی مدت گزرنے کے بعد امان اب بھی نہیں تھی۔ میں نے صدقِ دل سے اس سرزمین سحر دام پراسرار

سے مفاہمت کرلی تھی کیونکہ میں نے اُسے دیکھ لیا تھا جس کی نظیر مہذب دُنیا پیش نہیں کرسکتی۔

وحشیوں کے درمیان، درختوں کے تنے سے بھیڑوں بکریوں کی طرح بندھے ہوئے یہ لوگ اپنے آخری سفر پر روانہ ہوتے وقت بڑے دل گیر اور اداس نظر آتے تھے۔ ان کی جلدیں چند دنوں کے اندر ہی اپنی چمک کھو چکی تھیں۔ سرنگا کی نظریں اُنھی پر جمی ہوئی تھیں۔ ہاں سمورال اطمینان سے بیٹھا ہوا تھا، وہ کبھی کبھی میری طرف دیکھ لیتا تھا۔ سرتیا میری نشست سے کچھ فاصلے پر موجود تھی۔ میں نے دانستہ اس کی طرف نظر نہیں اُٹھائی۔

سب سے پہلے میرے حکم پر قیدی لباس سے آزاد کیے گئے۔ مردوں نے کسی چون و چرا کے بغیر اپنے جسم برہنہ کرلیے۔ مخصوص دستے کے افراد نے انھیں اپنے نیزوں کے حلقے میں لے رکھا تھا۔ میں نے کھڑے ہوکر بلند آواز میں انھیں ان کے جرائم سے آگاہ کیا، پھر انھیں اپنے منتخب آدمیوں سے مقابلے کی دعوت دی لیکن وہ بُری طرح خائف تھے۔ ان کے چہرے زرد تھے۔ وہ مقابلے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ہاں ان میں کوئی جابر بن یوسف ہوتا تو ایسی موت ہرگز نہ مرتا —— وہ بار بار رحم کے لیے ہاتھ اٹھاتے تھے لیکن ان میں سے ایک نوجوان ایسا بھی تھا جس نے اب تک بزدلی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ یہ وہی نوجوان تھا جو مقامی زبان میں کسی قدر رشد بد رکھتا تھا۔ اس کے قوا مضبوط تھے، وجاہت اور صحت کے اعتبار سے بھی وہ دوسرے اسیروں سے برتر تھا۔ میں نے سمورال کی طرف دیکھا اور اچانک کھڑے ہوکر فزارو کو حکم دیا کہ مردوں کے جسموں میں نیزوں سے سوراخ کرکے ان کا خون اکٹھا کیا جائے، پھر جاراکاکا کی مقدس کھوپڑیوں کو ان کے خون سے غسل دینے کی مقدس رسم ادا کی جائے۔

میرے حکم کی دیر تھی۔

تاریک برِّاعظم کی اس فسوں خیز، حیرت انگیز اور دلچسپ سرگزشت کے باقی واقعات آیندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیے۔

اس بار خاص کہانی کے ان صفحات میں مغرب کی ایک خوب صورت کہانی شائع کی جا رہی ہے، خوش ذوق قارئین اس تحریر کی لطافت اور نکتہ آفرینی سے یقیناً محظوظ ہوں گے!
یہ صفحات موضوع اور انشا کے اعتبار سے منفرد کہانیوں کے لیے مخصوص ہیں!

ڈگلس ریلی ■ یوسف جمال

اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر نے تقریباً چھ بجے بکنگ آفس میں جھانک کر دیکھا۔ اس کی جھلک دیکھ کر اس آخری وقت میں بھی مسٹر ہوگ کے دل میں یہی خیال آیا کہ کیوں نہ وہ اپنا منصوبہ ترک کر دیں؟ انھوں نے اپنے منصوبے پر گزشتہ بیس برسوں میں مسلسل غور کیا تھا۔ بیس برس! یہ بہت بڑا عرصہ ہوتا ہے مگر پانچ لاکھ گلڈر بھی کوئی معمولی رقم نہیں ہوتی۔

"مسٹر ہوگ! حیرت ہے آپ اپنی ملازمت کے آخری لمحوں میں بھی اتنے مصروف ہیں؟ آج کل لوگ وقت کے اتنے کہاں پابند ہوتے ہیں مگر آپ نے فرض شناسی اور مستعدی کی مثال قائم کی ہے۔"

اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر نے اپنے روایتی بخل کے برخلاف جیب سے سگار کیس نکالا اور مسٹر ہوگ کی طرف بڑھا دیا۔ مسٹر ہوگ نے شکریے کے ساتھ ایک سگار قبول کر لیا۔ اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر کی اس غیر متوقع حرکت پر انھیں آج کے دن کی غیر معمولی اہمیت کا کچھ اور زیادہ احساس ہوا۔ ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر نے بھی شاید ان کی دلی کیفیت محسوس کر لی تھی۔ اس نے کہا۔ "مسٹر ہوگ! ایک عرصے بعد آپ ہم سے جدا ہو رہے ہیں۔ یہ لمحات بڑے صبر آزما ہیں اور آپ کو ابھی بہت سے کام بھی نمٹانے ہیں۔ میں یہاں سے گزر رہا تھا، سوچا آپ سے الوداعی ملاقات کر لوں۔ میری تمام نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بلاتکلف بتایئے۔"

مسٹر ہوگ کو یہ خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں یہ شخص کوئی لمبی چوڑی تقریر کرنے نہ کھڑا ہو جائے لیکن اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر نے ان کی توقع کے خلاف معذرت چاہنے کے انداز میں کہا۔ "آپ کافی مصروف ہیں ورنہ میں آپ کو کسی قریبی بار میں چل کر کچھ پینے کی دعوت دیتا۔"

"آپ کی محبت اور پرسش کا شکریہ مسٹر سائمن! ان تکلفات کی کیا ضرورت ہے؟"

مسٹر ہوگ دل کی گہرائی سے یہی چاہتے تھے کہ وہ کسی طرح ٹل جائے کیونکہ آیندہ نصف گھنٹے کے دوران میں انھیں بہت کچھ کرنا تھا اور وہ کسی صورت میں یہ قیمتی وقت رسمی اور فضول باتوں میں ضائع کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔

"میرا خیال ہے، دفتر کے بعض ارکان نے طے کیا ہے کہ وہ آپ کے اعزاز میں کوئی دلچسپ پارٹی دیں۔ کیا خیال ہے آپ کا؟ چالیس برس کی ملازمت کچھ کم نہیں ہوتی۔"

"مسٹر سائمن! میں نے اپنے طور پر ہمیشہ یہی کوشش کی کہ اپنے فرائض بحسن و خوبی انجام دیتا رہوں۔ بہر حال وقت گزر گیا۔ یہاں سے کبھی نہ کبھی تو رخصت ہونا ہی تھا۔ آدمی زندگی سے رخصت ہو جاتا ہے۔"

مسٹر ہوگ کے کان میں بھی یہ بھنک پڑ چکی تھی کہ ان کے چند ساتھی انھیں الوداعی پارٹی پر مدعو کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں لیکن انھوں نے اپنے ساتھیوں سے معذرت چاہ لی تھی۔ "میں صرف ریٹائر ہی تو ہو رہا ہوں... ..... ان تقریبات اور رسوم سے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں مرنے والا ہوں۔ میں وقتاً فوقتاً آپ لوگوں سے ملاقات کے لیے تو آتا ہی رہوں گا۔ دفتر میں آنا تو میری عادت میں شامل ہو گیا ہے، نہ جانے آپ کے بغیر زندگی کیسی محسوس ہو؟"

مسٹر ہوگ مسٹر سائمن پر یہ تاثر چھوڑنا چاہتے تھے، گویا ملازمت سے سبک دوش ہو جانے کے بعد بھی وہ دفتر میں آمد و رفت کی وضع داری نبھاتے رہیں گے۔

"ہاں ہاں، کیوں نہیں۔" مسٹر سائمن نے خوش اخلاقی سے کہا۔ "اچھا محترم دوست! اپنا خیال رکھیے گا، کوئی خوبصورت اور کارآمد مشغلہ اختیار کر لیجیے گا، پھر آپ کو ریٹائرمنٹ کا احساس نہیں ہو گا۔"

"آپ کے مشورے کا بہت بہت شکریہ، ویسے میرا ارادہ ہے کہ پہلے کہیں جا کر تعطیلات گزاروں، کچھ آرام کروں، اس کے بعد کسی مشغلے کے بارے میں سوچوں گا۔ زندگی تو گزارنی ہی پڑے گی۔"

"بہت خوب، یہ بہت عمدہ خیال ہے۔" اس نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی اور پھر چہرے پر حیرت کے تاثرات پیدا کرتے ہوئے کہنے لگا۔ "ارے، سوا چھ بج گئے؟...... اچھا مسٹر ہوگ! مجھے ذرا ایک جگہ پہنچنا ہے۔ آپ کو جب بھی موقع ملے، ملاقات کے لیے ضرور آیا کیجیے گا۔ اچھا خدا حافظ!"

اس وقت بکنگ آفس میں دو کلرک اور موجود تھے۔ وہ بکنگ آفس کے دوسرے حصے میں بیٹھے ہوئے دن بھر کی آمدنی کا حساب کر رہے تھے۔ مسٹر ہوگ اور ان کلرکوں کے درمیان اسٹیل کی اونچی اونچی الماریوں کی دیوار تھی۔ ان الماریوں میں مختلف مقامات کے لیے ٹکٹ، مختلف رجسٹر اور فائلیں رکھی ہوئی تھیں۔ مسٹر ہوگ نے دیوار کی گھڑی پر نظر ڈالی۔ تقریباً تین چار منٹ بعد ان کے ساتھی اپنے سامنے کی چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں بند کر دیں گے۔ پھر وہ تمام رقم اور ٹکٹوں کے کاؤنٹر فائل لا کر مسٹر ہوگ کی کرسی کے پیچھے کی تجوری میں رکھ دیں گے۔ صبح کی شفٹ کی تمام آمدنی اسی تجوری میں رکھی جاتی تھی۔ یہ بہت اہم اسٹیشن تھا۔

غیر ممالک جانے والے مسافروں کی بہت بڑی تعداد یہیں سے روانہ ہوتی تھی۔ اس لیے رقم عام طور پر پانچ لاکھ گلڈرز کے لگ بھگ ہوتی تھی۔

مسٹر ہوگ نے سوچا کہ اگر آج جمعے کے بجائے ہفتہ ہوتا تو تعطیلات منانے والے مسافروں کی تعداد بھی نسبتاً زیادہ ہوتی اور رقم بھی

بڑھ جاتی لیکن وہ ناشکرے نہیں تھے۔ صرف پانچ لاکھ گلڈر پر اکتفا کرنے کے لیے تیار تھے۔ پانچ لاکھ گلڈر ان کی زندگی سنوارنے کے لیے کافی تھے۔

وہ مسٹر سائمن کے سگار کا آخری کش لے رہے تھے۔ انھیں ڈر تھا کہ کہیں کلرکوں کو نوٹوں اور ریزگاری کا تھیلا لاتے دیکھ کر ان کی طرف کوئی حریص نظر نہ اُٹھ جائے اور وہ لوگ کسی قسم کے شک میں مبتلا نہ ہو جائیں ؛ وہ زیادہ محتاط اور سنجیدہ ہو گئے۔

"آپ کیا کیفیت محسوس کر رہے ہیں مسٹر ہوگ ؟" ان کے ساتھی کلرک مسٹر شین نے ان کی طرف آتے ہوئے کہا۔ "اب تو آپ خود کو ایک آزاد پنچھی کی طرح تصور کر رہے ہوں گے۔ میں بھی اسی مبارک وقت کے انتظار میں ہوں۔ میں آزاد ہوتے ہی کسی ساحل پر تولیا بچھا کر لیٹ جاؤں گا اور پھر جب میری نظروں کے سامنے بے شمار حسینائیں غسل کے لباس میں اِدھر سے اُدھر گھوم رہی ہوں گی تو زندگی بھر کی تکان ایک دم دُور ہو جائے گی۔" مسٹر شین نے نقدی سے بھرے ہوئے تھیلے فرش پر رکھتے ہوئے مسٹر ہوگ سے تجوری کی چابیاں طلب کیں۔

دوسرا کلرک بھی وہیں پہنچ گیا۔ وہ ان دونوں کی نسبت جوان تھا۔ اس نے کہا "مسٹر ہوگ! میں اس وقت مسٹر شین کی طرح خوش گوار اور پُرکیف جذبات کا اظہار نہیں کروں گا کیونکہ ابھی مجھے اس قید خانے میں پورے پندرہ برس اور گزارنے ہیں۔ مجھے جس دن یہاں سے آزادی نصیب ہوگی، میں ساحل پر پڑے رہنے کے بجائے خود کو ایک فعّال اور کارآمد شخص ثابت کرنے کی کوشش کروں گا۔" نوجوان ٹام کے ہونٹوں پر ایک شریر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

تھیلے تجوری میں رکھے جانے لگے۔ مسٹر ہوگ انھیں دزدیدہ نظروں سے دیکھتے رہے۔ "میں نے ابھی کچھ دیر پہلے مسٹر سائمن کو بتایا تھا کہ میں سب سے پہلے کہیں تعطیلات گزارنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اس کے بعد...... اس کے بعد پتہ نہیں میں کیا کروں گا؛ شاید ڈاک کے ٹکٹ جمع کرنے لگوں تاکہ کسی نہ کسی بہانے ٹکٹوں سے رشتہ قائم رہے۔"

پیسے رکھنے کے بعد مسٹر شین نے تجوری بند کر دی۔

مسٹر ہوگ اُٹھے تاکہ تجوری کا ڈائل خفیہ نمبروں پر سیٹ کر سکیں۔ انھیں سینیئر بکنگ کلرک کی حیثیت سے یہ کام کرتے ہوئے پورے بیس برس ہو چکے تھے لیکن اس عرصے میں آج پہلی بار ایسا ہو رہا تھا کہ تجوری کا ڈائل ہمیشہ کی طرح حرکت نہیں کر رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ ساکت و جامد تھا۔ کوئی بھی شخص بعد میں آسانی سے تجوری کھول سکتا تھا۔

انھوں نے چابیاں مسٹر شین کے حوالے کر دیں تاکہ حسبِ معمول وہ انھیں اسٹیشن ماسٹر کو دے کر ان کی رسید لے آئے۔ پھر یہ رسید مسٹر ہوگ کے حوالے کر دی جائے گی۔ رات کو ڈیوٹی پر آنے والا عملہ دوسری تجوری استعمال کرتا تھا۔

بیس سال! گزشتہ بیس سال کے دوران میں ہر ہفتے میں پانچ بار...... گویا اب تک پانچ ہزار بار انھوں نے رقم رکھی جانے کے بعد تجوری اسی طرح بند کی تھی اور اسی طرح ڈائل خفیہ نمبروں پر سیٹ کیا تھا، اور ہر بار ان کے ذہن میں یہی خیال آیا تھا کہ یہ کام کتنا آسان ہے۔ بس اپنی انگلیاں اس طرح ڈائل پر پھیرو جیسے ڈائل گھوم رہا ہو لیکن حقیقت اس کے برعکس ہو۔ انھیں اس عمل کی اچھی خاصی مشق ہو چکی تھی۔ آج بھی انھوں نے نہایت انہماک اور توجہ سے ڈائل سیٹ کیا اور پھر اُٹھنے کے بعد وہی ٹھنڈی آہ بھری...... آہ، پورے بیس برس...... اس عرصے میں انھوں نے بمشکل تمام اکیس دنوں کی چھٹی لی تھی۔

مسٹر ہوگ اپنی عمر کے لحاظ سے ابھی پانچ سال اور ملازمت پر برقرار رہ سکتے تھے۔ دوسری صورت میں وہ پانچ سال تک وظیفے کے طور پر نصف تنخواہ کے حق دار تھے۔ مسٹر ہوگ نے دوسری صورت منظور کر لی تھی۔ "میں نے کچھ رقم پس انداز کر رکھی ہے۔ میرا کام چل جائے گا۔"

لوگوں نے انھیں فضول خرچی میں بہت کم ملوّث دیکھا تھا۔ وہ کبھی کبھار شراب کا ایک آدھ جام پی لیتے تھے اور کبھی کوئی سگریٹ۔ وہ بھولے سے بھی سنیما یا تھیٹر کی طرف نہیں پھٹکتے تھے۔ جوئے سے انھیں سخت نفرت تھی۔ انھوں نے اپنی زندگی میں کبھی کار خریدنے کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ حد تو یہ تھی کہ وہ گزشتہ پندرہ برس سے صرف دو سُوٹوں سے کام چلا رہے تھے۔ ان کے ساتھی حیران تھے کہ وہ اپنی تنخواہ کا کیا کرتے ہیں؟ وہ شہر کے ایک غیر معروف علاقے میں بہت معمولی کرائے کے دو کمروں میں رہتے تھے۔ کرایہ اتنا کم تھا کہ مالک مکان بھی اس کی وصول یابی میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لیتا تھا۔

"کیا ان کے کسی عورت سے تعلقات ہیں؟" اس سوال کا جواب دینا تو درکنار، لوگ اس تصور پر ہی ہنس دیتے تھے۔

مسٹر ہوگ نے مسٹر سائمن کے سگار کا ایک آخری اور بھرپور کش لیا...... بیس سال...... انھوں نے سوچا، اب وقت آ گیا ہے۔

"آپ چھٹیاں کہاں گزاریں گے مسٹر ہوگ؟" مسٹر شین جانے کے لیے تقریباً تیار ہو چکے تھے۔

مسٹر ہوگ دراز سے آہستہ آہستہ اپنی ذاتی چیزیں نکال کر سوٹ کیس میں رکھ رہے تھے۔ اس میں کچھ کپڑے بھی رکھے ہوتے تھے۔

"میں لندن جانا چاہتا ہوں، مجھے وہاں کی پارلیمنٹ کا ایوانِ بالا دیکھنے کا بہت شوق ہے۔"

"گیارہ بج کر پینتالیس منٹ، پلیٹ فارم نمبر ۱۲......" کلرک نے فی البدیہہ کہا۔ اس مذاق پر وہ تینوں ہی کھول کر ہنسے۔

"یہ بڑی عجیب بات ہے۔" مسٹر ہوگ نے سگار ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے کہا۔ "ہمیں یورپ کے دُور افتادہ مقامات کے بارے میں ریلوں کے اوقات معلوم ہیں، لیکن کیا یہ ستم ظریفی نہیں ہے کہ ہم لوگ خود کہیں نہیں جا سکتے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" مسٹر شین نے افسردہ لہجے میں کہا۔ "اچھا، میں ذرا چابیاں دے آؤں۔"

"میں تو چلتا ہوں جناب!" ٹام نے مسٹر ہوگ سے گرم جوشی کے ساتھ مصافحہ کیا اور مسکراتے ہوئے کہا۔ "میرے بزرگ دوست! خدا آپ کو اپنے مقاصد میں کامیابی عطا فرمائے لیکن آپ ملاقات کے لیے آتے جاتے رہا کیجیے گا۔"

دونوں کلرک باہر چلے گئے۔ مسٹر ہوگ دفتر میں بالکل تنہا رہ گئے۔ دس منٹ بعد مسٹر شین چابیوں کی رسید مسٹر ہوگ کو دے کر رخصت ہو گئے۔ کچھ دیر بعد مسٹر ہوگ کو یہ رسید رات کی شفٹ والوں کے حوالے کرنی تھی...... تھوڑی دیر کیا؛ صرف بارہ منٹ اور تھے۔

اچانک کسی نے کھڑکی پر زور سے دستک دی۔ مسٹر ہوگ کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

"مجھے ایک ٹکٹ لندن کا......" ایک نوجوان نے عجلت میں کہا۔

"مجھے افسوس ہے جناب۔ آپ کو کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا۔ یہ شفٹ ختم ہو چکی ہے، دوسری شفٹ دس پندرہ منٹ بعد شروع ہوگی۔" یہ کہہ کر انھوں نے کھڑکی بند کر دی۔ جب انھیں یقین ہو گیا کہ وہ مسافر وہاں سے جا چکا ہے تو انھوں نے سوٹ کیس کھول کر اس میں رکھی ہوئی بعض چیزیں کاغذ کے ایک الگ بنڈل میں بند کر دیں۔

مسٹر ہوگ بہت پُرسکون تھے۔ انھیں خود بھی تعجب ہو رہا تھا۔ ان کے دل کی دھڑکنیں معمول کے مطابق تھیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ انھوں نے ایک بار پھر اطراف میں نظریں دوڑائیں۔ کسی کے دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ انھوں نے جلدی سے تجوری کا بھاری بھرکم دروازہ کھولا اور کھلا ہوا سوٹ کیس قریب ہی فرش پر رکھ کر اس
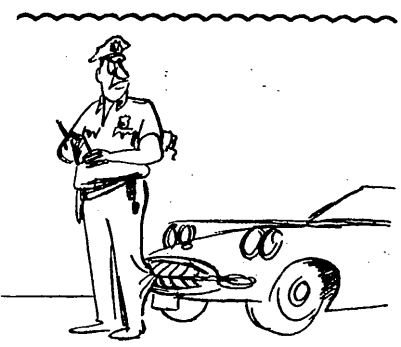
میں رقم کے تھیلے بھرنے لگے۔ تجوری میں دن بھر کی آمدنی کے علاوہ بھی کچھ پیسے پڑے ہوتے تھے۔ سوٹ کیس بند کرنے کے بعد انھوں نے تجوری کا ڈائل خفیہ نمبروں پر فکس کر دیا اور دوبارہ اپنے سامنے کی کھڑکی کھول دی۔ جیسے ہی انھوں نے روانہ ہونے کے لیے اپنا ہیٹ سر پر رکھا، کمرے کے سرے کے دروازے سے رات کی شفٹ والے لوگ اندر داخل ہوتے۔ مسٹر ہوگ نے اپنا اوور کوٹ بھی اوڑھ لیا لیکن نہ جانے کیوں اب ان کے دل کی دھڑکنیں کچھ تیز ہو گئی تھیں۔ "اچھا بھئی ہم تو چلے۔" انھوں نے کہا۔

"تو گویا آپ واقعی جا رہے ہیں؟" نئے آنے والے ایک کلرک نے کہا۔ "لیکن آپ سے ملاقات تو ہوتی رہے گی نا؟"

"کیوں نہیں... ضرور۔" مسٹر ہوگ کو اچانک جیسے کچھ یاد آ گیا۔ "ارے میں نے خود اپنا ٹکٹ تو لیا ہی نہیں۔"

نئے ڈیوٹی کلرک نے انھیں لندن تک کا واپسی کا ایک ٹکٹ پنچ کر کے دے دیا۔ مسٹر ہوگ نے جلدی سے ٹکٹ پرس میں رکھا اور دونوں سے باری باری الوداعی مصافحے کیے۔ نہ جانے ان کی خشک آنکھوں میں کہاں سے چند آنسو آ گئے تھے۔ وہ منہ پھیر کر جلدی سے باہر نکل گئے۔

کوئی اور شخص ان حالات میں یہی محسوس کرتا کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے لیکن حقیقت یہ تھی کہ مسٹر ہوگ نے جو خواب ایک طویل عرصے تک دیکھا تھا، آج وہ اس کی تعبیر دیکھ رہے تھے۔ بظاہر وہ بہت پُرسکون تھے لیکن ابھی انھیں کئی مرحلے سر کرنے تھے۔ عام طور پر صرف چوری کر لینا کوئی مشکل کام نہیں ہوتا۔ اس کے بعد کی منزلیں کٹھن ہوتی ہیں۔ مسٹر ہوگ ہر صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے پوری

طرح تیار تھے۔ انھیں بخوبی اندازہ تھا کہ چوری کا انکشاف ہوتے ہی پولیس چوکنا ہو جائے گی اور کوئی بعید نہیں کہ صرف چوبیس گھنٹے بعد پولیس ان کے تعاقب میں بھی لگ جائے۔ بہرحال مسٹر ہوگ کا اصل منصوبہ بہت مختلف اور پُرپیچ تھا۔

اسٹیشن کی عمارت سے نکل کر وہ مین روڈ سے ہوتے ہوتے تنگ اور نیم تاریک گلیوں میں داخل ہوگئے۔ ان کے قدموں میں بلا کی تیزی آگئی تھی۔ جب وہ ایک ویران سی پلیا سے گزرے تو انھوں نے کاغذ کا بنڈل کھول کر اپنا ذاتی سامان پانی میں پھینک دیا۔ پھر تیز تیز قدم اٹھاتے بندرگاہ کی طرف چل دیے۔ اب انھوں نے اپنے کوٹ کے کالر کان تک کھڑے کر لیے تھے اور اپنی عینک اور ہیٹ سے بھی نجات حاصل کر لی تھی۔ وہ اب ایک سست رفتار اور عمر رسیدہ کلرک کے بجائے کوئی ماہی گیر یا کشتی راں دکھائی دے رہے تھے۔

وہ ایک جگہ پہنچے۔ یہاں بہت سی چھوٹی چھوٹی کشتیاں اور لانچیں لنگر انداز تھیں، وہ ٹھیر گئے۔ ایک ساحلی محافظ ٹہلتا ہوا اُن کے قریب آگیا۔ "سلام مسٹر کوننگ!"

مسٹر ہوگ نے اسے سر کے اشارے سے جواب دیا۔ پھر جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ یہ پیکٹ انھوں نے اسی مقصد سے خریدا تھا۔ مسٹر ہوگ کا اندازِ گفتگو قدرے تبدیل ہو گیا تھا۔

"اور سب خیریت ہے، مسٹر کوننگ؟"

"ان سرکاری محکموں نے تنگ کر کے رکھ دیا ہے۔" مسٹر ہوگ نے کہا۔ "قدم قدم پر نت نئی رُکاوٹیں کھڑی کر دیتے ہیں۔"

"اس بار کہاں کا ارادہ ہے جناب؟"

"پہلے بنجن سے کچھ سامان اٹھانا ہے۔ پھر وہاں سے کولن جانے کا ارادہ ہے۔ اچھا بھئی، فی الحال ایک ماہ کے لیے خدا حافظ۔"

"خدا حافظ، لیکن میرا تحفہ لانا ضرور یاد رکھیے گا جناب!" محافظ کا اشارہ اس کی پسندیدہ شراب کی طرف تھا جو اس سے قبل بھی مسٹر ہوگ نے اسے لاکر دی تھی۔

"مجھے اچھی طرح یاد ہے۔"

مسٹر ہوگ، گولڈن بوٹ نامی ایک درمیانے سائز کی لانچ میں سوار ہو گئے۔ انھوں نے چپکے سے لانچ کا ایک تختہ اٹھا کر سوٹ کیس اس کے نیچے چھپا دیا۔

مسٹر ہوگ نے محافظ سے صحیح کہا تھا کہ انھیں بنجن سے کچھ سامان لے کر کولن جانا ہے۔ پھر ان دونوں مقامات سے کچھ سامان لے کر انھیں فرانس جانا تھا۔ یہ ان کی خفیہ اور جز وقتی کاروباری زندگی کا ایک حصہ تھا۔ مسٹر ہوگ نے گولڈن بوٹ تقریباً پانچ سال قبل خریدی تھی اور گزشتہ تین برس کے دوران میں انھوں نے جب بھی علالت کا بہانا بنا کر دفتر سے چھٹی لی تھی، وہ کوننگ کے نام سے ایک آدھ شہر کا چکر لگا آئے تھے۔ انھوں نے اپنی لانچ کبھی ایک جگہ کھڑی نہیں رکھی تاکہ لوگ چہ میگوئیاں نہ شروع کر دیں۔ انھوں نے مصلحتاً مقامی لوگوں سے اتنے اچھے تعلقات قائم کر لیے تھے کہ وہ انھیں پسند کرنے لگے تھے۔

بہرحال اب مسٹر ہوگ کا کہیں وجود نہ تھا۔ یہ لوگ صرف مسٹر کوننگ سے واقف تھے جو کسی کاروباری ادارے سے منسلک تھے اور نجی کاموں کے سلسلے میں اپنی ذاتی لانچ میں سفر کرتے تھے۔ کمزور، بخیل اور عمر رسیدہ ہوگ سے یہاں کوئی بھی واقف نہیں تھا۔ ہر شخص چست اور تیز طرار کوننگ کو جانتا تھا۔

دوسرے دن دوپہر کو کوننگ نے بنجن کی بندرگاہ سے کچھ سامان اٹھا کے کولن کی بندرگاہ تک پہنچا دیا۔ پھر وہاں سے کچھ ادویات وغیرہ لے کر فرانس پہنچا دیں۔

اس رات انھوں نے ایک اخبار میں پڑھا کہ ہالینڈ کے شہر روٹرڈیم کے ریلوے اسٹیشن پر چوری کے ایک دلیرانہ واقعے کا انکشاف ہوا ہے۔ اس سلسلے میں بین الاقوامی پولیس کو خبردار کر دیا گیا ہے۔ مسٹر ہوگ نے خوشی سے بے قابو ہو کر اخبار ہوا میں اُچھال دیا۔ انھیں یقین تھا کہ پولیس مجھے کبھی تلاش نہیں کر سکے گی۔ "آج میں بہت خوش ہوں۔" مسٹر ہوگ نے زیر لب کہا۔ "مجھے اسی خوشی اور اسی پُرسکون زندگی کی تلاش تھی۔" لیکن ذہن کے کسی گوشے سے ایک پُراسرار آواز سنائی دی۔ "کیا تم واقعی خوش ہو؟ نہیں ابھی کہاں؟"

مسٹر ہوگ نے سوچا کہ ابھی ان کی زندگی میں ایک نہایت اہم چیز کی کمی ہے۔۔۔ ایک عورت کی۔

وہ ایک طویل مدت سے عورت سے دُور تھے، وہ اُن لوگوں کے ہم خیال تھے جو عورت کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے لیکن اب دولت آجانے کے بعد ان کے لاشعور میں دبی ہوئی ایک خواہش اُبھری۔ عورت کی رفاقت کی خواہش ــــ عورت کے بغیر دولت کا کیا لطف؟ مجھے یقیناً کسی عورت سے رابطہ پیدا کرنا چاہیے مگر کون سی عورت؟ کیا شراب خانوں اور قمار خانوں میں ملنے والی عورتیں؟..... نہیں، اس طرح تو میں اپنی تمام دولت کھو بیٹھوں گا ــــ اور مجھے حقیقی مسرت کبھی حاصل نہیں ہوگی۔ تو پھر مجھے شادی کر لینی چاہیے؟ انھوں نے خود کو سمجھایا۔ شادی کے خیال سے انھیں جُھرجُھری آگئی۔ اس عمر میں میرے لیے کس عمر اور کس مزاج کی عورت مناسب رہے گی؟ اور شادی کے بعد میرا راز طشت از بام ہو جانے کا بھی خدشہ ہے۔ کسی نہ کسی دن میری بیوی کو پتہ چل ہی جائے گا کہ میرا ذریعۂ معاش محض لانچ نہیں ہے۔ لانچ کو معاش کا ظاہری ذریعہ بنانے کے لیے مجھے وقتاً فوقتاً دوسری بندرگاہوں پر جانا پڑے گا۔ اس صورت میں نئی نئی عورتوں کی قربت حاصل کرنا زیادہ مشکل نہیں ہوگا لیکن کسی مستقل ساتھی کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔

مسٹر ہوگ کو فوراً مسز کورتھ کا خیال آیا۔ وہی بیوہ جو اپنی جوان بیٹی اُرسلا کے ساتھ رہتی تھی۔ اُن دونوں کی گزربسر کا انحصار ایک پن چکی سے ہونے والی آمدنی پر تھا۔ پچھلے سال بھی جب وہ ان کے گھر گئے تھے تو ماں اور بیٹی دونوں نے ان کی بڑی خاطر تواضع کی تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ مسٹر کوننگ ان کے ساتھ مستقل قیام کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔

سوچتے سوچتے مسٹر ہوگ نے مسز کورتھ کو اپنانے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر دوسرے دن وہ مسز کورتھ کے گھر پہنچے تو مسز کورتھ اور اس کی بیٹی نے اپنے معزز مہمان کی خوب خاطر مدارات کی۔ مسٹر ہوگ جوشِ جذبات میں کافی شراب پی گئے۔ ان کی نظریں مسز کورتھ کے بجائے اس کی نوجوان اور حسین لڑکی اُرسلا کا طواف کر رہی تھیں۔ اُرسلا کے کشش انگیز بدن نے ان کے سرد اعصاب میں ایک ہلچل مچا دی۔ اُرسلا اس وقت کسی برتن پر جُھکی ہوئی آٹا گوندھ رہی تھی، مسٹر ہوگ کی نظریں بار بار اُرسلا کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ وہ اس کے حسین سراپا میں کھو کھو جاتے تھے۔ اُرسلا آٹا گوندھنے میں اپنی پوری قوت صرف کر رہی تھی۔ اس کا چہرہ گُلنار ہو رہا تھا۔ اس کے بدن کی ہر جنبش اور ہر حرکت کے ساتھ مسٹر ہوگ کے دل کی دھڑکنیں بھی تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ ان کے سینے میں ایک نیا طوفان موج زن تھا۔ وہ ایک طویل عرصے تک صنفِ نازک سے تائب رہے تھے۔ اب اپنے سامنے اتنی شاداب لڑکی کو اس حالت میں دیکھ کر ان کی عجیب حالت ہو رہی تھی۔ ان کے عمر رسیدہ جسم میں گرم خون گردش کرنے لگا۔ ــــ "آپ بہت رحم دل انسان ہیں مسٹر کوننگ!" مسز کورتھ نے کہا "یقین کیجیے۔ ہماری مالی حالت ان دنوں بہت خراب ہے۔ آپ نے بروقت ایک ہزار گلڈر عنایت کر کے ہم پر بہت بڑا احسان کیا ہے، ہم آپ کے احسان مند ہیں۔ آپ کو احسان کا صلہ تو نہیں دے سکتے لیکن آپ زندگی بھر یہاں رہ سکتے ہیں۔ ہم آپ سے ایک پھوٹی کوڑی کا تقاضا بھی نہیں کریں گے۔ آپ کا قیام ہی ہماری پیش کش کا بہترین انعام ہوگا۔"

مسٹر ہوگ کی نظریں مسلسل اُرسلا کے نشیب و فراز پر پھسل رہی تھیں۔ اُرسلا غالباً ان کی نظروں کا مطلب سمجھ گئی تھی، اسی لیے اس کی آنکھوں میں بھی ایک عجیب سی چمک پیدا ہو گئی تھی۔ مسٹر ہوگ سمجھ گئے کہ لڑکی رضامند ہے۔ ان کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اتنی

زور سے کہ اگر وہ اس وقت وہاں سے اُٹھ نہ آتے تو نہ جانے ان پر کیا گزر جاتی ؟

مسز کورتھ کے لیے یہ واقعہ ایک زبردست صدمے سے کم نہیں تھا۔ مسٹر کوننگ کو پیش آنے والے حادثے پر وہ بہت بوکھلائی ہوئی تھی۔ "آپ کو تفصیلات میری بیٹی بتا سکتی ہے۔" مسز کورتھ نے باوردی اور سادہ لباس والے سپاہیوں اور پولیس انسپکٹر سے کہا۔ "لیکن آپ خود دیکھ لیں کہ اس وقت وہ بے چاری کس حالت میں ہے، وہ آپ کے سوالات کا جواب کیسے دے گی ؟"

پولیس انسپکٹر نے اُرسلا کی طرف دیکھا اور پھر افسوس سے سر ہلاتے ہوئے دوبارہ مسز کورتھ سے رجوع کیا۔ مسز کورتھ نے بھرائی ہوئی آواز میں بتایا۔ "مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ میں نے اچانک اُرسلا کی چیخ سنی اور جب میں دوڑ کر ان کے کمرے میں داخل ہوئی تو مسٹر کوننگ بے ہوش پڑے تھے۔ میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ میں نے انھیں ایک علیحدہ کمرہ دے رکھا تھا۔ میں صرف یہ جانتی ہوں کہ ان کا نام مسٹر کوننگ ہے اور ان کی لانچ کا نام گولڈن بوٹ ہے۔"

پولیس نے تھوڑی دیر بعد لانچ کی اچھی طرح تلاشی لی۔ تلاشی کے دوران میں وہ تختہ بھی اُدھڑوایا گیا۔ تختے کے نیچے سے مسٹر ہوگ کا سوٹ کیس برآمد ہو گیا۔ سوٹ کیس میں چوری کی رقم موجود تھی۔ بین الاقوامی پولیس موقع پر پہنچ گئی۔ مسٹر ہوگ کی شناخت کوئی مسئلہ نہیں رہی۔

کچھ عرصے بعد مسٹر ہوگ کو دوبارہ ہالینڈ پہنچا دیا گیا۔ یہاں وہ پولیس کی حراست میں تھے اور ایک اسپتال میں پڑے ہوئے تھے۔ ایک ماہر ڈاکٹر نے بتایا کہ وہ مشکل سے تین مہینے اور زندہ رہیں گے کیونکہ ان میں کوئی بھی اہم خبر سُننے یا کوئی صدمہ برداشت کرنے کی تاب نہیں ہے۔ بس ذرا دل کی دھڑکنیں تیز ہوئیں اور ان کا کام تمام ہوا۔

آہ بے چارے مسٹر ہوگ !

مسٹر ہوگ کے کامیاب منصوبے، چوری کے لیے مناسب موقع کے انتظار میں ان کے صبر و تحمل، ان کی گمنام اور گوشہ نشین زندگی کے بارے میں ہر طرف چہ میگوئیاں ہونے لگیں جن سے مسٹر ہوگ بے خبر تھے۔ اور کسی کو معلوم نہیں تھا کہ مسٹر ہوگ پر کیا قیامت گزر گئی جس نے ایک ہوش مند شخص سے اس کا ہوش چھین لیا۔ ایک قابو یافتہ شخص کو بے قابو کر دیا۔

یہ کہانی یہاں ختم ہو جاتی ہے۔ ہالینڈ میں پیش آنے والے اس واقعے کے قارئین نے، ممکن ہے کوئی اندازہ قائم کر لیا ہو، بہرحال ڈاکٹر کا بیان صد فی صد درست قرار دیا گیا۔

"دولت سے زیادہ دل للچانے والی چیزیں بھی دنیا میں موجود ہیں۔ ایک نوجوان اور حسین لڑکی کا شاداب بدن اور اس کی قربت، دولت سے زیادہ دل فریب اور مہلک ثابت ہو سکتی ہے۔ مسٹر ہوگ کی زندگی میں دو ہی چیزوں کی کمی تھی، دولت اور عورت کی ——— جہاں ان کا پیمانہ چھلک پڑا اور جس کی رفاقت ان کے لیے سمِ قاتل ثابت ہوئی، وہ ان کی وہ چھپی ہوئی خواہش تھی جس کا اندازہ خود انھیں نہیں تھا۔"

★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★